سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۳۲)

تذکرۂ شعراے اردو

موسوم بہ

گلِ رعنا

یعنی

اُردو زبان کی ابتدائی تاریخ، اور اُس کی شاعری کا آغاز، اور عہد بعہد کے باکمال اُردو شعراء کے صحیح حالات، اور اُن کے منتخب اشعار، اور اُن کے ہر قسم کے کلام کے نمونے

از

مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

باہتمام: مسعود علی، ندوی

در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع گردید

طبع چہارم ۱۳۷۰ ہجری
۱۹۵۰

فہرست مضامین

گلِ رعنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا محمّد وعترتہ بعدد کل معلوم لک

اگلے زمانہ مین جن لوگون کو کچھ بھی علمی مذاق ہوتا تھا وہ اپنے پاس ایک ایک بیاض رکھا کرتے تھے کبھی اس کی تقطیع کتابی ہوتی جس کا شیرازہ عرض مین کاغذون کو موڑکر باندھا جاتا ہے کبھی طول مین کاغذون کو موڑ کر بہی کی طرح باندھتے وہ ایک سادی کتاب ہوتی جو ہروقت پاس رہتی، چھاپہ خانہ اس زمانہ مین نہین تھا کسی خوش قسمت کو خود لکھکر یا لکھوا کر کتابین مل بھی جاتین تو اس زمانہ مین جب کہ ریل نہین تھی اور اس طرح سفر آسان اور سہل نہین تھا، کتابون کو اپنے ساتھ ساتھ سفر مین رکھنا دشوار تھا، اور رکھتے بھی تو سارا کتبخانہ کہان کہان لئے پھرتے، رہی سادی کتاب ساتھ رہتی، اسی وجہ سے اس بیاض کا ایک نام "زاد السفر" بھی تھا،

مذاقِ علمی بھی ایک طرح کا نہ تھا، جو طبیب ہوتے وہ بیاض پر اپنی مجربات یا کہین سے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ آتا اس کو لکھتے جاتے، کوئی نادر کتاب طب کی کہین مل جاتی تو اس مین سے ان نوادر کو جن کا محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے اسی بیاض پر قلمبند کر لیتے، عربی کی مثل ہے "العلم صید والکتابۃ قید" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بات کتابون مین پڑھ کر یاد ہو جاتی ہے، مگر چند روز مین ایسا ذہول ہو جاتا ہے کہ وہی بات یاد کرنے سے بھی یاد نہین آتی، اس واسطے لکھ لینا آیندہ چل کر کام دیتا ہے"

قاضیون اور مفتیون کے پاس جو بیاضین ہوتین اس مین مفتٰی بہ مسٔلے اور معتبر کتابون کے حوالے لکھ لیتے تاکہ موقع پر جب ضرورت پڑے تو اُن سے کام لے سکین،

شعراء کی بیاضون مین شعر وسخن کے رموز، عروض وقافیہ کی ضروری ضروری یادداشتین، قدما کے قصائد، غزلین، رباعیان، معمے، پہیلیان، تاریخین اور جہان کوئی مزہ دار شعر سنا وہ اور اسی کے تمام متعلقات قلمبند ہوتے تھے،

جو لوگ جو یک فنی نہین ہوتے وہ بھی اپنے اپنے پاس بیاضین رکھتے مگر اُن کی بیاضین معجونِ مرکب ہوتی تھین، ایک حصہ مجرب نسخون کے لئے مخصوص ہے تو دوسرا دعاؤن اور تعویذون کے واسطے، ایک برجستہ اشعار اور دل نشین کلام کے لئے، نظم ہو یا نثر، ایک اپنے بزرگون، دوستون، اور نامورانِ ملک کی تاریخہاے ولادت و وفات کے واسطے، غرض کہ وہ ایسی چیز ہوتی جس سے بیکاری کے وقت ہر مذاق کا آدمی اپنا دل بہلا سکتا، اور ضرورت کے وقت ان یادداشتون سے کام لے سکتا ہے،

مین نے اپنے بچپن مین جن بزرگون اور عزیزون کو دیکھا ان مین کا ہر ایک، ایک ایک بیاض کا مالک تھا اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا، سید عبد الجلیل مرحوم ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے، ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے، وہ بیاض کیا تھی، جام جہان نما تھا، ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ، نامورانِ ملک کی موت وحیات کا بھرا ہوا خاکہ، فقہ و حدیث کے نوادر اور مشکلات کا حل، شعرا کے نتائج فکر کا بہترین نمونہ، غرضکہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگون کے لئے دلچسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھی،

مین نے ان ہی بزرگون کے دامن تربیت مین پرورش پائی تھی، مجھکو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا جب زمانہ نے آنکھین کھولین اور ...کامون

میں لگ گیا پھر خبر نہیں رہی کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔

ندوۃ العلماء کے کاموں سے جب فرصت ملتی تو تصنیف و تالیف میں لگ جاتا، ان کے جالے اور [illegible] توں کی تاریکی میں جو کام بن پڑتا وہ ان ہی دو چیزوں میں محدود تھا، جنۃ المشرق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندوستان کا جغرافیہ ظہور اسلام سے لے کر زمانۂ حال تک کی اسلامی تاریخ مسلمانوں کا طریقۂ حکمرانی اور امور دفعہ کا بہ قدر امکان تلاش و تحقیق سے ذکر کیا ہے۔ دوسری کتاب المعارف کے نام سے لکھی جس میں علوم و فنون کی تاریخ اور ہندوستان میں جس علم کی جو مسلمانوں نے خدمت کی ہے اور جو کتابیں ان علوم میں یہاں تصنیف ہوئی ہیں ان کی تفصیل دی ہے تیسری کتاب نزہۃ الخواطر آٹھ جلدوں میں تصنیف کی جس میں ہندوستان کے علماء اور دوسرے ناموروں کے حالاتِ زندگی جنھوں نے علم کی خدمتیں کی ہیں بڑی کاوشوں اور کاہشوں سے فراہم کئے ہیں، علاوہ ان کے چند کتابیں اور بھی لکھیں جو فقہ و حدیث سے تعلق رکھتی ہیں، [illegible] سے یہ سب کتابیں عربی میں تالیف کیں جن کی اس ملک میں مانگ نہیں، یہ مسودے [illegible] میں موجود تھا کہ سال گذشتہ میں صحت نے بیوفائی کی اور سال کا سال مرض کے ابتلا میں گذر گیا، اس سال کچھ کام کرنے لگا تھا کہ پھر مرض کا اعادہ ہوا، مدتوں کی عادت پڑی ہوئی کتاب بینی اور تصنیف و تالیف طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی، مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابوں کے مطالعہ پر مائل ہونا پڑا جن سے دماغ پر زور نہ پڑے، ان ہی کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانہ میں ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائیں، تذکرے جمع کئے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی، اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام گلِ رعنا میں نے رکھ دیا ہے۔

اُمید ہے کہ بزرگانِ سخن فہم اس کی قدر افزائی فرمائیں گے، اور کیا عجب ہے کہ اس طریقہ سے جس سرزمین کی مختلف حیثیتوں سے ہم نے اب تک خدمتیں کی ہیں اس کی ملکی زبان کی بھی یہ اچھی خدمت سمجھی جائے،

غرض نقشے است کز ما یاد ماند — کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلے روزے ز رحمت — کند بر حالِ این مسکین دعائے

عبد الحئی

۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴ھ، لکھنؤ،

مقدمہ

اُردو زبان اور اُردو شاعری کی تاریخ

انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے یا سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے ذوق و شوق، عشق و محبت، حیرت و استعجاب، طیش و غضب، رنج، غم وغیرہ کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کو اس طرح سے موزون کر کے ادا کرنا کہ جو اثر اس کے دل میں ہے وہی دوسرون پر چھا جائے اسکا نام شاعری ہے،

اگر ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھو اور نثر میں پڑھو پھر اسی مضمون کو فقط لفظون کے ایک خاص پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھو تو کچھ اور ہی عالم ہو جائے گا، اول تو وہ موزون ہو جاتا ہے، پھر کلام کا زور بڑھ جاتا ہے، تیسرے سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب اس کو بار بار پڑھتے اور مزے لیتے ہین،

قدرتی شاعر ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت مین بیٹھتا ہے مگر حقیقت مین اس کا دل اور اس کے خیالات ہر وقت اپنے کام مین لگے رہتے ہین، قدرت کے کارخانہ مین جو چیز اس کے حواس مین محسوس ہوتی ہے اور اس سے جو کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے وہ ہر شخص کو نصیب نہین، خواہ لطف و شگفتگی ہو خواہ آزردگی یا بیزاری،

یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اٹھاتا ہے اس کے لئے ڈھونڈھتا ہے کہ کیسے لفظ ہون اور کس طرح ان کو ترکیب دون تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے وہی کیفیت

سننے والے کے دل پر [illegible]

جس طرح کا لطف مین نے اٹھایا ہے اسی طرح کا لطف اسے بھی حاصل ہو،

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے نہین رہ سکتی، اسی طرح کوئی زبان اپنے اہلِ زبان کی حیثیت کے موافق نظم سے خالی نہین رہ سکتی، یا جس طرح سے روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح زبانون کے سلسلہ مین ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہلِ زبان کی شائستگی اور تہذیبِ علمی کے ساتھ لطافتِ طبع کے درجے دکھاتی ہے،

زبانِ اُردو کے ظہور پر خیال کرو اور اس کی تصنیفات پڑھو تو اس مین نثر سے پہلے نظم آئے گی، جب ملکی زبانون نے اپنی وسعتِ اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانون کو جگہ دی تو طبیعتون مین اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا، لیکن وہ صدہا سال تک دوہرون کے رنگ مین ظہور کرتی رہی یعنی فارسی کی بحرین اور فارسی کے خیالات ایک زمانہ تک اس مین گھسنے نہین پائے[1]،

جہان تک چھان بین کی گئی ہے، سب سے پہلے امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع مین اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی، مالکِ سخن مین برج بھاشا کی ترکیب سے انشا پردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا، مکرنی، انمل، دوسخنی، قسم قسم کے گیت اور پہیلیان، خاص ان کے آئینۂ کمال کا جوہر ہین، خالق باری کو بھی اُن ہی کی طبعِ رسا کا نتیجہ سمجھو تو اس حیثیت سے اس کو اردو نظم کی داغ بیل قرار دینا ایک حد تک ٹھیک ہے، مگر اس کی کیا سند ہے کہ یہ اُن ہی کی تصنیف ہے، ایسی زبانی روایتون سے جو کتبون کے ملّا ایک دوسرے سے لیتے چلے آئے ہین، تاریخ کی بنیاد نہین پڑتی، پہیلیون اور گیتون کی حالت دوسری ہے، ان کی بنیاد مضبوط چٹان پر قائم ہے، ہر زمانہ مین ہزارون مردا ور عورتون نے نقل در نقل ان کو ہم تک پہنچایا ہے، اسی طرح سے امیر خسرو نے جو اختراعین موسیقی کے راگ اور راگنیون مین کی ہین ان کی سند بڑی پکی ہے، بہرحال اس مین کچھ شبہ نہین کہ اس کی داغ بیل امیر خسرو کی ڈالی ہوئی ہے،

---

[1] آبِ حیات ص۲۵ ایضاً

خسرو کے بعد سلطان حسین شرقی نے جو فنِ موسیقی کا بے نظیر ماہر تھا، اس میں برگ و بار پیدا کئے، اس نے دھرپد میں تصرف کیا، اور بجائے چار مصرعوں کے دو مصرعے کر دیئے یا آہنگ میں تصرف کر کے اس کا خیال اور چٹکلہ نام رکھا، یا حقیقت کے منھ سے نقاب ہٹا کر مجاز کو زیادہ کھول دیا، یہ اُس کے تصرفات براہِ راست موسیقی کے راگ اور رگنیوں میں تھے، مگر ان کا اثر شاعری پر بھی پڑتا ہے، جو مصرعی ترکیب بھاشا کی خصوصیات میں سے ہے اس کو دور کر کے اس نے گیتوں کو غزل کے قریب کر دیا،

علاوہ اس کے امیر خسرو کے زمانہ میں جو زبان گیتوں کی تھی وہ شرقی کے زمانہ میں زیادہ منجھ گئی تھی اور عربی فارسی کی آمیزش اس میں زیادہ ہو گئی تھی، امیر خسرو ترک تھے، اس وقت ترکوں کی بادشاہت تھی، فتوحات کا سیلاب ہندوستان میں بہہ رہا تھا، اور یہاں کے قدیم باشندوں سے سخت کشمکش ہو رہی تھی، اپنی ملکی زبان، ملکی رواج، اور مذہب کو ہر ایک جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا بادشاہ سے لے کر ایک سپاہی تک ترکی یا فارسی زبان بولتا تھا اپنی زبان کو عزیز رکھتا تھا، پھر اس کو بھی دیکھو کہ ان میں اکثر تازہ وارد ہوتے تھے، بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جن کی دو پشتیں بھی یہاں گذری ہوں، اس لئے ہندی کے بعض حروف کا تلفظ بھی وہ اچھی طرح سے ادا نہ کر سکتے ہوں گے، شرقی کی اصل و نسل ہندوستان کی سرزمین سے تھی، وہ بھی فی الجملہ اطمینان و فراغت کا تھا، اس کا لب و لہجہ اور زبان کی لوچ قدرتی طور پر ہندوستانی تھی، اور اس کے ملازمین و رعایا بھی سب ہندوستانی تھے اس لئے اپنی ملکی زبان سے ایک طرح کا انس ہونا اُن کے واسطے قدرتی امر تھا،

تھوڑے دنوں کے بعد سکندر لودی نے ملکی مصالح کے لحاظ سے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی رغبت دلائی، تاکہ وہ دفتری زبان سیکھ کر ملکی کاروبار میں حصہ لے سکیں، برہمن اور راجپوت جیسی دھرماتما قوموں نے انکار کیا، صرف اسقدر کامیابی ہوئی کہ کایستھوں نے فارسی پڑھنے کی ٹھان لی، اور وہی ایک مدت تک سرکاری عہدوں کے ٹھیکہ دار بنے رہے، جیسا کہ انگریزی سلطنت قائم ہوتے ہی

مسلمانون نے انگریزی زبان سیکھنے کی پرواہ نہین کی، اور ہندوون کی سب قومون نے اس مرتبہ اپنے پرانے تجربہ کی بنا پر فائدہ اٹھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کمپنی کی حکومت اٹھنے اور قاضی، مفتی، صدر امین، صدر الصدور کے عہدون کے ٹوٹنے یا نام اور کام بدل جانے کے بعد ہندؤن سے سرکاری خدمتین بھر گئین اور مسلمان منہ دیکھتے رہ گئے، بہرحال سکندر لودی کا یہ حکم بھی اس بات کا ایک ذریعہ ہوگیا کہ خود ہندؤن کی زبان پر عربی اور فارسی کے الفاظ چڑھ گئے، اسی طرح مسلمانون کی زبانون پر ملکی زبانون نے قابو پایا، اور باہمی میل جول کی وجہ سے ان مین روانی پیدا ہوگئی،

بابر شاہ ہندوستان آتا ہے تو باوجودیکہ وہ ایک ٹھیٹ مغل ہے، ڈال کا ٹوٹا ہوا، وہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رام پور کے کتبخانہ مین ہے وہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اس مین ایک شعر ہے جس کا ایک پورا مصرع اور دوسرے مصرع کا ایک ٹکڑا اردو مین ہے، کتاب خط نسخ مین لکھی ہوئی ہے، اس کے رسم الخط کے موافق مین اس شعر کو نقل کرتا ہون،

مجکانہ ہوا کیچ ہوس مانک وموتی ۔۔۔ فقرا ھلیغہ بس بولغوسیدور پانی ورتی[1]

مجھے کچھ

بابر کے پوتے اکبر شاہ کے زمانہ مین یہ میل جول اور بھی بڑھ گیا، بادشاہ کی زمانہ سازی سے ہندو رانیاں گھر کی مالک بن بیٹھین، ہندؤن کے سارے رسم و رواج بادشاہ نے اختیار کرلئے، پیشانی پر قشقہ لگایا، ہاتھون مین راکھی باندھی، راکھی بندھن کی رسم سال بسال دھوم دھام سے ہونے لگی، راجہ ٹوڈرمل دیوان اور بیربر مصاحب ہوئے، راجپوتانہ مین کسی جگہ سسرال بنائی گئی، کہین سمدھیانہ قائم ہوا، فارسی شعرا کے دوش بدوش کبیشرون اور گویّون نے بھی جگہ پائی، ان کو اگر ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا،

---

[1] جب مین رامپور گیا تھا، میرے معزز دوست حافظ احمد علی خان شوق سپرنٹنڈنٹ کارخانجات سرکار رامپور نے مہربانی سے سرکاری کتبخانہ کی سیر کرائی اور اس کتاب کو خصوصیت سے دکھایا، مین ترکی زبان نہین جانتا، انھون نے جو مطلب دوسرے مصرع کا بتایا وہ یہ تھا کہ "فقرا کو پانی اور روٹی کافی ہے"۔

تو اُن کو کب راج اور کب راے بنا یا گیا، گھوڑون، ہاتھیون اور ہتھیارون کے نام ہندی رکھے گئے جو چیزین ہندوستان کی پیداوار تھین اُن کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے وہ سب زبانون پر چڑھ گئے اور فارسی عبارتون مین بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کئے جانے لگے مثلاً چھڑکہ، درشن، پھول کٹار، کھپوہ مرصع، جم دھر، کٹار، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، ڈاکی، جھالر کنار، ڈاک چوکی، سرچوکی، ڈیسکہ، دیس، پانڈیہ، ہتیل، پٹواری، راتے، راو، راجہ، مہاراجہ، چودھری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیاں، ڈاڑی، گھاٹ، گھرواڑہ، بیوپاری، اور اسی طرح کے صدہا الفاظ سلاطین مغلیہ کی شاہی زبان مین ملے جلے نظر آتے ہین،

اکبر شاہ جہانگیر کو پیار سے شیخو جیو، مراد کو پہاڑی راجہ اور فیضی کو شیخ جیو کہتا تھا، ایک دن فیضی حسب الحکم حضور مین کچھ لکھ رہا تھا، بیربر بات کرنے لگا، اکبر شاہ نے آہستہ سے کہا حرف نزنید شیخ جیو می نویسد" آرام بانو اس کی چہیتی بیٹی تھی، مرتے وقت جہانگیر سے وصیت کرتا ہے،

"بہ این خواہر خود کہ لاڈلہ من است بعد از من باید بردشے سلوک کنی کہ من با وی کنم"

جہانگیر بادشاہ کی رنگیلی طبیعت سے تم واقف ہو، اُس نے شراب کا نام "رام رنگی" رکھا تھا، شاہجہان بچپن مین باپ کو "شاہ بھائی" اور دادا کو "شاہ بابا" کہتا تھا، مراد بخش شاہ شجاع کو "بھائی جیو" کہتا تھا، ایک خط مین عالمگیر کو لکھتا ہے،

"اگر این طرز پسند خاطر انند صاحب و قبلہ بھائی جیو را در ہم درین باب متفق ساختہ در یک ساعت و یک وقت از جا ہاے خود روانہ مطلب می باید شد"

عالمگیر نے کلماتِ طیبات مین کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کئے ہین جستہ جستہ فقرے اس کے بھی ملاحظہ ہون، فرزند عالیجاہ (محمد اعظم) کو لکھتے ہین،

مزہ کھچڑی بریانی شما در زمستان یاد می آید... ڈالی انبہ رسلہ آن فرزند بہ ذائقہ بدر بسیر خوشگوار

آمدہ برائے نام انبہ گمنام استدعا نمودہ اند چون آن فرزند جودت طبع دارند، روادار تکلیف پدر پیر چرا می شوند بہر حال سند بارس درستایلاس نامیدہ شد..... خود بدولت بنفس نفیس چہار گھڑی آخر شب از خواب گاہ برآمدہ..... نماز صبح ادا کردہ بجھروکہ درشن تشریف می آورند و درشنیان را بسعادت دید از فیض آثار نواختہ بعد برآمدن چہار گھڑی روز دیوان عام می فرمودند.. . تا ترتیب دو پہر این معاملات در پیش می بود..... درین ضمن کرسی بچکڑہ نیز بہ نظر گذشت ..... بر اسپ نیلو فر و چوا چندن کہ بتواتر سوار می شوند ظاہر از سواری آنہا بہ محظوظ اند..... شادیانہ فتح بہ نوازند، و حرف ایام طفولیت یاد دارند کہ باباجی دھون دھون.... قلعہ پرانا بہ اسم نو تازہ موسوم شد.... از توپ و رہکلہ و بان و دام جنگی و [illegible] گھڑیال و شتر نال گجنال و سواران بایراق و اسپان و فیلان با برگستوانہائے براق و دیگر و ازمنہ طمطراق آن قدر کہ باید مگر نباید ملاحظہ شد..... حدود فوجداری نو دخیل از قطاع الطریق خالی وا زدیدن بہ سامان [illegible] مسافرین و متر ددین و تاجر و بیوپاری بلاد سواس آمد و رفت کنند"

اس مشتے نمونہ از خروارے سے تم سمجھ سکتے ہو کہ ہندی کے کتنے الفاظ ان کی زبان پر چڑھ گئے تھے اور پیار و محبت کے موقعوں پر وہ کس بے تکلفی سے اُن کو کام مین لاتے تھے۔

جہانگیر بادشاہ کے زمانہ مین غواصی ایک شاعر تھا، اس نے مولانا نخشبی کے طوطی نامہ کو کبت کہانی کے طور پر نظم کیا تھا، اس زمانہ کے دستور کے موافق کچھ ہندی، کچھ فارسی ملی جلی نظم تھی، میر حسن شعرائے ریختہ کے تذکرے مین غواصی کا ذکر کرتے ہین اور کہتے ہین کہ مین نے اس کتاب کو دیکھا تھا۔ مگر کوئی شعر اس وقت یاد نہین، اگر اس کے دو چار شعر بھی مل جاتے تو پتہ چل جاتا کہ اس زمانہ مین زبان کی کیا حالت تھی۔

میر حسن نے تذکرہ مین اسی عہد کے ایک اور شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص تمکی تھا، وہ کہتے

ہیں کہ یہ دکن میں درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس سے زیادہ اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ مگر اس کا ایک شعر کسی پیر مرد سے سنا ہوا اب تک یاد ہے،

خانی ہے اپنے من میں اتو یہی سرکھن تجھ پیم کی گلی میں خاکی و خاک ہونا

اگر درحقیقت یہ اسی زمانہ کا شاعر تھا، اور یہ شعر اسی کا ہے جس کی شہادت کا تو ایک مجہول الحال پیر مرد ہوتا ہے تو خانی کو دکن کا باشندہ ماننا پڑے گا، جو غالباً چھپا نہ ہو دکن پہنچ گیا ہوگا۔

جہانگیر ابراہیم عادل شاہ کا ہمعصر ہے۔ اس وقت دکن میں اردو شاعری کا سرمایہ نہیں ملتا دکن میں اس کی بنیادیں قائم ہو چکی تھیں مگر اس وقت زبان جس عالم طفولیت میں تھی اس کا نمونہ محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور ملا نصرتی کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

خانی کا جو شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے اس کی زبان شمس ولی اللہ اور ان کے ہمعصروں کی زبان ہے، اس وجہ سے میری ناقص رائے یہ ہے کہ میر حسن کو دھوکا ہوا ہے یا کاتب کا سہو قلم ہے، بجائے جہانگیر کے عالمگیر ہونا چاہیئے تھا۔

لہ سید محمد بن جمال ... ... بزرگ شمس ولی اللہ کے ہمعصر تھے ... ان کا ... دیوان ... مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ میں موجود ہے یہ دیوان ردیف وار ہے۔ علاوہ غزلیات کے مثنوی ... ہے ... اور ریختیاں بھی ہیں جو ... شاعری کا نمونہ ہیں۔ مناجات بھی ہے، نعت بھی ... سے آخر تک ... [illegible] میں ڈوبا ہوا ہے، مقطعوں میں کثرت سے اپنے پیر کا نام لیتے ہیں، زبان وہی ہے جو ولی کے ہمعصروں کی ہے، اس دیوان کے علاوہ ایک مثنوی ان کی فیض عام ہے، جو سنہ ١١ھ میں لکھی ہے، جس سال ولی نے وہ مجلس لکھی تھی، یہ ساڑھے ... جز کی کتاب ہے، اور سید عبدالرزاق چیف ٹرانسلیٹر ناگپور کے کتب خانہ میں موجود ہے، میرا گمان غالب یہ ہے کہ میر حسن نے ذکی کا جو شعر نقل کیا ہے وہ انہی کا ہے۔ علامہ شروانی نے مہربانی کرکے ان کے دیوان سے کچھ اشعار منتخب کرکے بھیجے ہیں جو ملاحظہ طلب ہیں۔

جائز نہیں ہمی تیرے ... کی ... مجکوں ... آج تو ... ما
اپنے معشوق سنگ ہو رہنا ایک دن ایک رنگ ہو رہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا نفس و دل سیتی جنگ ہو رہنا
جن نے ... کو پیا کے نوش کیا اس ... میں ... ہے شربت ...

تاہم اس مین کچھ شبہہ نہین کہ اکبر و جہانگیر کے طرز حکومت سے کائستھون کے سوا ہندوستان کی اور قومون کی بھڑک بھی جاتی رہی تھی، وہ بھی فارسی پڑھنے لگے تھے، ان کا میل جول مسلمانون سے بہت بڑھ گیا تھا، اسی میل جول کا نتیجہ ہے کہ مخلوط زبان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، پھر بھی وہ بازارون اور بے لطف صحبتون یا گیتون تک محدود رہی،

اُس زمانہ مین شاہی زبان فارسی تھی، بادشاہی فرمانون سے لیکر دفترون کے احکام تک اُسی زبان مین جاری ہوتے تھے، اسی مین عرائض اور مقدمے کے کل فرائض طے ہوتے تھے، اسی مین عام طور پر خط و کتابت ہوتی تھی، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے دلون پر اس کا رعب و اقتدار اسقدر چھایا ہوا تھا کہ ملکی زبان کو بے علمی کی علامت جانتے تھے،

اس وجہ سے اردو زبان کو علمی زبان تک رسائی نہین ہوئی، اور مدت دراز تک دار الملک اور اس کے گرد و پیش کے شہرون اور قصبون مین فارسی کا سکہ روان رہا، لیکن اطراف ملک کی یہ حالت نہین تھی، وہان کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ مخلوط زبان (اردو) کی جڑ مضبوط ہوتی گئی،

دکن مین محمد شاہ تغلق کی بے عنوانیون سے بہمنیون کی جو عظیم الشان سلطنت قائم ہوگئی اور علاء الدین حسن[1] گانگو کے نام قرعۂ سلطنت پڑا، اس نے شروع سے برہمنون کو مالی و ملکی عہدے دیکر حکومت مین دخیل کر لیا، مال کا دفتر ملکی زبان مین ہونے سے بہت سرعت کے ساتھ ملکی اور فارسی زبانین مخلوط ہوگئین،

---

[1] حسن گانگو ایک مفلوک الحال میرزا تھا، اپنے خاندان کی تباہی کے بعد ملتان سے دلی آیا، یہان اس کا کوئی شناسا نہ تھا، اتفاق سے جمنا کے کنارے گانگو پنڈت جو بادشاہی کا منجم تھا اس کو مل گیا اور اس نے حسن کو پریشان اور خستہ پا کر اس کی سرپرستی کی، اور چند روز اپنے گھر مین مہمان رکھ کر محمد شاہ تغلق کے دربار مین اس کو باریاب کر دیا، حسن مین وہ تمام صفتین موجود تھین جو اقبال مندون مین ہوا کرتی ہین، دربار شاہی امیران صدہ مین اس کو جگہ مل گئی،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳)

چندروز کے بعد بکری، رے باغ وغیرہ مقامات اس کو جاگیر میں ملے اور دکن کی تعیناتی ہوگئی، محمد شاہ تغلق کی سخت مزاجی سے امرے شاہی سب پریشان رہتے تھے، ایک بار کسی بات پر ناراض ہوکر دکن کے امرو نے بغاوت کردی، بادشاہ نے بہت کوشش کی مگر وہ بغاوت کا استیصال نہ کرسکا، بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ علاء الدین حسن کو لوگوں نے اپنا بادشاہ بنا کر گلبرگہ میں ایک جداگانہ سلطنت قائم کرلی، حسن گانگو پنڈت کو بلا کر صدر ریاست (گورنمنٹ جنرل) کا عہدہ دیا، اور اس خوبی سے ملک کا انتظام کیا کہ جو حصے اب تک اسلامی اقتدار سے باہر تھے وہ سب اس کے قلمرو میں داخل ہوگئے، اسی طرح گانگو پنڈت نے زراعت و محاصل ملک کی افزائش میں پوری تندہی اور محنت سے خدمتیں انجام دیں، جس کی وجہ سے اہل ملک مرفہ الحال، اور خزانہ شاہی مالامال ہوگیا، حسن پہلا بادشاہ ہے جس نے برہمنوں کو مانی حیثیت دے کر شریک دولت بنایا، جب تک سلطنت بہمنیہ قائم رہی اور اس کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ میں بھی برہمنوں کے متعلق یہ عہدے ہمیشہ رہتے رہے، اسی وجہ سے اس ملک میں برہمنوں کا رعب و اقتدار بہ نسبت دوسرے ملکوں کے زیادہ قائم ہوگیا ہے، اور اب بھی صوبہ مدراس میں یہ اثر نمایا ہے۔ سلہ ظفرخان کے باپ کا نام سارن تھا، نانک ان کی قومیت تھی جس کو کہا جاتا ہے کہ کھتریوں کی ایک شاخ ہے، سہارن فیروز شاہ تغلق کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے، اور اپنی کارگذاری اور خوش قسمتی سے امارت کے درجہ تک پہنچے، وجیہ الملک ان کو خطاب ملا، ان کے بیٹے ظفرخان نے ان سے زیادہ ترقی کی، وہ ۷۹۳ھ میں گجرات کی حکومت پر سرفراز ہوئے، دلّی کی سلطنت فیروز شاہ کے بیٹوں اور پوتوں کی نااہلیت سے روز بروز برباد ہوتی گئی، اور گجرات میں ان کی حسن کارگذاری سے ان کی طاقت بڑھتی گئی، چند روز میں فیروز شاہ کی اولاد برباد ہو گئی، اور ظفرخان کی اولاد نے تقریباً دو سو برس تک نہایت کروفر سے سلطنت کی۔

لاش کی حیثیت رکھتی تھی، انھون نے گجرات کو تسخیر کر کے ایک پائدار حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً دوسو برس تک اُن کے خاندان مین رہی، بانیِ خاندان کی اصل و نسل ہندوستان کی سرزمین سے تھی اور ملکی زبان اُن کی مادری زبان تھی، مگر شاہی دفتر فارسی مین تھا اور کاروبار بھی سب فارسی زبان مین ہوتے تھے،

تاہم اس مین کچھ شبہہ نہین کہ ملکیون سے وہ ملکی زبان مین بات چیت کرتے اور بے تکلف صحبتون مین وہ اسی کو کام مین لاتے تھے، مگر جس زبان مین وہ گفتگو کرتے تھے وہ خالص گجراتی زبان نہین ہوتی تھی،

زیادہ چھان بین کرنے سے مشائخ کے ملفوظات اور بادشاہون کے سوانح مین جستہ جستہ ایسے فقرے ملتے ہین جو کسی موقع پر ان کی زبان سے نکل گئے ہین، ان کو تبرک سمجھ کر یا موقع کی اہمیت کے لحاظ سے ان ہی کے الفاظ مین نقل بہ نقل تاریخ نے ہم تک پہنچا دیا ہے، اگر ان سب کو تلاش کر کے یکجا کیا جائے تو زبان کی درجہ بدرجہ تبدیلی کا حال خوب معلوم ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر چند نمونے مین پیش کرتا ہون جو اس وقت پیشِ نظر ہین،

۱- سید جلال الدین حسین بخاری (مخدوم جہانیان جہانگشت) کے پوتے بارہ برس کے سن مین گجرات چلے آئے تھے اور یہین بود و باش اختیار کر لی تھی، نام و لقب ان کا برہان الدین عبد اللہ ابن محمود تھا، مگر گجرات والے ان کو "قطب عالم" کہتے ہین، ان کے بڑے بیٹے کا نام و لقب سراج الدین محمد بن عبد اللہ تھا، ان کو "شاہ عالم" کہتے ہین، یہ دونون باپ بیٹے اپنی خاندانی وجاہت کے ساتھ بڑے پایہ کے بزرگ بھی تھے، اسی وجہ سے شاہانِ گجرات ہمیشہ ان کے سامنے سرِ نیاز خم رکھتے تھے، جام جانو حاکم سندھ نے اپنی دو لڑکیون مین سے ایک کی نسبت شاہ عالم سے کر دی تھی اور دوسری کی محمد شاہ بادشاہِ گجرات سے،

جس کی نسبت شاہ عالم سے ہوئی تھی وہ حسن و جمال میں اپنی بہن سے اچھی تھی محمد شاہ کو اس کی تبدیلی ... کر دی، شاہ عالم کو سن کر اس کا ملال ہوا، انھوں نے باپ سے جا کر شکایت کی. اس وقت قطب عالم ایک حالت میں تھے سن کر ان کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا جو ان ہی کے الفاظ میں ہم تک پہنچا ہے،

بیٹے تیا نصیب دونوں بچہ

... قطب عالم ایک بار صبح کی نماز کو ... بعد کلوخ لیکر ... رہے تھے کہ راستے اندھیرے میں ایک لکڑی یا پتھر سے پاؤں ٹکرایا اور چوٹ لگی اس وقت آپ کی زبان سے بیساختہ نکل پڑا،

لوہے یا لکڑی یا پتھر یا کیا ہے

سے خدا کی قدرت دیکھو محمد شاہ ... بیٹا احمد شاہ تخت نشین ... محمد شاہ کا ... بیٹا سندھ کی بیگم سے فتح خان تھا جو آگے چل کر محمود شاہ اوّل اور محمود شاہ بیگرہ کے نام سے مشہور ہوا ... اس وقت دس برس سے کم تھا لیکن ان کو احمد شاہ کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا، اس خیال سے کہ فتح خان ... بھائی سے گزند پہنچے اس کو لیکر اپنی بہن کے پاس شاہ عالم کی خانقاہ میں چلی آئی جب ... بعد بہن کا انتقال ہو گیا شاہ عالم نے اسکو پیغام بھیجا کہ ... تمہاری بہن زندہ تھی تم محرم تھیں اور ہمارے گھر میں رہ سکتی تھیں ... اپنے بھائی ... کے بعد کہا بھیجا کہ میری نسبت آپ ہی سے ہوئی تھی مگر بادشاہ نے ... یہ سنکر شاہ عالم نے اس سے نکاح کر لیا، اور قطب عالم ... شاہ عالم نے ... میں وفات پائی،

... جو ... ان کی خاصیتیں اس میں پائی جاتی تھیں، اس کو لوگوں نے ... قطب کی کرامت سمجھا ... کہ محمود شاہ نے جب گجرات فتح کیا تب تو وہ بھی اس کے ... دیکھنے کو گیا ... اس قصہ کو ... نقل کیا ہے،

۳۔ محمود شاہ اوّل کا سن دس برس کا تھا، اور وہ شاہ عالم کے گھر مین اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا، اس کا بھائی احمد شاہ دوم برسر حکومت تھا، وہ چاہتا تھا کہ محمود شاہ کو اپنے قابو مین کر لے، اگر شاہ عالم کی وجاہت سے محلسرا مین داخل ہو کر اس کو نکال نہ سکتا تھا،

ایک دن معلوم ہوا کہ محمود فلان جگہ شاہ عالم کے پاس بیٹھا پڑھ رہا ہے، بادشاہ بنفس نفیس سوار ہو کر اُس جگہ دفعۃً پہنچ گیا. خادمون نے بغیر اجازت اندر داخل ہونے سے روکنا چاہا، مگر شاہ عالم نے آواز پہچان کر کہا آنے دو اور محمود کی طرف دیکھ کر فرمایا،

بڈھہ ڈوکرے

بادشاہ آکر دیکھتا ہے کہ ایک پیر مرد حضرت کے سامنے بیٹھا پڑھ رہا ہے، آکر مسند پر بیٹھ گیا اور اثنائے گفتگو مین ادھر اُدھر دیکھتا بھی رہا، جب محمود کو نہ پایا تو اٹھ گیا، اور جاکر جاسوسون کو سرزنش کی،

محمود شاہ اوّل[1] کے عہد مین قاضی نجم الدین احمد آباد کے قاضی تھے، ایک دن اثنائے راہ مین

[1] محمود شاہ اوّل گجرات کا سب سے اچھا بادشاہ گذرا ہے، ۸۶۳ھ مین تخت نشین ہوا، اور ۹۱۷ھ مین وفات پائی، اور کچھ اوپر ۵۴ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی، یہ بادشاہ علوم وفنون کی سرپرستی مین اپنا آپ ہی نظیر تھا، شیراز وغیرہ سے علما و محدثین کثرت سے اس کے زمانہ مین آئے اور اس نے ہر ایک کے مرتبہ کے موافق وظائف مقرر کئے اور عہدے دیئے، علاوہ اس کے دور دور سے صناع اور ہنرور لوگون کو بلا کر کام پر لگایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی، زراعت کو اتنی ترقی دی کہ گجرات کے سارے جنگل اور بہترجت کر زمینین آباد ہوگئین، باغات خود بھی کثرت سے لگائے اور رعایا کو انعام دے کر حوصلہ دلایا کہ جس سے ہر طرف باغ ہی باغ نظر آنے لگے، محمد آباد، محمود آباد اور مصطفےٰ آباد کے نام سے کئی شہر آباد کئے، انصاف اور معدلت کے قوانین بنائے، ان تمام باتون سے بالاتر یہ بات ہے جو میرے نزدیک اس کی زندگی کا پرفخر کارنامہ ہے کہ اس نے توسیع سلطنت کے خیال سے اپنے ہمسایہ بادشاہ پر کبھی قوت آزمائی نہین کی، جو آسودہ حالی اس کے زمانہ مین اور اس کے لائق جانشین مظفر شاہ حلیم کے عہد مین رعایا کو تھی وہ کبھی گجرات والون کو نصیب نہین ہوئی،

ستار کے ہاتھ میں ایک نہایت خوبصورت رباب دیکھا جو مرصع بجواہر تھا، پوچھا کس کا ہے؟ اس نے کہا بادشاہ کا
یہ سنکر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زمین پر پٹک کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، بادشاہ کو خبر ہوئی تو ہنس کر فرمایا،

نچی ہرسی ہر کوئی جھومے

مقصد یہ تھا کہ احتساب کا سارا زور ہم پر صرف کیا جاتا ہے، شاہ عالم کے یہاں جا کر امر بالمعروف اور
نہی عن المنکر نہیں کرتے جو دھڑلے سے سماع سنتے ہیں۔

وہ بہادر شاہ شاہزادگی میں شیخ جیو کا مرید ہو گیا تھا، اور انھوں نے اس کو سلطنت کی
بشارت دی تھی، سکندر خان کو جو ولیعہد تھا حسب اقتدار تھا یہ تن ترملال ہوا، اس وقت بہادر شاہ
کی جاگیر میں صرف دو گاؤں تھے جن سے اس کا خرچ چلتا نہ تھا، اپنے والد مظفر شاہ حلیم کی خدمت میں
کئی بار عرضداشت کی مگر جب ان کو متوجہ نہ پایا تو بغیر اجازت و اطلاع کے قسمت آزمائی کے لئے نکل
کھڑا ہوا، اس وقت دہلی کی سلطنت کا ڈھیر ڈھیلا ہو رہا تھا، امرا میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی وہ اس کے
خواہشمند تھے کہ مضبوط ہاتھوں میں عنان سلطنت ہو،

پنجاب کے بعض امرا بادشاہ مغل سے سازباز کر رہے تھے جون پور کے لوگوں نے بہادر شاہ کو دعوت
دی، یہ پہلا تو تھا ہی اسی امید پر جون پور کا قصد کر کے روانہ ہو گیا،

ادھر بہادر شاہ نے وطن چھوڑ کر غربت اختیار کی، ادھر اس کے پیر و مرشد شیخ جیو کا انتقال ہو گیا
ان کے انتقال کی خبر سکندر لودی کو پہنچی تو خوش ہو کر طنزاً یہ بیت کہی،

پیر موا مرید جوگی ہوا [1]

[1] مطلب یہ ہے کہ اب میدان صاف ہے، مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مظفر شاہ حلیم کا انتقال
ہو گیا، ادھر سکندر خان تخت نشین ہوا، ادھر امرا نے بہادر شاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی، یہ وہ زمانہ ہے کہ بابر شاہ
ہندوستان کی تسخیر کو آچکا تھا اور ابراہیم لودی سے برسر پیکار تھا، بہادر شاہ اس تماشے کو دیکھتا ہوا لوٹ پڑا، ہنوز گجرات

۶- بہادر شاہ کے پاس ایک طوطا تھا جس کی میٹھی میٹھی باتین بادشاہ کو بہت پسند تھین اور اُس کو وہ اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) نہین پہنچا تھا کہ بعض نمک حرامون نے سکندر شاہ کو صرف دو مہینہ سولہ دن بادشاہی کرنے کے بعد تخت سے کھینچ کر تختہ پر سُلا دیا، اور ایک کمسن بچہ کو تخت نشین کر دیا، بہادر شاہ کو اس واقعہ کی بھی اثنائے راہ مین اطلاع ہوئی، وہ کوچ در کوچ کرتا ہوا گجرات پہنچا اور ۹۳۲ھ مین عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ مین لے لی اور جس نمک حرام نے اس کے بھائی کو قتل کیا تھا اس کو بری طرح سے سزا دی،

بہادر شاہ گجرات کے بادشاہون مین سب سے زیادہ حوصلہ مند بادشاہ گذرا ہے، شجاعت اور بہادری کے لحاظ سے اسم با مسمّی تھا، مالوہ کا پورا ملک اس کے توابع اور ملحقات کے اس کے عہدِ دولت مین ممالکِ محروسہ گجرات مین داخل ہو گیا تھا، اور دکن کی چار اسلامی سلطنتون نے اس کے نام کا خطبہ اپنے اپنے ملکون مین جاری کر دیا تھا،

چتوڑ اور رنتھنبور جیسے فلک فرسا قلعے اس نے بڑی آسانی سے فتح کر لئے تھے، راجپوتانہ مین کوہ آبو تک جو آجکل ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے رہنے کا مقام ہے، اس نے اپنی عملداری کو بڑھا لیا تھا، اور کوشش یہ تھی کہ دلی کی شہنشاہی پر ہاتھ مارے، مگر افسوس ہے کہ رومی خان نے اس سے دغابازی کی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا،

رومی خان اصل مین قسطنطنیہ کا باشندہ تھا، سواحل یمن مین اس نے اپنی قوت بازو سے بہت سے مقامات پر قبضہ کر لیا تھا، جب اس کو محسوس ہوا کہ سلطنتِ عثمانیہ کی جانب سے اس کی گیرو دار ہونیوالی ہے تو بھاگ کر بہادر شاہ کے دامن مین پناہ لی، بہادر شاہ کو پرتگیزون سے ہمیشہ مقابلہ کرنا پڑتا تھا، اس نے اس کو کام کا آدمی سمجھ کر دیو، دمن، تھانہ، ماہم، راندیر، سورت وغیرہ مقامات جو سواحل پر واقع ہین اس کی جاگیر مین دیئے، اور اپنے یہان توپخانہ قائم کر کے اس کو نواب ناظر بنایا، اصلی نام مصطفے بن بہرام تھا، بہادر شاہ نے رومی خان خطاب دیا تھا،

رومی خان کے خمیر مین بغاوت و سرکشی کا مادہ تھا، کسی بات پر ناخوش ہو کر اس نے دغابازی کی ٹھان لی، جب مالوہ مین ہمایون بادشاہ سے جنگ کی ٹھہری تو اس نے بہادر شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ تمام لشکر کو یکجا کر کے توپخانہ کا قلعہ گھیر کر محصور ہو جائے، ہمایون اس ملک مین اجنبی ہے، رسد نہ ملنے سے چند روز مین بھاگ کھڑا ہو گا، امرا و وزرا نے کوشش کی کہ اس واہی مشورہ کو نہ مانا جائے مگر بہادر شاہ کے دل مین اس نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ اور کسی کی اس کے سامنے کچھ نہ چلی، اور اس کے مشورہ پر عمل کیا گیا، اس نے جب دیکھا کہ یہ محصور ہو گئے تو ہمایون سے نامہ و پیام شروع کر دیئے، جو رسد بہادر شاہ کے واسطے آتی وہ دشمن لوٹ لیتا، آخرکار ایک شب اس نے میگزین مین آگ لگوا دی، ہمایون کو پہلے سے معلوم تھا، وہ اپنا لشکر لیکر ٹوٹ پڑا، یکایک اس واقعہ کے ہو جانے سے بہادر شاہ کا دل چھوٹ گیا اور اس کو وہان سے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہین آیا، ہمایون نے رفتہ رفتہ تمام گجرات پر قبضہ کر لیا، مگر اس کا قدم گجرات مین اچھے طور پر جما نہ تھا کہ شیر شاہ ایسے دشمن اور بھائیون ایسے مار آستین، دوستون کے ڈر سے وہ آگرہ واپس آیا اور بہادر شاہ نے امرائے ہمایونی

جب مالوہ مین رومی خان کی نمکحرامی سے ہمایون بادشاہ کے مقابلہ مین اس کو شکست ہوئی اور بہادر شاہ کو بے سروسامانی کے ساتھ گجرات بھاگنا پڑا تو اس کے طوطے کا پنجرا بھی مال غنیمت کیساتھ ہمایون بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا طوطے کی حیرت انگیز باتون کو سُن سنکر بادشاہ دنگ ہوتا تھا کہ رومی خان بھی حاضر ہوا، بادشاہ نے فرمایا بیائید رومی خان اس کا نام سنا تھا کہ طوطا چیخنے لگا،

پھٹ رومی خان حرام خور، پھٹ رومی خان حرام خور

قرینہ یہ ہے کہ رومی خان کی نمکحرامی سے بہادر شاہ کو شکست ہوئی ہوگی تو اس کے لشکر کے بچہ بچہ کی زبان پر یہ فقرہ چڑھ گیا ہوگا اور اس طوطے کو بھی سنتے سنتے یاد ہو گیا ہوگا جس وقت ہمایون شاہ کی زبان پر رومی خان کا نام آیا، اُس کو سُن کر وہ فقرہ یاد آگیا، اور اس کو دہرانے لگا۔

مین نے یہ چند مثالین صرف ایک کتاب مرأۃ سکندری سے لی ہین، اگر بزرگانِ دین کے ملفوظات مین جستجو کی جائے تو اردو کی درجہ بدرجہ ترقی پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے،

اب اُردو شاعری کی حقیقت سنو

زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کا ظہور دکن سے ہوا ہے، اس کا ایک

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸) کو گجرات سے نکال کر پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کی مگر اس کی تقدیر نے اس کو چند روز کی مہلت بھی نہ دی، اب پرتگیزون سے اس کو سابقہ پڑا اور یہ رومی خان سے بھی دغاباز نکلے

پرتگیزون نے دعوت کے بہانہ سے بلا کر ان نستہ کو ۹۴۳ھ مین ہمیشہ کے لئے تمام کر دیا اور اس طرح بندرگاہ دمن اور تھانہ وغیرہ ان کے قبضہ مین آ گئے، جن مین سے گوا اور دمن اب بھی ان ہی کے قبضہ مین ہیں،

رومی خان کا انجام یہ ہوا کہ ہمایون بادشاہ نے اس کو چنار گڈھ کے فتح کرنے پر مامور کیا اور فتح ہو جانے پر اسکو اسی کی جاگیر مین دیدیا، مگر تھوڑے دن نہین گذرے تھے کہ زہر ملاہل سے اس کا کام تمام کر دیا گیا۔

خاص سبب ہے جس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنیکی حاجت ہے،

دلی مین قطب الدین ایبک سے لیکر اکبر شاہ تیموری تک جتنے بادشاہ ہوئے ترک ہون یا افغان سید ہون یا مغل ان مین بیشتر ولایت زاد ہوے، اور اگر ان کی اولاد بھی برسر حکومت ہوئی تو وہ بھی آئین و قوانین مین اپنے اسلاف کی پیروی کرتی تھی.

شاہی زبان ہمیشہ فارسی رہی اور اسی زبان مین شاعرون کو اپنے جوہر قابلیت کے چمکانے کا موقع ملتا رہا جس طرح سے آج انگریزون کو ہندوستانیون سے الگ تھلگ رہنا پسند ہے یہان تک کہ اپنی چھاونیان ہندوستانی آبادی سے دور تر مقامون پر قائم کرتے ہین، اتنا تو وہ اپنی رعایا سے کھچے نہین رہتے تھے تاہم رعب وداب قائم رکھنے کو زیادہ میل جول بھی نہین کرتے تھے،

سب سے پہلے اکبر بادشاہ نے مصالح ملکی کے لحاظ سے قرابت و یگانگت ہندوؤن سے پیدا کی اور چاہا کہ جو پردہ بادشاہ اور رعایا مین بیگانگی کا حائل ہے وہ اٹھ جائے، تاہم شاہی زبان فارسی رہی، اور چنگیزی و تیموری تورہ پر آئین و قوانین سلطنت کی بنیاد باقی رہی،

بادشاہ و امرا سب کے سب فارسی بولتے، ترکی زبان کے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے تم دیکھتے ہو کہ محمد شاہ رنگیلے جن کی سات پشتون نے ہندوستان کی آب و ہوا مین پرورش پائی ہے اور ان مین سے ایک نے بھی ترکستان کی ہوا نہین کھائی، وہ بھی ترکی زبان بولتے اور فارسی کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کے نامور اور دو فارسی شعرا مین امیر خسرو، میر حسن، فیضی، عرفی، بیدل، غنیمت، اور ناصر علی جیسے چند نفوس کے سوا تمام تر بیرونی اہل سخن ہین جو

لہ محمد شاہ جن روزون سادات کے پنجہ مین گرفتار تھے اور سادات کی مرضی کے خلاف سانس بھی نہین لے سکتے تھے، اس زمانہ مین اعتماد الدولہ محمد امین خان کو اگر کبھی موقع مل جاتا تو ترکی زبان مین گفتگو کرکے اپنا کام نکال لیتا تھا، دیکھو سیر المتاخرین ص ۴۴۳ مطبوعہ نول کشور پریس،

وقتاً فوقتاً شاہانِ ہند کی فیاضیوں کا شہرہ سُن کر ایران سے ہندوستان آئے اور یہین کے ہو رہے اور ان کی زبان فارسی تھی۔ تاریخ فکر فارسی، ان مین سے بیشتر ساری عمر ہندوستان مین رہ کر ملکی زبان سے ناآشنا محض رہے۔ لیکن ہندوستان مین بہت کم ایسا ہوا ہے کہ دور ترین صوبے شہنشاہی طاقت کے زیر اقتدار ہمیشہ رہے ہون، کشمیر مین ظہور اسلام سے لے کر اکبر شاہ کے زمانہ تک ہمیشہ آزاد حکومت برسر اقتدار رہی، وہان کے بادشاہون نے شاہانِ دہلی کے سامنے کبھی سر نیاز نہین جھکایا، بنگال اور سندھ کبھی آزاد اور کبھی ماتحت ہوتے رہے۔ دکن مین محمد شاہ تغلق کے نارواتشدد سے ایسی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی جس کی یادگار عالمگیر مرحوم کے زمانہ تک باقی رہی، گجرات، مالوہ اور جونپور مین فیروز شاہ کے بعد آزاد سلطنتین قائم ہوئین، جو سیکڑون برس تک زندہ رہین،

یہ حکومتین بیرونی حملون سے ہمیشہ بے خوف رہین ایران و توران سے جو بادل گھر کر آتے تھے وہ دلی پر گرج برس کر نکل جاتے تھے، یا جو بجلی گرتی تھی وہ دلی پر گرتی تھی آج غلامون کی سلطنت ہے، کل خلجیون کی، پرسون تغلق کی، کبھی سید برسر حکومت ہین، کبھی افغان، کبھی مغل، جو آیا اس نے پچھلون کو مار ہٹایا اور خود تاج و سریر کا مالک بن بیٹھا، ایک تیموریون نے کئی سو برس حکومت کی، باقی دو دو تین تین پشتون سے زیادہ نہین چلے،

یہ حالت ان بادشاہون کی نہ تھی جو اطراف ہند مین برسر حکومت تھے جس خاندان مین سلطنت آئی آخر تک اسی خاندان مین رہی، علاوہ اس کے کچھ خاندان ان مین ایسے تھے جو خاص ہندی النسل تھے اور نہین بھی تھے تو دو دو پشتون کے بعد ہندی ہو گئے تھے، خصوصاً دکن مین جو ملکی اور غیر ملکی جھگڑون سے صفحات تاریخ بھرے پڑے ہین،

معلوم ہوتا ہے کہ اہل دکن مین عصبیت کا مادہ زیادہ تھا، ان کو غیر ملکیون کی طرف سے نفرت تھی، جس کسی کو تماشا دیکھنا ہو تو تاریخ فرشتہ مین بیجاپور، احمد نگر اور گلکنڈہ کے حالات پڑھے اسی

کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی مستقل ہستی قائم کرنے کو زبان اور شاعری مین بھی غیر ملکیون سے الگ رہنا چاہتے تھے،

افسوس ہے کہ ہم اس کا ٹھیک زمانہ متعین نہین کر سکتے کہ دکنی زبان فارسی آمیز مین شعر و سخن کا آغاز کس وقت سے ہوا ہے مگر جیسا کہ قاعدہ ہے ہندی دوہرون مین پہلے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبون کی آمیزش ہوئی ہوگی اور اس کے بعد فارسی بحرون کو اختیار کیا گیا ہوگا اور سرکاری تقریبون مین بادشاہون کی تعزیت و تہنیت کا کام اس سے لیا گیا ہوگا، پھر رفتہ رفتہ دیگر اصناف سخن اس مین آ گئے ہون گے آخر کار رقص و سرود کی محفلون اور عزاداری کی مجلسون کی گرمیِ ہنگامہ سی پر موقوف رہ گئی ہوگی،

ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کا بادشاہ تھا، اس کو ہندوستان کی موسیقی سے محبت نہین عشق تھا اور اس مین ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس زمانہ کے تمام گوئیے اس کو جگت گرو کہتے تھے۔

ابراہیم ۹۸۸ھ مین تخت نشین ہوا، نو برس کی عمر تھی، دس برس تک دکنی امرا کی نگرانی مین رہا اور دکنیون کے زور سے غیر ملکی اس کے گرد و پیش سے خس و خاشاک کی طرح نکال پھینکے گئے ایرانیون کا زور بہت کچھ گھٹ گیا، بادشاہ خود ہندوستان مین پیدا ہوا، ہندوستان مین پرورش پائی، ہندوستانیون پر حکومت کرنے کا موقع ملا اور خدا جانے طبعی مناسبت یا اثر صحبت سے ہندوستان کی موسیقی کا شوق پیدا ہوا اور ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین ہزار گوئیے بیجاپور مین جمع کر لئے،

۱۰۰۰ھ مین بیجاپور کے قریب نورس پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس مین گرد اور چیلون کے لئے بڑی بڑی خلسرائین، عمدہ عمدہ باغات، صاف اور ستھرے بازار تھوڑے دنون مین بن کر تیار ہو گئے، شاہی محلسرا کا نام نورس محل، شاہی مہر پر نورس، سکہ پر نورس، علم و نشان کے نام

نورتسی، دھرپد مین ایک کتاب ملکی زبان مین لکھی تھی اس کا نام نورس نامہ ظہوری نے اس کا دیباچہ فارسی مین لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے اس کا نام دیباچہ نورس نامہ قرار پایا،

مثل ہے "الناس علی دین ملوکھم" بعض شاعرون نے اپنا تخلص بدل کر نورتسی قرار دیا ظہوری فارسی نژاد فارسی زبان کا مشہور شاعر ہے، وہ بھی فارسی مین ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہے نمونہ ملاحظہ ہو،

سپہر از سر افرازیش درحساب	زچوکھنڈیش سایہ بر آفتاب

ایک جگہ ساقی نامہ مین لکھتا ہے،

شود چہرۂ زرد خورسند آن	دہندش اگر نازنینان اگال

ابراہیم کو خود راگ اور راگنیون کو ترکیب دینے اور اپنی زبان مین شعر کہنے کا شوق تھا جو کچھ تصنیف کرتا گویون کو سناتا وہ اس کو یاد کرکے پھیلاتے تھے رفتہ رفتہ ملکی زبان مین جو نہ خالص ہندی تھی بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کے امتزاج سے ایک نئی زبان ہوگئی تھی، طبع آزمائی کرنے کا شوق عام ہوگیا، اور بڑھتا گیا، یہان تک کہ فارسی بحرون مین کہنے لگے،

گلکنڈہ مین محمد قلی قطب شاہ اسی ابراہیم کا معاصر نہایت علم دوست ہنر پرور بادشاہ تھا علوم وفنون مین مہارت کلی رکھنے کے ساتھ رنگین مزاج بھی تھا عنفوانِ شباب مین بھاگ متی نام ایک عورت پر ایسا شیفتہ ہوا کہ گلکنڈہ سے چھ میل کے فاصلہ پر اپنی معشوقہ کے نام سے بھاگ نگر ایک شہر آباد کیا اور اس مین عمدہ عمدہ محلسرائین اور باغات تیار کئے، بھاگ متی کے مرنے پر جوشِ محبت سرد ہوا تو بھاگ نگر کا نام بدل کر حیدرآباد رکھا جو آج دولتِ آصفیہ کا پایہ تخت ہے،

محمد قلی شاعر بھی تھا، فارسی اور اردو مین شعر کہتا تھا، اس کا مکمل دیوان نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ مین، اور کتب خانۂ آصفیہ مین اس کا ضخیم کلیاتِ اصنافِ سخن سے مملو موجود ہے

جو قطب شاہی خاندان کا شاہی نسخہ ہے کلام کا نمونہ اس لحاظ سے دیکھو کہ اردو کلام کا سب سے قدیم ترین نمونہ جو ہم تک پہنچ سکا ہے وہ یہی ہے۔ اس سے پہلے کا کوئی شعر کم از کم میری نظر قاصر سے نہیں گذرا۔

پیا ہوں حضرت کے ہاتھ آب کوثر
تو شاباں اپر مجھ کس کر بنایا

سدا تو مدح نبیؐ و علیؑ کہ کہتا ہے
معانی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

خورشید کہ اپر سے ابرو ہلال عید
اس ابروان کو سجدہ کیا ہو دو ہلال عید

ہے محمد قطب شہ بارہ اماماں کا غلام
ہیں سو عاجز داس ٹھہرایا علیؑ سچ دستگیر

آیت قرآں نازل جیوں ہو حضرت کے تئیں
مرتضیٰ رمز ہیں سب جگ میں جیوں قطب ہے

محمد قلی قطب شاہ نے ۱۰۲۰ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ تخت و تاج کا مالک ہوا۔ یہ بھی شاعر تھا۔ فارسی میں ظل اللہ اور دکنی فارسی آمیز میں قطب شہ تخلص کرتا تھا۔ اس کا دیوان مکمل سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ۱۰۳۵ھ میں اس نے وفات پائی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

پیا سانولا من ہمارا بھولا یا
نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

سبے دام اس کا خدمت کرتا ہوں اپنے دل سوں
دیتے ہیں دام ان کو ہور کیتے ہیں عنایت

بکرید عید آیا صلوات بر محمدؐ
آنند علم اچایا صلوات بر محمدؐ

انجانے مین جو انی گیا پند نا سنا　　قرآن اور حدیث سون ترکیب کر کلام

ساقیا آ شراب ناب کہان　　چندر کی پیالی مین آفتاب کہان

سلطان محمد قطب شاہ کے بعد اس کا بیٹا عبد اللہ قطب شاہ بادشاہ ہوا، وہ بھی شاعر تھا سنہ ۱۰۸۳ھ مین اس نے وفات پائی، یہ بھی صاحبِ دیوان گذرا ہے، ؎

گفتم کہ خال و زلفت کیا ہے سو بول منجکو　　گفتا کہ زلف دام ہور خال سو ہے دانا

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب　　دیکھنے ہون تو رہے نا منجہ مین تاب

قند اور نبات گگتا ہے اجھون　　دے نہ سک تری مٹھی لب کا جواب

راز کیا بابان نبی کے صدقے پوچھیگا اگر　　شاہ عبد اللہ کو پوچھ آکر کہ ہے حاضر جواب

آب حیات تھی ہے زیادہ کہ لب ترا　　کرتے ہین نجھون خضر علیہ السلام تخت

یہ تینون سرزمینِ دکن کی سلطنت کے ساتھ ملکِ سخن کی بھی حکومت رکھتے تھے، ہم نے ان تینون کا مندرجہ بالا کلام آصفی کے تذکرہ سے نقل کیا ہے، اور ظن غالب یہ ہے کہ ان کے زمانہ مین بہت سے باکمال شاعر ہوئے ہون گے جو اسی زبان مین شعر کہتے ہون گے، اس واسطے کہ بادشاہون کا میلان جس جانب ہوتا ہے اسی جانب لوگون کے خیالات متوجہ ہو جاتے ہین، اور نہ سہی مراثی یا بادشاہ وقت کی مدح مین قصیدے اسی زبان مین کہے جاتے ہون گے، مگر افسوس ہے کہ اس کے علم کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہین،

البتہ بیجاپور کے شعرا مین سے مولانا نصرتی، ملا ہاشمی، اور میرزا ان مرثیہ گوگان کا ذکر جو سلاطین

مین زبیری نے کیا ہے، اور نصرتی کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہین،

نصرتی محمد عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے جو علی عادل شاہ کے اخیر زمانہ تک زندہ رہا، اس کی تصنیفات مین گلشنِ عشق ایک مثنوی ہے، اردو مین منوہر کنور اور مدمالتی کا قصہ اس مین نظم کیا ہے دوسری کتاب علی نامہ اردو مین ہے، شاہ نامۂ فردوسی کا جواب، اس مین علی عادل شاہ بیجاپوری کے فتوحات بیان کئے ہین، ایک مجموعہ قصائد ہے، ایک غزلون کا دیوان ہے،

ان کتابون کے علاوہ ایک پرانی بیاض میری نظر سے گذری ہے جس مین نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل ہے، تاریخ کتابت ۲۲ محرم سنہ ۱۰۸۳ھ اس مین درج ہے، اور اکبرآباد مین لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نصرتی کا کلام ان ہی کی زندگی مین اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلین بیجاپور سے اکبرآباد پہونچ گئین، معراج نامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمد عادل شاہ متوفی سنہ ۱۰۶۳ھ کے عہد مین لکھا گیا ہے کیونکہ اس کو اسی بادشاہ کے مدحیہ اشعار پر ختم کیا گیا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو،

حمد ہے منعم کبیر اخلق پہ اس ددر کے ... ہے جو بھی رسول خسرو ملکِ دکن

منبعِ لطف وعطا، حامیِ دین با وفا ... معدنِ جود وسخا، ماحیِ کفرِ کہن

صاحبِ فضل وہنر صف شکنِ بحر و بر ... ملجاءِ فتح وظفر بادیِ شمشیر زنا

غازیِ صفدر کے دل پل سون نکلتے نہین ... دھاک سون بھاری بہیا ارت تُت ترن

شہ سا لچھن تول کون ہی جگ مین کہو ... یا دسے جس رتم کے جا سے کدرت محن

راج سون شہ کے سدا حق تھی دعا مین یا ... بنو سے منگے مت پسار دو ہے کے سب دوز

لطف سون ہر یا اللہ شاہ کی شاہی مانک ... جگ مین چیا سر اچتین عیش دھرم کیے

جام سون عشرتِ جم بزم یہ معمور اچھو ... چرخ مین ان رین کے رم ہین جیون

شہ کی ثنا نصرتی نغز و نول یون لکھی ... دور کے دفتر او پر اپ چھپے ہر ایک پن

اسی دور کے دوسرے شاعر ملا ہاشمی تھے جو سید ہاشم حسینی کے مرید اور نظر یافتہ تھے، یہ بھی صاحب دیوان ہین اور یوسف زلیخا کا مشہور قصہ اردو کی ایک مثنوی مین انھون نے نظم کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ان کے کلام کا نمونہ زبیری نے بساتین السلاطین مین نہین دیا،

آصفی نے محبوب الزمن مین ان کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان کا نام شاہ ہاشم بیجاپوری بتایا ہے، اور سنہ وفات ۱۱۹۰ھ ظاہر کیا ہے، یہ دونون باتین میرے نزدیک صحیح نہین، بیجاپور کی جو تاریخین پیش نظر ہین ان مین ان کا نام مذکور نہین، سید ہاشم یا شاہ ہاشم ان کے پیر و مرشد کا نام تھا، جو حضرت شاہ صبغۃ اللہ گجراتی مہاجر مدینہ طیبہ کی اولاد مین بہت عالی مرتبہ درویش تھے، سنہ وفات کی غلطی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ نصرتی کے معاصر اور علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر اور سید ہاشم موصوف الصدر کے مرید ہین، کیا عجب ہے کہ ۱۰۹۰ھ کی جگہ ۱۱۹۰ھ غلطی سے درج کر دیا گیا ہو،

آصفی نے دو شعر بھی ایک جگہ نقل کئے ہین جو بجائے ریختہ کے ریختی مین ہین، ان شعرون کی زبان نصرتی کی زبان سے ٹکر نہین کھاتی، اس لئے عجب نہین کہ وہ شعر بھی کسی اور کے ہون،

اسی زمانہ کا ایک اور شاعر میرزا ہے، جو صرف مرثیے کہتا تھا، حمد و نعت و منقبت کے سوا کبھی اپنی زبان کو دوسری چیزون سے اس نے آلودہ نہین کیا، اس نے علی عادل شاہ کے عہد مین وفات پائی، اور افسوس کہ بساتین السلاطین مین زبیری نے اس کے کلام کا بھی نمونہ نہین دیا،

ان تینون کے سوا بیجاپور مین اور بھی شعرا گذرے ہین، مگر افسوس ہے کہ ان کے اتنے حالات بھی نہین ملتے جس سے بیان کا سلسلہ قائم رکھا جائے، بیجاپور کی تباہی سے ان سب کا نام بھی مٹ گیا، اور بچے کھچے حیدرآباد آ بسے اور وہین کے ہو گئے،

ابو الحسن تاناشاہ کا زمانہ تھا، جو عبد اللہ قطب شاہ مذکور کا داماد و جانشین، و شعر و سخن کا شیفتہ

تھا اس نے ان لوگون کی سرپرستی کی میر حسن اور مرزا علی لطف نے اپنے اپنے تذکرون مین صرف ایک ہی شعر تانا شاہ کا نقل کیا ہے جو پیش کرتا ہون،

کس ور کہون جاؤن کہان مجھ دل پہ یہ مشکل بجھ پڑی ہے | اک بات کے ہون گے سجن یہان جی نبی بارہ بات ہے

تانا شاہ[1] کے مصاحبون مین شاہ قلی خان شاہی ایک مرثیہ گو شاعر تھے میر حسن کہتے ہین کہ ان کے اشعار دکن سے ہندوستان بڑے شوق سے لوگ لایا کرتے تھے ان کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو،

ملنا تمھنگا غیر سر کوئی جھوٹ کوئی سچ مچھ کہے | کس کس کا منھ موندون سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ابو القاسم مرزا ایک شاعر تھے جو تانا شاہ کے مصاحب اور معزز طبقہ لوگون مین تھے حیدرآباد کی تباہی کے بعد باس درویشانہ مین کر گوشہ نشین ہو گئے تھے عبد اللہ گنج مین رہتے تھے اور وہین زیر خاک سوتے ہین ان کا بھی ایک شعر میر حسن کی زبانی سنئے،

عارض نہین چندر کا تری گال سون اچھا | سمجھین ہین کلف کو نہ تجھ خال سون اچھا

حیدرآباد کی تباہی کے بعد اورنگ آباد مین اکثر لوگون نے پناہ لی، عالمگیر مرحوم کی عمر کا بیشتر حصہ وہین بسر ہوا ہے اور اس تقریب سے دلی اور اکبرآباد کے ہر طبقہ کے امرا، علما، مشائخ جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا واسطہ اور تعلق تھا، اورنگ آباد آرہے تھے،

ایک مدت تک اردو شاعری کا مرکز اورنگ آباد رہا، بہت سے شعرا وہان جمع ہو گئے، شمس ولی اللہ کے عروج و اقبال کا ستارہ بھی وہین چمکا، ان کے سوا اور جو شاعر وہان ہوئے ان مین سے پچیس تیس شاعرون کا ذکر میر تقی میر نے اپنے تذکرہ مین سید عبد الولی عزلت کی بیاض سے نقل کر کے کیا ہے اور اس سے کچھ زیادہ میر حسن نے لکھا ہے، مگر افسوس ہے کہ ان دونون کو ان شاعرون کے

---

[1] تانا شاہ کی درسی کتابین لکھی ہوئی تھین، مین نے مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ مین جلالین کا ایک نسخہ دیکھا ہے، جس مین دو ایک مقامون پر تانا شاہ کے حاشیے چڑھے ہوئے ہین،

حالات اور اشعار نہین ملے صرف ایک ایک دو دو شعر لکھدیے ہین میر صاحب کی رائے ان شعرا کے متعلق اچھی نہین ہے، مگر مین نے شعرائے دکن کے ذکر مین یہ بات ثابت کی ہے کہ میر صاحب کی یہ رائے ان کی ناواقفیت پر مبنی ہے[1]،

اُس زمانہ مین اردو شاعری نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ جو لوگ ولایت زا ہوتے تھے اور ان کو اردو زبان مین یون بھی نہین آتا تھا وہ بھی اس مین طبع آزمائی کرنا فخر سمجھتے تھے،

مرزا معز الدین فطرت عالمگیری امرا مین بڑے پایہ کے شاعر تھے موسوی خان خطاب تھا اسی مناسبت سے معز فطرت اور موسوی تین تخلص اختیار کئے تھے انھون نے اردو مین شوق پورا کیا ہے، ملاحظہ ہو،

اززلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

قزلباش خان امید اسی زمانہ کے بڑے نامور شاعر ہین اور اہل ہند ... تھا ان کے علمون کی گرم جوشیان مشہور ہین، مگر اردو میں جو نمایہ کمال کیا ہے اردو یہ ہے...

باہن کی بیٹی آج مری آنکھون پڑی ‏ ‏ ‏ ‏ غصہ کیا دگالی دیا اور دگر لڑی

اردو شاعری کا مرکز بنقل دکن سے دلی کو منتقل ہوتا ہے

عالمگیر مرحوم کے جنت نصیب ہونے کے بعد بیٹون اور پوتون مین سلطنت کے حصے بخرے کرنے مین خون کی ندیان بہنے لگین اور اس کا سلسلہ بیس پچیس برس تک قائم رہا بلکہ یون کہنا چاہیے کہ

---

[1] اب تک اورنگ آباد اور اس کے نواح کے قصبات کی زبان دشائستگی حیدرآباد و نواح حیدرآباد سے اس خاندان سے ممتاز ہی کہ اس مین دہلویت زیادہ محسوس ہوتی ہو [2] قزلباش خان امید کا یہ شعر غالباً اس زمانہ کا ہو جب ان کا قیام اورنگ آباد مین تھا، اخیر عمر مین دلی آ رہے تھے وہان جو طبع آزمائی کی ہے اس کا نمونہ آگے چل کر آئے گا،

محمد شاہ کی مدت سلطنت کو چھوڑ کر آخر تک رہا اور اس نے سلطنت کا کھوج لگایا۔

بہادر شاہ عالمگیر کے بڑے بیٹے نے تقریباً پانچ برس تک اور فرخ سیر بہادر شاہ کے پوتے نے چھ برس سلطنت کی مگر بہادر شاہ ملایانہ مزاج کے آدمی مذہب کی دھن مین ایسے لگے کہ ان کا سر پیر اسی سے نہین چھوٹا، فرخ سیر بادشاہ گرون، کے پنجۂ غضب مین گرفتار رہتے تھے اس عرصہ مین کسی کو چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع نہین ملا محمد شاہ کے زمانہ مین سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی اس وقت ادھر ادھر سے سمٹ کر دلی مین سب لوگ مجتمع ہو گئے، محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا، امرائے دربار برسون سے خانہ جنگیان کرتے کرتے تھک چکے تھے ہتھیار کھول کر سب عیش و عشرت مین پڑ گئے "شاعری اور بے فکری" مثل مشہور ہے قزلباش خان امید، سلیمان قلی خان وداد، علی قلی خان ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خان فراق، میر شمس الدین فقیر، مرزا عبد القادر بیدل، سراج الدین علی خان آرزو ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دلی مین مجتمع تھے، شمس ولی اللہ دکن سے آ گئے فراقی، فخری، آرزو وغیرہ بھی دکن سے آئے مگر واپس گئے، ولی کچھ دنون کو رہ گئے اور ان کا رنگ دلی مین خوب جما ہر طرف سے قدر دانی کی گئی معرفت کی محفلون مین قوال ان ہی کی غزلین گانے لگے اور ارباب نشاط یارون کو سنانے لگے، جو شعراء صرف فارسی مین اظہار خیال کرتے تھے، ان کو اردو مین بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، قزلباش خان امید کا ایک شعر تم اوپر دیکھ چکے، دو شعر ان کے اور سنو،

یار بن گھر مین عجب صحبت ہے   در و دیوار سے اب صحبت ہے

تیری آنکھون کو ڈرتا ہون   الحفیظ الحفیظ کہتا ہون

ایک شعر پہلے پڑھ چکے دو یہ ہین، ان تینون کو ملا کر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر کسی اور کا ہے،

یا پچھلے دو شعر امید کے نہین ہین مگر نہین یہ تینون شعر انہی کے ہین۔ پہلا شعر اس وقت کا ہے جب ان کو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا، اور یہ دکن مین تھے، ہندوستان مین رہتے رہتے زبان اتنی صاف ہو گئی تھی کہ یہ دو شعر نہایت صاف ادو سادہ کہہ سکے، میر تقی میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونون شعر دلی کی کمائی ہین،

مرزا عبدالقادر بیدل بھی دورِ عالمگیری کے شاعر ہین، یہ بھی فارسی مین اظہارِ کمال کرتے تھے، مگر جب اُردو کی گرم بازاری دیکھی تو انھون نے اس مین بھی شوق پورا کیا، ان کے بھی دو شعر نکات الشعرا سے نقل کرتا ہون،

مت پوچھ دل کی باتین وہ دل کہان ہے ہم مین
اس تخمِ بے نشان کا حاصل کہان ہے ہم مین

جب دل کے آستان پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہان ہے ہم مین

مرزا علی قلی خان ندیم بھی فارسی کے مشاق شاعر ہین، مگر اُردو مین بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کی ہے، ؎

جدائی مین تری ہم کیا کہین کس طرح جلتے ہین
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہین

بیقرار عشق کو ہے زندگی نقصِ کمال
مر چکی سیماب تب کہتے ہین یہ اکسیر ہے

مرزا مرتضی قلی فراق بھی فارسی کے کہنہ مشق شاعر ہین، اُردو مین فرماتے ہین، اور خوب فرماتے ہین

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے
کہان اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے

اسیرون کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن مین
کوئی ان ہمنواؤن سے ہمین بھی یاد کرتا ہے

میر شمس الدین فقیر فرماتے ہین ؎

زندگی موجِ آب ہے گویا
دم کا آنا حباب ہے گویا

خال اس کی بیاضِ گردن کا نقطۂ انتخاب ہے گویا

سراج الدین علی خان آرزو بھی فارسی کے قادر الکلام شاعر ہیں، میر تقی میر نے ان ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی ہے، وہ بھی کبھی کبھی اردو میں طبع آزمائی فرماتے تھے، آزاد نے ان کو دوسرے دور کے اردو شعرا میں جگہ دی ہے، مگر میر آزاد کی زبردستی ہے مجھکو آرزو کے فضل و کمال میں کلام نہیں مگر اردو کے دو چار شعر کہہ لینے یا شعرائے ریختہ کو عروض و قافیہ

ملحہ آزاد کی زبردستی اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑا ظلم انھوں نے یہ کیا ہے کہ میر اثر، قائم، یقین، ہدایت، حزین، بیان، جیدار ایسے اردو کے مشاق شعرا ... کو کہیں جگہ نہیں دی باوجودیکہ قائم کے ذکر میں خود فرماتے ہیں کہ "ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا سے پیچھے نہیں رکھ سکتے ... ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس غریب کو کیوں نظر انداز کیا یہ عذر کہ قبول عام اور شہرت نہ پائی عذر بدتر از گناہ ہے۔

مزہ یہ ہے کہ میر غلام حسین ضاحک کو میر و مرزا کی صف میں اور میر مستحسن خلیق کو ذوق و غالب کے دور میں جگہ دی ہے جن کے دو دو چار چار شعر بھی نہیں ملے کہ آبِ حیات میں درج کرتے، آزاد یہ موقوف نہیں ضاحک کے فرزند رشید میر حسن کو بھی اپنے تذکرہ میں درج کرنے کو باپ کے صرف تین شعر ملے ہیں، بات یہ ہے کہ میر ضاحک کی طبیعت جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے ہجو اور ہزل پر فریفتہ تھی، اور زبان ایسی نہ تھی کہ ... بیٹے میر حسن ان کے بیٹے بطور معذرت کے فرماتے ہیں کہ "با وجود قوت آں علم کہ در ہجو گوئی ... سامعان ... سخن خود ... حوصلۂ ... بطرف ہزل توسن قلم راندند لیکن ... عجیب و غریب طرح کردہ اند کہ ... تا این دم کسے نہ گفتہ چنانچہ یک مطلع رقم می نماید

یا رب ... زردیان جہانگہ

... فرد ...

پڑھا لینے سے اُن کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ اردو شعرا کی صف میں اُن کو جگہ دیجائے، اگر ایسا ہو سکتا ہو تو مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا معز الدین فطرت، قزلباش خاں اُمید، شیر شمس الدین فقیر، اور علی قلی ندیم نے کیا قصور کیا ہے اُنھوں نے بھی اردو میں چند شعر اردو میں کہے ہیں اور اردو شعرا کے کلام میں اصلاح دی ہے اور اُن کو شاعری سے لگاؤ بتاتے ہیں،

بہرحال سراج الدین علی خاں آرزو نے اردو میں طبع آزمائی فرمائی ہے جس کا نمونہ یہ ہے

ہر صبح آ دیتا ہے تیری برابری کو　　کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے　　چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

میخانے بیچ جا کر شیشے تمام توڑے　　زاہد آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

تجھ زلف میں اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے　　بیکار رہے اُس سے نہ رہے دل تو کیا کرے

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں　　زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

جن حضرات کا ذکر میں نے اس جگہ کیا ہے ان کے سوا اور بھی چند لوگ ہیں جو باوجود فارسی میں کہنہ مشق ہونے کے اردو میں بھی کبھی کبھی شوق پورا کرتے تھے مگر سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں،

مقصد اس تحریر کا یہ ہے کہ اردو شاعری کا بیجاپور یا حیدرآباد دست ہو اگر بیجاپور کو راس نہیں آئی اس نے اُسے لے لیا اور لے بڑھ گئے حیدرآباد نے کچھ دنوں اُس کی پرورش کی

آخر کار اس کو بھی وہی روز بد دیکھنا پڑا جو بیجاپور دیکھ چکا تھا۔

حیدر آباد کی تباہی کے بعد ریختہ نے اورنگ آباد میں انہی مغلوں کے دامن میں پناہ لی جنھوں نے بیجاپور اور حیدر آباد سے اُس کو نکالا تھا۔

عالمگیر مرحوم کے بعد چند دنوں اِدھر اُدھر آوارہ رہنے کے بعد دلی میں ریختہ نے اردوئے معلی کا خطاب پاکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی، اور دلی کی آب و ہوا میں پرورش پاکر دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔ دوسری چیز جو میرے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوئی ہوگی وہ یہ ہے کہ شمس ولی اللہ کے آنے سے پہلے دکن میں قصیدہ، رباعی اور غزل سرائی شروع ہو چکی تھی، اور مثنویاں لکھی جا چکی تھیں، اس لئے اس بات کا افسوس کرنا پڑتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے ولی کو اولیت کا تاج پہنایا ہے، اور آزاد نے آب حیات میں زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ بات نکالی ہے کہ

> شمس ولی اللہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا...... انھیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہل کو۔

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اردو نظم کی تاریخ لکھنے پر خاطر خواہ غور نہیں فرمایا اور جن شاعروں نے ولی سے پہلے اردو زبان کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے، اُن کی کاوشوں اور کوششوں پر خاک ڈال دی ہے۔

اردو نثر کی تاریخ

زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی شاعر نے ۱۰۴۵ھ میں وہ مجلس

نام سے ایک کتاب نثر اردو میں لکھی ہے، اور اس کا بیان ہے کہ اردو نثر میں یہ پہلی کتاب ہے۔ ۱۱۴۱ھ میں شمس ولی اللہ نے ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حالات میں لکھی تھی جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:—

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال　　تھا گیارہ سو پر اکتالیسواں سال

کہا ہاتف نے یوں تاریخ مقبول　　ولی کا سخن ہے حق پاس مقبول

فضلی نے جب دہ مجلس لکھی ہے، اس وقت ولی زندہ تھے، لوگوں نے سمجھا کہ فضلی نے ولی کی مثنوی کو نثر کا جامہ پہنا دیا ہے، مگر دہ مجلس کے دیباچہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی فارسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے، یہ بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی، مگر یہ فضلی کی نظر سے نہ گزری ہو، مصنف کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"ہرگز دل میں نہ گزرا کہ ... کو عقل پا ... کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد خدائے احدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور کوئی مرد اس زمین میں آج تک کوئی اس صنعت کا موجد نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوا ... اندیشۂ تحقیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل و تدبر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی ... گوہر مطلب ... دل افگار پہ ہزار زمین آئی بات آئینۂ خاطر میں منہ دکھائی"

اس تصنیف کے چند دنوں بعد میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے احمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں قصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا، اور ایک کتاب اردو نثر میں لکھی جس کی نسبت میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو میں فرماتے ہیں کہ "وہ ہندی نثر کا بے ایجاد کردہ" معلوم ہوتا ہے کہ اردو

میں نثر نویسی کا اُس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا اسی وجہ سے میر حسن اس کو ایجاد سے تعبیر کرتے ہیں، ایک فقرہ بطور نمونہ کے میر حسن نے پیش کیا ہے، احمد شاہ کو مکحول کرنے کے ذکر میں حکیم نے لکھا ہے:۔

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر ۔ آج کے دن اندھے ہو بیٹھے بصیر

ایسی دولت سے زنہار زنہار ۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

تھوڑے دنوں بعد میر عطا حسین تحسین باشندہ اٹاوہ نے چار درویش کا قصہ امیر خسرو کی کتاب سے اردو میں ترجمہ کر کے نوطرز مرصع نام رکھا ۱۲۱۳ھ میں تصنیف و ترجمہ سے فراغت پائی، اس کتاب کے نام سے بھی اس بات کا پہلو نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی یہ نیا طرز سمجھا جاتا تھا۔

۱۲۱۵ھ میں مرزا لطف علی نے گلزار ابراہیم مصنفہ مرزا علی ابراہیم خاں بہادر کا ترجمہ اردو مسٹر گلگرسٹ کی فرمائش سے کیا اور گلشن ہند نام رکھا، اس تذکرہ کو مولوی عبد الحق خاں نے چھپوا کر حیدرآباد سے شائع کر دیا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ کلکتہ میں حکام کو اپنے مصالح ملکی کے لحاظ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو انگریز ولایت سے تازہ وارد ہوتے ہیں ان کو اردو زبان سکھائی جائے اردو میں اس وقت تک ایسی کتابیں موجود نہ تھیں اس لئے ڈاکٹر جان گلگرسٹ کے زیر اہتمام اس کام کو شروع کیا گیا،

دلی اور لکھنؤ سے زبان دان بلائے گئے، اور اردو زبان کو وسعت اور ترقی دینے کے لئے قصوں اور کہانیوں کی کتابیں اردو میں لکھوائی گئیں،

سید حیدر بخش نے طوطا کہانی لکھی جس میں ابن نشاطی کی طوطی نامہ کو اپنے زمانہ کی اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے، اور اصل میں اس کا ماخذ سنسکرت کی ایک کتاب ہے، ایک کتاب گل مغفرت

یا و مجلس دنیا۔ ہند کے حالات میں لکھی بہار دانش کا ترجمہ کرکے گلزار دانش نام رکھا ایک اور کتاب تاریخ نادری لکھی جو کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے اور آرائش محفل کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں حاتم طائی کا قصہ بیان کیا ہے

میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا اور ایک کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی جو فارسی کی مفرح القلوب کا ترجمہ ہے اور اس کا ماخذ سنسکرت کی کوئی کتاب ہے۔

میر امن دہلوی نے باغ و بہار آراستہ کیا اس کا ماخذ میر خسرو کی چہار درویش نہیں بلکہ نو طرز مرصع ہے یہ کتاب اس زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں دلی میں بولی جاتی تھی۔ ایک دوسری کتاب گنج خوبی کے نام سے لکھی جس کو اخلاق محسنی کا ترجمہ کہو یا اسی طرز کی ایک کتاب سمجھو۔

مولوی حفیظ الدین احمد نے پروفیسر روبٹ ولیم کے کہنے سے ابوالفضل کی عیار دانش کا ترجمہ کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اس کتاب کا اصلی ماخذ سنسکرت ہے جو عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس نے شیخ سعدی کی گلستان کا ترجمہ کر کے باغ اردو نام رکھا۔ ایک اور کتاب آرائش محفل لکھی جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں اور وہ سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہیں۔

کاظم علی جوان نے شکنتلا کو جو نواز کی برج بھاشا کی کتاب سے ماخوذ ہے اور دستور ہند کے نام سے بارہ ماسہ تصنیف کیا جس میں ہندو مسلمانوں کے تہواروں کا ذکر ہے۔

اکرام علی نے رسائل اخوان الصفا کے ایک رسالہ کا ترجمہ اخوان الصفا کے نام سے کیا ہے اس میں انسان و حیوانات کا جھگڑا بیان کیا ہے جو جنات کے بادشاہ کے سامنے پیش ہوا ہے

اصل کتاب عربی زبان میں ہے،

سری لالو گجراتی نے پریم ساگر، راج نیتی اور لطائفِ ہندی ترجمہ یا تالیف کیں، اور
کاظم علی جوان کی مدد سے سنگھاسن بتیسی لکھی جو آدھی ہندی اور آدھی اردو ہے،
مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مانند
ہے اور خود ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو زبان کے قواعد قلمبند کئے اور اردو زبان کی لغت لکھی۔
معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اردو زبان کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ علماء کو
اُسی زبان میں مذہبی کتابوں کے لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا اور حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ نے
سنہ ۱۲۲۲ میں قرآن شریف کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا، اور اُن کے بھائی شاہ رفیع الدین نے
تحت اللفظ ترجمہ لکھا، اور اُن کے بھتیجے مولانا محمد اسمعیلؒ نے اپنی کتاب رد الاشراک کے باب
اول کا ترجمہ اردو میں تقویۃ الایمان کے نام سے کیا، اور انصاف یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر
رحمۃ اللہ علیہ کا موضح القرآن اور محمد اسمعیل کی تقویۃ الایمان زبان کی صفائی اور سادگی
میں اب تک بے نظیر ہیں، ان بزرگوں کے بابرکت ہاتھوں کے لگ جانے سے اردو زبان کا سکہ
ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک رائج ہو گیا،

؎ مقدمہ گلشن ہند،

اُردو شاعری پر تبصرہ

میں نے امتیاز کے لئے اس کتاب کے تین حصّے کر دیئے ہیں، پہلا طبقہ متقدمین کے لئے مخصوص ہے، اور اس میں تین دور ہیں، دور اوّل کے شعرا میں سے صرف ایک شاعر کا میں ذکر کر سکا ہوں، دوسرے دور میں شعرائے دکن اور تیسرے میں شعرائے دلی کا بیان ہے،

دوسرا حصّہ متوسطین سے مخصوص ہے، اور اس میں بھی تین دور ہیں، پہلا دور میر و مرزا کا، دوسرا مصحفی اور میر حسن کا تیسرا ذوق و غالب کا،

تیسرا حصہ متاخرین کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس میں بھی تین دور ہیں، پہلا دور ناسخ و آتش کا، دوسرا امیر و داغ کا تیسرا حالی و اکبر کا، جنھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہے

طبقہ متقدمین

اس طبقہ میں پہلا دور اُن شاعروں کا ہے جن کی نشو و نما حیدرآباد و بیجاپور میں ہوئی ہے اس دور میں جو شعرا صاحب دیوان ہوئے ہیں، اُن میں سے محمد قلی قطب شاہ سلطان محمد قطب شاہ، عبد اللہ قطب شاہ، مولانا نصرتی اور مولانا ہاشمی کے نام اب تک معلوم ہو سکے ہیں،

ان لوگوں میں سے اوّل الذکر تین نام خاندان قطب شاہیہ کے تین بادشاہوں کے ہیں جن کے دیوان حیدرآباد میں موجود ہیں، اور اُن کے کلام کا بیشتر حصہ صفی ملکاپوری نے تذکرۂ شعرائے دکن میں نقل کیا ہے، اُن کے زمانہ میں اردو زبان عالم طفولیت میں بھی کہی

الفاظ کثرت سے اس میں پائے جاتے ہیں، اور میرا خیال ہے کہ شمالی ہندوستان کے رہنے والوں کو اُن کے اشعار کا بیشتر حصہ سمجھ میں نہیں آسکتا،

طریقۂ بیان میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے سیدھے سادے انداز سے پیش پا افتادہ مضامین کو نظم کر دیا ہے، تاہم اگر کوشش کرکے اُن کا صاف اور سادہ کلام یک جا کر دیا جائے تو اردو زبان کی تاریخ کا سلسلہ مکمل ہو جائے گا۔

دوسرے دور کے شعرا کا نشو و نما اورنگ آباد میں ہوا ہے، ان کی زبان منجھتے منجھتے بہت صاف ہو گئی ہے، تاہم دکن کا لب و لہجہ اور بہت سے الفاظ و روابط جو اہل دکن کے ساتھ مخصوص ہیں، ان لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں، مثلاً نکو بجائے نہیں کے، سیتی بجائے سے، ڈالیں ست دیئے بجائے ملا دیئے، بیگی بجائے جلدی، دستا دیکھتا کے معنوں میں، آپس اپنے کی جگہ، سنگات، ہمراہ، دو ایک دہن، بابات، باتن، ان کے سوا اور الفاظ و روابط ہیں، جو اس دور کے ساتھ مخصوص نہیں، حضرت ولی کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً سوں، سیتی، بجائے سے کو، تن واو معروف کے ساتھ بجائے کو، ہمن کو بجائے ہم کو، ان بجائے طرح، ہوتن، سرجن، اُپنیم بجائے مشتاق، جگت، منے، دنیا، یوں، بہت، بریں یعنی گویا میں، مجھ دل، میرا دل، تجھ لب، تیرا لب، بات، دنیا، بچن، کلام، نت، ہمیشہ، مکھ، منہ، بھیتر، اندر، بھوان، بھویں، پلکاں، پلکیں، ہویا، بیگانہ، بیرکانہ، دانا، دیوانہ، عرض سکون رے کے ساتھ بجائے عرض کے جس کی رے کو فتحہ ہے، تسبیح، سہی، صحیح ہیں، کہا میں نے کہا، ان کے سوا اور بھی الفاظ ہیں جو طبقۂ متوسطین کے شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں، ان کا ذکر وہاں آئے گا،

ان دونوں دور کے شاعروں کا انداز بیان بہت صاف و سادہ ہے، جو کچھ آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گذرتے ہیں، وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں ایچ پیچ کے

خیالات دور دور کی تشبیہیں نازک استعارے نہیں بولتا اسی واسطے اشعار صاف بے تکلف ہیں

مگر چونکہ اردو شاعری کی ابتدا فارسی کی انتہا ہوتی ہے، لہذا بہت سے خیالات جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے ہیں، اس میں خود بخود آگئے، مثلاً بجائے عورتوں کے لڑکوں کا عشق، ان کے خط کی تعریف، شمشاد، نرگس، سنبل، سوسن، بنفشہ وغیرہ کی تشبیہیں لیلیٰ شیریں شمع گل سرو وغیرہ کا حسن، مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری، پروانہ کا عشق، مانی و بہزاد کی مصوری، رستم و اسفندیار کی بہادری، زحل کی نحوست، سہیل یمن کی رنگ افشانی، نوروز کا جشن، جام جم خم افلاطون، راہ ہفت خوان، کوہ الوند، کوہ بے ستون، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں، جیحون اور خدا جانے کیا کیا الفاظ، ترکیبیں اور خیالات فارسی سے اردو میں آگئے،

ان خیالوں اور اشاروں نے اردو شاعری کو سنگلاخ بنا دیا جس کی ماں بھی سی شیریں زبان تھی، جو ہم کو وہ چیزیں بتاتی ہے جن کی کیفیت اُن کے دیکھنے سننے سونگھنے چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے، مثال کے طور پر خیال کرو، بارش کا موسم ہندوستان میں بہار کا موسم ہے، بادلوں کا گھر گھر کر آنا، سرد ہواؤں کا چلنا، سرسبز اور شاداب درختوں کا جھومنا، ہلکی ہلکی پھوار کا پڑنا، کوئل کا کوکنا، پپیہوں کا پی کہاں پی کہاں کی صدا لگانا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی دلکش باتیں ہیں، جن کو دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے، اور اسی باتوں کو اگر شعر کے قالب میں ایک خاص انداز سے ڈھالا جائے تو اس کو سنکر دلوں میں جوش اور طبیعتوں میں اتنی اُمنگ پیدا ہو سکتی ہے، جو بہار فارس کو خواب میں نصیب نہیں،

مگر بدقسمتی سے اردو شاعری میں گل وبلبل کا دخل ہوا جو متقدمین کے ہاں کم کم متوسطین کے ہاں کچھ زیادہ پایا جاتا ہے، اور متاخرین کی شاعری کا دار و مدار اسی پر ٹھہر گیا، تحسین و آفرین کی ہوس میں کبھی صفت در صفت، کبھی استعارہ در استعارہ سے اُسے اتنا تنگ و تاریک

کر دیا کہ شاعری گورکھ دھندا بن کر رہ گئی،

بہر حال متقدمین کے خیالات میں ندرت نہیں ہے تو نہ ہو، مگر اُن کا انداز بیان بہت بے تکلف اور سیدھا سادا ہے؛ اس میں شعرائے دکن و ولی میں باہم امتیاز نہیں، البتہ یہ حیرت کی بات ہو کہ شمس الدین ولی نے اپنے کلام میں ایہام اور ذومعنیین سے اتنا کام نہیں لیا جتنا شاہ مبارک آبرو اور اُن کے معاصرین کام لیتے ہیں، خدا جانے ان بزرگوں کو اس کا شوق کیونکر پیدا ہوا، میرے خیال میں آزاد کی یہ رائے صحیح ہے کہ دوہروں کے انداز نے جو ہندوستان کا سبزۂ خودرو تھا، اردو کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا،

طبقۂ متوسطین

میں نے اس حصہ کو تین دور پر تقسیم کیا ہے، دور اول میں مرزا مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم، یقین، بیان، حزیں، ہدایت، قدرت، بیدار، ضیاء، جو اس دور کے اُن ممتاز شاعروں میں ہیں جنھوں نے زبان کی صحت و صفائی، اور طرز بیان کی خوبی اور پاکیزگی میں نمایاں حصہ لیا ہے،

دوسرے دور میں میر اثر، بقا، حسرت، راسخ، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین اور فراق کا ذکر ہے جنھوں نے زبان کو پہلے سے زیادہ صاف کیا ہے، اور طرز بیان میں بھی کسی کسی نے نیا انداز پیدا کر دیا ہے،

تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کا ذکر ہے جنھوں نے زبان کو بہت زیادہ صاف و ستھرا کر کے کلام کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ کر دیا ہے، اور لطف یہ ہے کہ صفائی اور سادگی کو بھی ایک حد تک قائم رکھا ہے،

دورِ اول | (۱) سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری

کوشش کی اور بہت سے الفاظ و روابط جنھیں ولی اور اس کے ہمعصر بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے، تاہم کچھ الفاظ ایسے رہ گئے جو اُن کے زمانہ میں فصیح سمجھے جاتے ہوں مگر آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، مثلاً کیا بجائے کس کس، اُن نے جن نے بجائے اُس نے جس نے، بھر نظر بجائے نظر بھر کے، دل آپنے کے بجائے اپنے دل کے، مجھ آنسو بجائے میرے آنسو کے، جن تس نے بجائے جس کسی نے، ایدھر اودھر بجائے اِدھر اُدھر، کہنے لاگا بجائے کہنے لگا، دوانہ بیگانہ بجائے دیوانہ و بیگانہ، رقیباں بجائے رقیبوں کے، انکھڑیاں آنکھوں کی جگہ، سجن معشوق کے معنوں میں، بیچ، اندر کے معنوں میں، دم کھا رہو، سانس نہ لو یعنی چپکے رہو، کنے پاس، آپ ہیں نا میں، نہ آپ ہیں نہ تیں ہیں کہا میں نے کہا، اسی طرح کے اور چند الفاظ ہیں جو زیادہ تتبع کرنے سے مل سکتے ہیں،

تاہم زبان کے صاف اور ستھرا کرنے میں اس دور کے شعرا نے جو کوششیں کی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں،

(۲) دلپذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انھیں کہیں ترجمہ کرکے اور کہیں بجنسہ لے لیا ہے، مثلاً تر دامن، پستہ دہن، آتش زیر پا، کمر کوہ، دامن کوہ، گردن مینا، دست سبو، سرو آزاد، سوسن دہ زباں، نرگس شہلا، داغ جنوں، طفل اشک، یاد ایام، بر آمدن، در آمدن، بسر آمدن، گوش کردن، بو کردن، چراغ کشتن، دل دادن، دل از دست رفتن، از جاں گذشتن، از سر چیزے گذشتن، عرق عرق شدن، پیمانہ پر شدن، از جامہ بیروں شدن، دامن افشاندہ برخاستن، خوشا بحال کسے، بیکہ، حیف است یا حیف کس، نیکلا اور اسی طرح سینکڑوں الفاظ اور محاورے ہیں جنھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا، آزاد نے آبحیات میں اس بحث کو بہت پھیلا کر بیان کیا ہے، اور ہر ایک کی مثالیں

شعرا کے کلام سے نکال کر پیش کی ہیں، جو پڑھنے کے قابل ہیں،

(۳) اُنھوں نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھتے چلے آتے ہیں، ان کو بہ تبدیلِ الفاظ اور بہ تغیرِ اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیئے اور مزے لیجیے، اُن کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز و دلکش ہیں، علاوہ اسکے قدما کے جذبات و خیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جو نزاکتیں اور لطافتیں اُنھوں نے پیدا کی ہیں وہ باوجود پرانے روزمرہ اور محاوروں کے بدل جانے کے ابتک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں، میں نے اس کتاب میں ہر ایک کے اشعار اسی قسم کے انتخاب کئے ہیں، جو اپنے اپنے موقع اور محل پر آئیں گے، تاہم جی نہیں مانتا، یہاں بھی چند اشعار مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں،

مرزا مظہر علیہ الرحمہ

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آئی ہے بہار

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

کیا جوان مارا گیا خوباں کے ہاتھ
لاکھ حسرت کھیت آئیں جس کے ساتھ

مرزا رفیع

اے لالہ گو فلک نے دیئے تجھکو چار داغ
چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر — اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں — اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات — آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

میر تقی میرؔ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر — تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں دم نکل گیا

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم — کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے — آئے ہیں ابکی یارو پھر کر خدا کے ہاں سے

واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میر — آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پر گئے

آشیانے میں رات بلبل کے — آتشِ گل سے رات پھوک پڑا

خواجہ میر دردؔ

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے
معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہی

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں
دل میں ہے وہ بھی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

قائمؔ

قائم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح
مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد عمر نوح
دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا

یقینؔ

شب ہجراں کی وحشت کو تو اے ہمدرد کیا جانے
جو دن پڑتے ہیں ان کو مجھے تیری بلا جانے

گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح
ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

۴۔ ان بزرگوں نے تشبیہ و استعارہ سے بھی کام لیا ہی مگر اعتدال کیساتھ فارسیوں کی طرح صنعت در صنعت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاورہ کی رنگینی سے اس طرح چھپایا ہی کہ شعر سن کر اسکی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہی کہ تشبیہ و استعارہ کی طرف فوراً ذہن

منتقل نہیں ہوتا، اور یہی بات اُن کی شاعری کی جان ہے،

تشبیہ و استعارہ ایک فطری چیز ہے، ایک عامی بھی جوش و خروش میں غیظ و غضب کی حالت ہو یا رنج و غم کی جب کوئی بات کہتا ہے تو بے ساختہ اُس کے منھ سے تشبیہ و استعارہ کے قالب میں ڈھل کر بات نکلتی ہے اور وہ سننے والے کے دل پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو کہنے والے کے دل پر اُس وقت طاری ہے،

اگر شاعر اسی نکتہ کو پیش نظر رکھے گا، تو اس سے سلیقہ مندی ظاہر ہوگی، اور اگر وہ بے اعتدالی سے کام لیگا تو اس شعر کو سن کر بجائے اس کے کہ اُس کے جوش و خروش کا دل پر اثر ہو تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگی اپنی طرف متوجہ کرلے گی، اور اس طرح سے اس کا مقصود فوت ہو جائے گا،

اگر تم یہ کہنا چاہو کہ فلاں شخص بہادر ہے، اور اسی لفظ سے اسکو ادا کر دو تو ادائے مطلب کا یہ ایک معمولی طریقہ ہوگا، اور اگر اسی بات کو یوں کہو کہ وہ شیر کے مانند ہے، تو یہ تشبیہ ہوگی اور اس میں زور پیدا ہو جائے گا، اور یوں کہو کہ وہ شیر ہے تو زور اور بھی بڑھ جائیگا اور اگر اس شخص کا نام نہ لو اور یوں کہو کہ میں نے ایک شیر دیکھا، اور اس سے مراد اسی شخص کو لو تو یہ استعارہ ہے، اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے کہ شیر کا نام ہی نہ لیا جائے بلکہ اُس کے جو مخصوص اوصاف ہیں اُس شخص کی نسبت استعمال کئے جائیں مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی، تو یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ لطیف ہے،

تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اور استعارہ میں مستعار لہ و مستعار منہ میں کسی قسم کی مناسبت کا ہونا ضروری ہے، خواہ ایک صفت میں ہو یا چند اوصاف میں، خواہ ان ظاہر کیا

سے محسوس ہوتی ہو یا عقل سے اس کا ادراک ہوتا ہو، وہ ایک چیز ہی جس میں سلیقہ سے کام لینے کی حاجت ہی، اور اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ طبقۂ متوسطین کے شعرا نے عموماً اور اس کے دور اوّل نے خصوصاً بہت سلیقہ سے کام لیا ہے میں چند اشعار پیش کرتا ہوں، کچھ ضرور نہیں کہ اپنی طرف سے حواشی چڑھاؤں تم اپنے مذاق سلیم کی مدد سے اُن پر غور کرو اور دیکھو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ اُن میں ہے یا نہیں،

میرزا مظہر

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہی — قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو — مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

مرزا رفیع

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نگہت گل — پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

ساقی ہے یک تبسم گل فرصت بہار — ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سی بھر کہیں

میر تقی میر

صیاد دل ہی داغ جدائی سے رشک باغ — تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

فلک کو منہ نہیں اس فتنے کے اُٹھانیکا — ستم شہ یک ترانا زہے زمانے کا

خواجہ میر درد

مثل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا — ہم رو سیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

دل بھی اے درد قطرۂ خون تھا　　آنسوؤن مین کہین گرا ہوگا

قائم

مجھ سا جہان مین کوئی آشفتہ سر نہین　　ہے یون تو زلفِ یار مگر اس قدر نہین

دل ڈھونڈھا سینہ مین مرے بوا تجھی سے　　کہ ڈھیر ہے یان راکھ کا اور آگ دبی

یقین

نظر آتا نہین ثابت گریبان ایک غنچے کا　　چمن مین سیم کرتی ہی ملے باد صبا کوئی

یقین ہوا مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم　　نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہوئے

بیان

ہم سرگذشت کیا کہین اپنی کہ مثلِ خار　　پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کے

فرشتون کی عبادت کا مصدق ہی مراد من　　اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دے

(۵) اس دور سے پہلے شعرائے ریختہ، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہین اور قصیدے بھی برائے نام لکھے ہین، مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کو قصیدہ نہین کہہ سکتے، دو چار شعر مین کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدہ کے لوازم قرار پا گئے ہین، ان سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہین بن سکتا،

سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصائد دھوم دھام سے لکھے اور اُن کو اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پہ پہنچایا، خصوصاً مرزا رفیع سودا اس میدان مین فارسی شعرا سے بھی بعض باتون مین آگے بڑھ گئے ہین، ان کے کلام کا زور و شور انوری کے کلام سے نہین دبتا، اور نزاکتِ مضمون مین عرفی کو بھی شرماتے، مثنویان دکنی اور ان کے متبعین نے بھی لکھی ہین مگر عاشقانہ مثنویان جس شان کی میر تقی میر نے لکھی ہین ان کی نظیر اس دور سے پہلے نہین ملتی،

مرثیہ کے متعلق میرا یہ خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے، حیدرآباد اور بیجاپور کے شعرا اکثر مرثیہ گو تھے، اور اُن میں سے بعض ایسے خوش گو تھے جن کے مرثیے آگرہ اور دلی تک قدردانوں کے ہاتھ پہنچتے تھے، مگر اس زمانے میں چو مصرعے کہنے کا رواج تھا، سب سے پہلے اسی دور کے ملک الشعرا مرزا رفیع سودا نے اُسے مسدس کیا جس سے اس میں وسعت پیدا ہو گئی۔

واسوخت قدما کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا، سب سے پہلے اسی دور کے شاعر بے نظیر میر محمد تقی میر نے اس میں طبع آزمائی کی اور اس کوچہ میں جو کمال دکھایا، اُس کا طرۂ افتخار ہمیشہ ان ہی کے سر بندھے گا ہجو گوئی شاعری کے گلشن کا ایک خار دار پھل ہے، مگر جس طرح سے گل کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح شاعرانہ جوش و خروش کی تکمیل میں اس کو بہت کچھ دخل ہے، اسی وجہ سے عربی اور فارسی کی شاعری بھی اس سے نہیں بچ سکی، مگر ریختہ گو شعرا کے اول طبقہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا، اگر کہیں ایک دو شعر ہوں تو وہ شاعرانہ نوک جھونک سے زیادہ نہیں، اس دور کے شعرا میں مرزا رفیع اس کے بھی مرد میدان ہیں، گرمیِ کلام کے ساتھ شوخی اور ظرافت ان کے حصہ میں آئی ہے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی،

اُن کے ہمعصروں میں سے میر تقی میر، میر ضاحک، فدوی، ندرت اور بقا نے بھی اس کوچہ کی خاک اُڑائی ہے، ع

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

علاوہ ان چیزوں کے مخمس، مربع، مثلث اور مستزاد، غرض کہ جتنے اصنافِ سخن ہیں، سب میں ان لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اردو شاعری کو ہر طرح سے مکمل کر دیا ہے،

(۶) ایک بڑا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ تناسبِ لفظی، اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذومعنیین جو قدما کی شاعری کا مایہ ناز ہیں، اُن کے دور کرنے میں انھوں نے

ں، خصوصاً مرزا جانِ جاناں مظہر رحمۃ اللہ علیہ نے اس خارزار کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری
اپنے زورِ طبع اور خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمونوں اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش
کو اس طرح پر ترتیب دیا، اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی
کی بنیاد تھے اُسے سب بھول گئے، یقین، حزیں، بیان، حسرت اور بقیہ دردمند نے اُن
نے زانوئے تلمذ تہ کرکے اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کرکے اردو شاعری کو معراجِ کمال
۔ اردو شاعری کے مورخ کی سخت بے انصافی ہے کہ اس نے مرزا صاحب کے اس احسان کا
نہیں کیا بلکہ ان کے کمالِ شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے۔

لوی قدرت اللہ شوق طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں:-

ل کسی کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ در زبان اردوے معلیٰ شاہجہان آباد کہ الحال پسند خاطر
ام و خواص گردیدہ مروج ساخت زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف
ز طریقۂ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر مردے است فرشتہ صفت، الخ

خ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں:-

در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصۂ وجود نیامدہ بود و در دور ایہام گویان
اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔"

دور آگے چل کر لکھتے ہیں:-

فی الحقیقۃ نقاش اول زبان ریختہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است بعدہ تتبع بدیگران رسیدہ"

ایہام گوئی کو ترک کرکے شعر کو بلند مضامین اور لطیف خیالات کے قابل بنانا اس دور کے
رین کا کارنامہ ہے، جو بھولنے کے قابل نہیں،

(-) سلسلۂ بیان میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اصنافِ سخن میں ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دور

کے بزرگون نے بیان کیا ہے، وہ اُن ہی کا حصہ ہے، قصیدون مین پرشوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبین استعمال کین، غزلون مین بے تکلف زبان مین نرم نرم باتین، عاشق و معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت؛ و رجذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھون کی اس کی نظیر قدما کے کلام مین نہین مل سکتی، میر تقی، میر درد، یقین، بیان، حزین، ہدایت اور بیدار کی غزلین پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ دھر کر دیکھو:

یا جوش و خروش، کلام کی گرمی اور دل آویزی، دلچسپ اور دل پسند بحرون مین جن مین سے اب تک بہت سی اُردو مین نہین آئی تھین پھر سنگلاخ زمینون اور مشکل ردیف اور قافیون مین شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو مرزا رفیع سودا اور قائم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو، اس کا دھندلا سا عکس بھی قدما کے کلام پر نہین پڑتا، اگر روزمرہ اور محاورے مین بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا ہو تو میر تقی میر درد اور میر سوز کی غزلین پڑھو جس پر ہزارون طرح کی بناوٹین قربان ہوتی نظر آئین گی،

تصوف کا رنگ جو شعر کی جان ہے اور جس کے بغیر کلام روکھا پھیکا نظر آتا ہے، اس کو خواجہ میر درد سے پہلے سراج کے سوا کسی نے چھوا ہی نہین، اس کی آمیزش سے جو تڑپ اُن کے کلام مین پیدا ہو گئی ہے، اس کا اترا ہوا خاکہ بھی ان کے پیشروون مین نظر نہین آتا،

بسا ہے کون ترے دل مین گلبدن اے درد　　　کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

اس کے خیالِ زلف نے سب سے چھڑا دیا　　　گرچہ پھنسے ہین دام مین دل کو فراغ ہے

گذرا ہے صبا کون بتا آج ادھر سے　　　گلشن مین ترے پھولون کی یہ باس نہین ہے

قاصد ترا یہ کام نہین اپنی راہ لے　　　اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ایک ہی جست مین لی منزلِ مقصود اس نے　　　رہرو و! رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ

اے درد یان کسو سے نہ دل کو لگائیو　　　تک چلیو سب سے یون تو یہ جی مت پھنسائیو

(۱) سب سے نمایان کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ انھون نے زبان کی صحت اور صفائی مین ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور بہت سے ناگوار الفاظ درو ابط جن کو دور اول کے شعرا نے قدما سے ترکہ مین پایا تھا، انھون نے نکال ڈالے، اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہوگئی، تاہم انکھڑیان، جھگڑا، ٹکڑا، ٹک، نت، زور، آتیان، جاتیان، جاؤن ہون، کھینچون ہون، آپنے سے کہتا تھا، ایدھر، اودھر، تیسر، کبھی، اور اسی قسم کے اور الفاظ باقی رہ گئے،

سید انشا کے کلام مین کچھ ناگوار الفاظ اپنے ہمعصرون سے زیادہ ملتے ہین مثلاً اچھوتے، ہجلدے، مگر اُن کی سند نہین، وہ ہر جگہ دھینگا مشتی کرتے ہین، کہین آزادون کے لہجہ مین بولنے لگتے ہین، کہین زنڈیون کی زبان مین گفتگو کرتے ہین، کبھی پورب مین ہین، کبھی پچھان مین، ہر کسی جگہ ان کا رفیق زندگی یعنی تمسخر اُن سے جدا نہین ہوتا،

(۲) طرز بیان مین کوئی حسن و خوبی اس دور کے شعرا نے نہین پیدا کی، ان ہی پہلوؤن سے گلدستے تیار کئے، جو ان کے پیشرو جمع کرچکے تھے، صرف اتنا کیا کہ شوخی اور ظرافت کے ساتھ عاشقانہ شاعری مین حقیقت کے منھ سے نقاب کو ہٹا کر مجاز کو زیادہ نمایان کر دیا،

اس کی حقیقت یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری کی دو قسمین ہین، اول وہ جس مین عاشقانہ جذبات کی صحیح کیفیت حق شناس آنکھون مین خدا نمائی کا جلوہ دکھاتی ہے، اس کی حد ایک طرف تصوف یا معرفت یا عشق حقیقی سے ملتی ہے، دوسری طرف پاک محبت اور عشق مجازی سے ڈانڈا مل جاتا ہے،

پہلی صنف مین خواجہ میر درد اور دوسری مین میر تقی میر نے نمایان حصہ لیا، اور اس دور کے شعرا مین سے سودا، قائم، ہدایت، یقین اور بیان وغیرہ زیادہ نہین تو کچھ کچھ اسی راستہ پر چلے ہین،

اس دور کے شعرا مین سے میر اثر اور راسخ خواجہ میر درد کا تتبع کرتے ہین، میر حسن، مرزا رفیع وغیرہ کے راستہ پر چلتے ہین، اور مصحفی کا انداز کہین کہین میر سے ملتا ہے،

دوسری قسم وہ ہے جس مین پاک اور بے لوث عشق کی جگہ پر ہوس پرستی کے جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہو، اس کا افسوس ہے کہ اس دور مین جرأت، انشا اور رنگین نے ترقی دے کر اس ناپاک طریقہ کی بنیاد ڈال دی جس پر متاخرین نے بلند عمارتین کھڑی کر دین اور یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال دم بخود ہو کر رہ گئے، تھوڑی دیر سنجیدگی کو بالائے طاق کر ان کا بھی اندازہ دیکھ لو،

پہلے جرأت کی دلیری دیکھو۔

در تک اب چھوڑ دیا گھر سے نکل کر آنا — یاد ہ راتون کو سدا بھیس بدلکر آنا
کیا کیا وہ خفا مجھ سے ہوا گھر سے نکل کر — جب مین نے پکارا اُسے آواز بدل کے
چھینٹے غیرون سے جو کل آپ لٹے پانی کے — پڑ گئے سینکڑون بس ہم پہ گھڑے پانی کے
کل واقفِ راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات — جرأت کے یہان رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر — جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

سید صاحب کی گل افشانی کچھ اُن سے بھی بڑھ کر ہے،

اب تو اگلی سی طرح کا نہین گھرا پردا — رہ گیا آپ مین اور ہم مین اک گھرا پردا
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت — ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کے وقت
نہ لگی مجھ کو جو اُس شوخ طرحدار کی گیند — اُس نے محرم کو سنبھال اور رہی تیار کی گیند
جاڑے مین کیا مزا ہو وہ تو سمٹ رہے ہون — اور کھول کر رضائی ہم بھی لپٹ رہے ہون
جی چاہتا ہے اے دل اک رات ایسی آوے — مطلع ہو صاف ستھرا بادل بھی پھٹ رہے ہون
سوتے ہون چاندنی مین وہ منہ لپیٹے اور ہم — شبنم کا وہ دوپٹہ بیٹھے الٹ رہے ہون

(۳) ان لوگون کی طبیعت کی رنگینی نے اسی پر قناعت نہین کی بلکہ ریختہ سے ریختی کے شاخسانے کھڑے کر دیئے آزاد کا یہ کہنا صحیح نہین ہے کہ رنگین اور انشا اس کے موجد ہین کیونکہ قدما کے ہان بھی

کا سراغ ملتا ہے، مولانا ہاشمی بیجاپوری طبقۂ متقدمین کے دور اول کے مشہور شاعر ہیں جنھوں نے یوسف زلیخا ریختہ میں لکھی ہے اُن کے یہ دو شعر آصفی ملکاپوری نے اپنے تذکرہ میں لکھے ہیں،

رضا گر مجھکو دیتی ہے کروں گی گھر میں جا وارد　　اگر بچھ ہوے گی فرصت صبح پھر آؤں گی چھوڑو

اگر کوئی آ کے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا　　مجھے بدنام کیا کیتے کہیں میں جاؤں گی چھوڑو

مولانا ہاشمی کے بعد سید محمد قادری ایک باکمال شاعر گذرے ہیں جو غالباً ولی کے ہمعصر تھے ان کا تخلص قاکی تھا، اور ان کا مکمل دیوان ۱۱۵۳ کا لکھا ہوا مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں ایک دو ریختیاں بھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے سوا اور کسی کا کلام اس طرح کا نظر سے نہیں گذرا، اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خان رنگین اور ان کے دوست سید انشاء اللہ خان کے حصہ کا تھا جو انھیں حاصل ہوا انشاء اللہ خان ارشاد فرماتے ہیں،

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ　　ہندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ

چبھتی ہے یہ نگوڑی ململ کی اوڑھنی　　لا دے ذری ذرا مجھے ململ کی اوڑھنی

رنگین

میں وہ تو اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی　　باجی! مجھے منگا دے جھلاجھل کی اوڑھنی

ہئی ہمک کمر میں مری لوگو دوڑیو　　گھٹنے تلک تو سر سے مرے ڈھلکی اوڑھنی

گرمی کے مارے ناک میں آگئی ہے میری جان　　تہ کرکے رکھ پٹاری میں آنچل کی اوڑھنی

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کر لو　　یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہار و

(۴) اس عہد کا بہترین کارنامہ میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اور میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور

اس سے بھی بہتر اُن کی دوسری مثنوی سحرالبیان ہے، جس نے اتنی قبولیت حاصل کرلی تھی کہ آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہین ہوئی،

اس مثنوی مین روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیون کی نشست ترکیبون کی چستی اور مصرعون کی برجستگی کے علاوہ ربط کلام کی خوبی اور ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا گہرا تعلق ہے جیسا زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے اور مطالب ایسی صفائی سے ادا کئے ہین کہ اگر ان ہی کو نثر کر دیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ صاف اور مربوط نہ ہوگا.

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان کی بیان کی ہے وہ لفظاً و معنیً اس قدر عادت کے موافق ہے جیسی فی الواقع ہوا کرتی ہے:

وقت عاشق و معشوق اتفاقاً ایک دوسرے سے روشناس ہوتے ہین، پھر جب ان مین جدائی ہو جاتی ہے: پھر جب وہ ملتے ہین، غرض کہ جس جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ صفائی اور سادگی کے ساتھ اس قدر مؤثر اور دلگداز ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے،

مین نے اس مثنوی کی دو ایک داستان میرحسن کے ذکر مین انتخاب کی ہین اس لئے یہان اُن کا دہرانا ضرور نہین، انتخاب کے وقت مین نے بہت کوشش کی کہ ہر داستان مین سے بہت بہت سے اشعار نکال کر اس کو مختصر کردن، مگر ربطِ کلام کی خوبی نے مجھ کو کامیاب نہین ہونے دیا،

دور سوم | اس دور مین نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کا ذکر کیا گیا ہی،

(۱) ان لوگون کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے، جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے اُن کو انھون نے دور کرکے روزمرہ اور محاورون کے ساتھ فارسی زبان کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبون سے اُردو مین شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کردی جو دیکھنے کے قابل ہے،

نصیر کی شاعری کی ابتدا اور دور دوم کی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے اس واسطے ان کے کلام

میں آتیاں، جاتیاں، ٹک، نت اور بعض جگہ اسی طرح کی اکھڑی اکھڑی بندشیں ہیں جو مصحفی اور انشاء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، مگر اخیر اخیر میں ان کا کلام بھی صاف ہو گیا ہے،

اس گروہ میں ذوق و ظفر روزمرہ اور محاورہ بندی میں سب سے فائق ہیں. مومن اور غالب کے ہاں خیال آفرینی کے ساتھ فارسی ترکیبیں زیادہ داخل ہو گئی ہیں اور بول چال کا لطف ذوق و ظفر کے نسبت ان کے ہاں کم ہے تاہم اور لوگوں کے کلام میں کسو، کبھو، تئیں، آن کے، ہمت، مت، آئے ہے، جائے ہے، دیکھیو، کھینچیو، لیجیو، اور رے، پرے، پھینا، بھنا، سدا معنی ہمیشہ، اور معنی عجیب یا نہایت بہت بے تکلفی سے کام میں لائے گئے ہیں،

(۲) ولی سے لیکر مصحفی تک عموماً انداز بیان میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے، اس دور میں نصیر نے مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی اور بعید الفہم استعاروں سے کام لیکر اور مشکل و سنگلاخ زمینوں میں شعر کہکر اس کو تنگ و تاریک کر دیا ہے، اگرچہ ان کے ہاں بھی محاورہ جہاں آجاتا ہے شعر میں تڑپ پیدا کر دیتا ہے مگر بیشتر حصہ ان کے کلام کا بے لطف و بے رنگ ہے،

ذوق کے کلام میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین سے زیادہ ہے. مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں یکساں ہے لیکن اسمیں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے،

ممنون، مومن، غالب اور اُن کے متبعین تسکین و شیفتہ کے ہاں تازگی خیالات کے ساتھ فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے، خصوصاً مومن اور غالب نے جہاں بے اعتدالی سے کام لیا وہاں ان کا کلام رتبہ سے بہت گر گیا ہے، نمونہ کے طور پر چند اشعار اس دور کے شعرا کے پیش کرتا ہوں جس میں روزمرہ اور محاورہ بہت خوبصورتی سے کام میں لایا گیا ہے،

ذوق

کٹے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا
کہ جیسے مجھ سے ایسے تو تڑپے لہو میرا

سینہ و دل پہ مرے زخمِ جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گر ہنستے ہیں

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

تو جان ہی ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ظفر

سر تلک دستِ ستم جوں ہی ترا قاتل بڑھا
خونِ جسمِ ناتواں تل تل گھٹا، تل تل بڑھا

برسوں گذر گئے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

ہمارے ہی آگے ہے ذکر اگلے دوستداروں کا
پرانے مُردوں کی وہ ہڈیاں اکھاڑتے ہیں

جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن کو لگے
کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن کو لگے
نعل شکل پہ نو جیب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے

ممنونؔ

رات تھوڑی ہی حسرتیں دل میں بہت — صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی
بس جفا و آزمائی ہو چکی — دلبروں سے ہاتھا پائی ہو چکی

اس مرگ پہ ہو جان مری صدقے کہ دمِ نزع — گھبرا کے کہا تو نے کہ بس اب دیکھئے کیا ہو

نصیرؔ

نصیر اس کج ادا کی کج ادائی کو نہ جاتی ہے — مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

مژگاں سے وقت نالہ آنسو کو ترستے ہیں — یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

مومنؔ

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا — تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

تسلی ہم دلا بس ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالبؔ

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شیفتہ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے
کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

(۳) بعض مضامین ایسے دلچسپ و دلکش ہوتے ہیں کہ انکو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے، مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان انکو نہیں ادا کر سکتی، اور معمولی اسلوب اُن میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ایسے موقعوں پر تشبیہ اور استعارہ یا کنایہ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو شعر نہیں رہتا، معمولی بات چیت ہو جاتی ہے،

اس میں شاعر کی سلیقہ مندی کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس کو صفت در صفت یا استعارہ در استعارہ کر کے بعید الفہم نہ کر دے، دوسرے یہ کہ جس چیز کے ساتھ تشبیہ دیجائے یا استعارہ کیا جائے وہ اس خاص صفت میں جس میں تشبیہ یا استعارہ مقصود ہے کمال رکھتا ہو تاکہ اُس کے ذکر کرتے ہی سننے والے کی طبیعت میں جوش اور اثر پیدا ہو، تیسرے یہ کہ ان دونوں میں مناسبت پوری پوری پائی جائے،

نصیر دہلوی کا شعر ہے جو اس دور کے استاذ الاساتذہ ہیں،

چڑائی چادرِ مہتاب جب میکش نے چیچوں پر
کٹہرہ صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

اس میں چاندنی کے لطف اٹھانے کو چاد، مہتاب کے چرانے سے استعارہ کیا ہے، مگر بعید الفہم ہونے کی وجہ سے شعر میں کوئی لطف نہیں نہ اس کے پڑھنے یا سننے سے دل میں کوئی اثر پیدا ہوتا ہے نصیر مرحوم کے کلام میں اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، بلکہ بعض مقاموں پر ان کے استعارہ یا تمثیل پر پہیلی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ البتہ ذوق نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کئے ہیں اور اُن سے بہت زیادہ حکیم مومن خاں اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی ہے، اور بعض مقاموں پر جدت سے بھی کام لیا ہے،

میں اس دور کے شعرا کے دو دو چار چار شعر نقل کرتا ہوں جن سے ناظرین کتاب خود اس کا اندازہ کرسکیں گے کہ اس خاص انداز میں ان لوگوں نے کیا کیا کام کئے ہیں اور باوجود اس کے شعر کی لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا،

مرزا غالب

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے ۔۔۔ خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ۔۔۔ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام ۔۔۔ مہر گردوں ہے چراغ اک رہگذار باد میں

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۔۔۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں — جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر — بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مومن خاں

جوں شاخِ گل اے جوشِ جنوں زار ہوں یعنی — جب چاک ہوا جامہ تو بس ٹوٹ گئے ہاتھ

میرا عتق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم — باور نہیں تجھے تو ذرا منھ کو موڑ دیکھ

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

کیوں ہو رنگِ زرد پر گلگونہ اشکِ سرخ کا — کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی

ان کو گمان ہے گلۂ چینِ زلف کا — خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

ذوق

مجھ میں اُنھیں ربط ہے گویا بہ رنگِ بوئے گل — وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

سب کو دیکھا اس نے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ — وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب — اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

فلک کیا فتنہ سازی میں ہے ہمسر چشم قاتل سے — گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اسکی مژگاں سے

نگہ کیا اور غمزہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے — اسے تیر قضا اس کو بہ تیر قضا سمجھے

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو — آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے — فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے

(۴) میر و مرزا سے لیکر مصحفی تک جتنے شعرا گذرے ہیں ان کا ایک محدود دائرہ ہے، جس سے وہ بہت کم نکلتے ہیں، اُن کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو مضمون پہلے کسی طور پر بندھ چکا ہے، اسے ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے، برخلاف ان کے اس دور کے شعرا میں سے مومن و غالب اور ان کے متبعین نے معمولی مضمونوں کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے، جو سب سے نرالا ہے،

علاوہ اس کے ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد ایک دوسرے ہی نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں،

جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے، اور اس کے بار بار پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی،

ان دونوں کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور بھی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا کہ چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہوجاتا ہے، یہ وہ موقع ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہوسکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی ہوجاتی ہے. جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہوجاتا ہے،

مومن خاں کے بعض اشعار کی پیچیدگی اکثر اسی پر مبنی ہوتی ہے، مثلاً

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے　　　صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہنا یہ ہے کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، اسلئے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں، مگر جب تک یہ جملہ کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، بڑھایا نہ جائے عام ذہن معنی مقصود کی طرف منتقل نہیں ہوتا، مگر شاعر نے اس کے ذکر نہ کرنے میں لطافت رکھی ہے کہ اس نے گویا قصداً ذکر نہیں کیا، اسلئے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اسکے جتانے کی کچھ ضرورت نہیں،

اب میں ان لوگوں کے چند اشعار ایسے نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہوسکے گا کہ انھوں نے طرز ادا میں کیسے کیسے اسلوب پیدا کئے ہیں، اور ان میں کیا کیا جدتیں کی ہیں،

مرزا غالب

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　　آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام سبو میخانہ خالی ہی

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

حکیم مومن خاں

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

تو فلک میں کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں — ایک دشمن سر سے کھویا دوسرا پیدا ہوا

اے دل نہ شعر کہیو شبِ ہجراں بغم نہیں — یہ نام ہو جہاں میں تیری بلا عبث

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی　　ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

ذوق

ہاں تامل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں　　ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے　　کہ تا ہوجائے لذت آشنا تلخیِ دوراں سے

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سن سن اپنے　　کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناحق اپنے

طبقہ متاخرین

اس طبقہ کو میں نے تین دور پر تقسیم کیا ہے، دورِ اول ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا، دوسرا دور امیر و داغ اور ان کے معاصرین کا، تیسرا دور حالی و اکبر کا جنھوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہو

دورِ اول | (۱) دورِ اول کے شعرا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان میں تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ کو نکال دیا، جو اُن کے مذاقِ سلیم میں گراں اور ثقیل معلوم ہوتے تھے، مثلاً آئے ہے، جائے ہے، کہے ہے، کھوے ہے، دوں ہوں، لوں ہوں، ٹک، بت، کیتو، کستو، تئیں، آن کے، ہمیت، مت، زور بمعنی بہت یا عجیب یا جمع مونث کے صیغوں کو الف نون کے ساتھ آئیاں، جائیاں، اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بولنا جیسے بھاریاں،

مگر ناسخ کے کلام میں کہیں کہیں زور کا لفظ بمعنی "بہت" "یا عجیب" پایا جاتا ہے اور آتش کے ہاں بعض بعض موقعوں پر رتیاں، سونیاں، اکھڑیاں، زور، بل بے بن

بجاے بغیر، میرے شامل بجاے میرے ساتھ، پیار سے بجاے پھیلائے، شراکت بجاے شرکت، فی الواقعی بجاے فی الواقع، ایک آدھ جگہ موصوف کی متابعت سے صفت کو جمع بھی کر دیا ہے، مثلاً ع

بیڑیاں منت کی بھی نہیں تو ہیں نئے بھاریاں

اسی قسم کے اور بھی الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں سے بعضے پرانے روزمرہ کے جرم میں نکالے جا چکے ہیں اور بعضے غلط ہیں، کچھ عجیب نہیں کہ یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو؛

(۲) افسوس ہے کہ ان لوگوں نے زبان کو صاف کرنے پر بھی غزل میں سادگی کا خیال نہیں رکھا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تھی منطق، حکمت، طب، اور علم کلام کی گرم بازاری میں عربی الفاظ زبانوں پر کثرت سے چڑھ گئے تھے،

ادھر اس بات کا حوصلہ تھا کہ قدماء سے بڑھ کر کام کیا جائے تاکہ اپنا انداز ان سے نرالا ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایسی صنف لطیف میں عربی الفاظ رفتہ رفتہ کثرت سے داخل ہو اور بجائے اس کے کہ پہلے سے زبان میں زیادہ شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوتی زیادہ ثقیل ہو گئی اور سیدھی سادی زبان بازاریوں کی زبان قرار پا گئی، ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے اصناف سخن میں سے صرف غزل کو پسند کیا، اگر یہ لوگ قصیدے بھی لکھتے ہوتے تو ان کا حوصلہ بہت کچھ اس میں نکل جاتا، اور وہ ایسے ثقیل الفاظ کے متحمل ہو جاتے اگر تم جرأت اور ناسخ کے دیوان کو ملا کر دیکھو تو اس کا کافی ثبوت ملے گا کہ ان دونوں کی غزل میں کتنا فرق ہے، چونکہ شیخ امام بخش ناسخ اس دور کے بہترین شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں، اس لئے میں انھی کے کلام کو مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں؛

تن پروروں کی تیغِ زباں سے نہ تھی پناہ — گو دشمنہ تھا دانہ نقوشِ حصیر کا

یاد کرلے ناسخ خوارج دشمن نہ ہو خواہ — کیسے موسیٰ کا علیؑ شیرِ خدا بازو ہوا

زیست بھر سوجھا نہ مجھکو چارۂ سوزشِ عشق — بارے کافورِ حنوط اب داغ کو مرہم ہوا

بےخطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پہ — دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پہ

دیکھیو ناسخ سرِ شیخِ معمم کی طرف — کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

قمر ہی کیا ترے آگے محاق میں آیا — کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا

مل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے — ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

سوے کعبہ تیرے عاشق سجدہ کرتے ہیں کوئی — تیری ابرو کی طرف قبلہ محوّل ہو گیا

بڑا اکال ہے ناسخ غمِ عالم فراہم کر — ارادہ ہے اگر اے چرخ اس کی میہمانی کا

غیر کو نزدیکی حریمِ یار میں مباح نہیں — بیشۂ شیرِ خدا بن کہیں سگ پان نہیں

ظلم طول شب فرقت کے رہا دل سے گیا | داد رس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

کان خرابات میں مطلق متواضع | ثابت مژہ نرگس میگوں کے ہے خم سے

۳- بدنصیبی سے اُس زمانہ میں شاعری کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں مخصوص صنعت مراعات النظیر پر آکر ٹھہر گیا تھا، اور بعضوں نے اس رعایت لفظی کا پردہ اتنا باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کے جھونکے سے ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئے، اور شاعری اچھا خاصہ سوانگ بن گئی،

اس میں ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ اگر نازک خیالی کی بنا کسی لفظی تناسب پر ہوگی اور اسی لفظ کے تمام اوصاف و لوازم پر عمارت کھڑی کی جائیگی، وہ عمارت یقیناً ناپائدار ہوگی، اور اگر اس شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کر دیا جائے تو ساری نکتہ آفرینیاں بیکار ہو جائیں گی،

افسوس ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ اس میں بھی سب سے آگے ہیں اور ان کے بعض شاگردوں نے اس میں اپنی تمام قوت صرف کی ہے،

شیخ صاحب فرماتے ہیں،

مشرق خورشید تیرے نور سے تھا ورنہ میں | کون ہے بارہ دری میں آج جو شش در نہیں
جس جگہ چلتا ہے بچھتی پٹیوں تیرا فرش | ذرے کیا ہیں واں برابر خاک ہے شکر نہیں
وہ بت شیریں ادا کرتا ہے مجھ کو سنگسار | یہ شکر پارے برستے ہیں جنوں پتھر نہیں

کیا ہی اے طفل پری تاب کمر کو ہے شرم | تیری ٹکڑی کے کبوتر بھی کمر کرتے ہیں

بس نہ ترسا بہت اے کافر ترسا مجھ کو — لبِ جاں بخش دکھا بہرِ مسیحا مجھ کو

چنپا کلی کے پھول نہ گل کی کلی میں بو — جیسی ترے گلے کی ہے چنپا کلی میں بو

خواجہ وزیر شاگرد ناسخ

سوکھ کر کانٹا ہوا دستِ جنوں — خار دار اب ہاتھ کی پچھلی ہوئی
بے ہوا اڑنے لگا مشتِ غبار — طبع اپنی خاک کی بادی ہوئی

دیکھ چھپ جائیگا او بت مرے ترسانے سے — اٹھ کے کعبہ کو چلا جاؤنگا بتخانے سے

زلف کی چال صبا چلتی ہے — کیا پریشان ہوا چلتی ہے

کھا گیا مجھ ناتواں کو غم مرے خوش چشم کا — ہو کے کاہیدہ اسی آہو کا چارہ ہو گیا

الفتِ چاہِ زنخداں میں وہ لاغر ہوں وزیر — روزنِ مور مری نظروں میں اندارے ہیں

بھر دے عوض شراب کے ساغر کو بھنگ سے — گاڑھی چھنی ہے ساقی اب اک سبز رنگ سے

میر وزیر علی صبا شاگرد آتش

کولھو میں گردشِ نگہ یار سے پسا — تل تیل ہو کے بہ گیا چشمِ غزال کا

کھائیں گے زہر اُن کے خط سبز فام پر ۔ سر سبز ہوں گے خضر علیہ السلام پر

بک گئے ہیں آپ تو غیروں کے ہاتھ ۔ بندہ پرور اب غلام آزاد ہو

مرزا دبیر

شامی کباب تھے یہ ہوئی جب شرر فشاں ۔ اہل تتار بن کے ہرن رن سے تھے رواں

مصری نہ بات کرسکے سب بولے الاماں ۔ بت بن گئے گیرہ گئے پتھر میں پتلیاں

زردار زرد ہو کے گل اشرفی بنے ۔ نصرانی خاک ہو کے گل ارمنی بنے

امانت کی شاعری کا دار و مدار اسی ضلع جگت پر ہے، مشکل سے کوئی صاف شعر انکے یہاں مل سکتا ہے، خصوصاً و اسوخت کی شہرت کی بنیاد اسی پر ہے، جس کی ہمارے بچپن میں بڑی دھوم تھی، نمونہ کے طور پر صرف ایک بند اس کا بھی سن لو،

میٹھی باتوں سے اسے چھالیا سب نے ایسا ۔ حال دہرایا کوئی میں نے تو منہ پھیر لیا
جی میں کتّا رہا کچھ صاف زباں سے نہ کہا ۔ بات کی ایسی چبا کر کہ ہوا دل چورا
عطر کی بو سے معطر ہوئے گھر گلیوں کے
خاصدان آنے لگے عطر لگی ڈلیوں کے

یہ داستان بہت دراز ہے ان لوگوں میں سے جس کا دیوان جی چاہے اٹھا کر دیکھو بغیر کاوش کے بہت سے اشعار اسی قسم کے مل رہیں گے، میں دو چار شعر اور نقل کر کے اس قصہ کو ختم کرتا ہوں،

رشک

مرغ دل کو تو نہ لگی بلی اگر دروازے کے ۔۔۔ حسرت تن کو کتر یگا چوہا تمھاری ناک کا

مہندی نے شعلہ پاؤں تمھارا بنا دیا ۔۔۔ کیا گرم ہے کہ بونٹ کو ہولا بنا دیا

عید بھی وصل سے گئی خالی ۔۔۔ کچھ گلے لگنے کا لگاؤ نہیں

ع بیروں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں

ع بھیڑیئے ملتے ہیں آنکھیں تری کرگابی پر

(۴) تشبیہ یا استعارہ بجائے خود نہایت عمدہ چیز ہے، جس وقت گفتگو کا معمولی انداز جوش پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اسی کے ذریعہ سے کلام میں زور اور قوت پیدا کی جاتی ہے علاوہ اس کے یہ چیزیں کلام کو خوبصورت بھی کر دیتی ہیں، جیسا کہ زیور سے حسینوں کے جمال میں آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے، مگر یہ تو انداز یہ رنگ اگر اس حد تک رہے جیسا چہرہ پر غازہ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید ہے، اور اگر حد اعتدال سے گذر جائے تو اسکی شدت سے زبان خیالی باتوں سے فقط توجہات کا سوانگ بنجاتی ہے،

ایک بات اور بھی ہے کہ تشبیہیں اور استعارے قریب لماخذ ہوں یعنی پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں لطافت و نزاکت پیدا ہو جائے گی، اور اگر دور پڑ جائیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت پیدا ہو جائے گی، اسی طرح اگر اس خاص صفت یا ان مخصوص اوصاف میں جن میں کسی چیز کو کسی سے تشبیہ دی گئی ہے یا استعارہ کیا گیا ہے، پوری پوری مناسبت نہ ہوگی، تو کلام بدرنگ اور بے مزہ ہو جائیگا۔

افسوس ہے کہ متاخرین نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں وہ حد اعتدال سے گذر گئے ہیں اور ان باتوں کا لحاظ بہت کم رکھا ہے، صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کرکے کلام کو اتنے پیچ پیچ میں ڈالدیا ہے کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے کھولتے مطلب غائب ہوجاتا ہے اور اکثر وہ کندن دکاہ برآوردن کی مثل اس پر ٹھیک اترتی ہے میں پہلے صاف تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے پیش کرتا ہوں اسکے بعد انکی پیچیدہ تشبیہوں اور استعاروں کی گرہیں کھولنے کی کوشش کرونگا،

خواجہ حیدر علی آتش

صبح بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حسن کی شبرنگ مردمک نہیں بھونرا کنول میں ہے

غنچے شگفتہ ہوتے ہیں آئی ہے فصل گل کپڑوں کے پھاڑنے کی بہار آجکل میں ہے

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل، سو زر بکف قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا
ترچھی نگہ سے طائر دل ہو چکا شکار جب تیر کج پڑیگا اڑیگا نشانہ کیا

ے کلرنگ ہے چھلکی جو سرخی پان کی اسمیں گلوے یار پر عالم ہوا شیشہ کی گردن کا

صیاد حسن کھیلتا ہے جب شکار عشق بلبل کو پھانستا ہے رگ گل کے دام سے

اے مرغ دل ہے فاصلہ اس زلف و خال میں　　　دانہ ترے نصیب کا باہر ہے دام سے

فصلِ بہار آئی مبارک ہو اے جنوں　　　خار اور آبلہ سے ملاقات راہ کی،

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　　ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

خواجہ آتش کے دیوان میں اس طرح کی صاف تشبیہیں، استعارے اور حسن تعلیل کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں، مگر ان کے حریف شیخ امام بخش ناسخ جو اپنی دقت پسندی کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں، سیدھی بات بہت کم کہتے ہیں، کہتے بھی ہیں تو بے مزہ بات کہتے ہیں مثلاً

ابھی ہر چند وہ بت نوجواں ہے　　　سفید اُس کا مگر موے میاں ہے

حسب معمول کمر کو بال سے تشبیہ دی، پھر بال کے اوصاف اس کے لئے ثابت کرکے بدن کے لحاظ سے کمر کو سفید قرار دیا، پھر کمر کا بال سے استعارہ کرکے اسکی سفیدی پر اظہار تعجب کر دیا، ان نکتہ آفرینیوں کے بعد مطلب یہ نکلا کہ بال بڑھاپے میں سفید ہوا کرتے ہیں مگر تعجب ہے کہ معشوق کا بال جوانی میں سفید ہو گیا ہے،

اس بدمزہ مضمون کو دیوان میں بیسیوں جگہ متعدد طریقے سے ادا کیا ہے، مثلاً ایک جگہ یوں فرماتے ہیں،

آرایشِ جمال خدا داد عیب ہے　　　موے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا

ایک جگہ چاند کو کہ سات سیاروں میں سے ایک وہ بھی ہے، خانہ نشین بنا کر اس کو ثابت فرض کیا، پھر گھر سے نکال کر اس کے سیارہ ہونے پر اظہار تعجب کرتے ہیں،

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا　　　اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا

معشوق کی آنکھ کو بہ لحاظ وحشت چشم غزال سے تشبیہ دیجاتی ہے، انھوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ پہلے تو آنکھ کا استعارہ غزالِ چشم سے کیا، چونکہ وہ جانور ہے، اسلئے اسکے واسطے چارے کی بھی فکر کرنی پڑی،

چشم بد دور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف — سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارہ ہوا!

اسی مضمون کو خواجہ آتش نے بھی باندھا ہے، مگر طرزِ ادا نے انکے شعر کو کسی قدر مزیدار کر دیا،

خط پر جو آئینہ میں پڑے ہیں نگاہِ یار — آہوے چشم مست ہیں سبزہ چرے ہوئے

رنگ اڑنے کو طیر اور رنگِ حنا کو طائر سے تشبیہ دینا ایک معمولی بات ہے، شیخ صاحب نے اس سے یہ بات نکالی ہے کہ طائر بھی تو جانور ہے، ذبح ہوتے وقت تڑپنا لوٹنا اس کا خاص وصف ہے، یہ وصف انھوں نے طائرِ رنگ کے لیے بھی ثابت کر چھوڑا،

اس ادا سے باڑھ دیکھی آپ نے تلوار کی — طائرِ رنگِ حنا بھی طائرِ بسمل ہوا

اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے، تاہم ع

انصاف شیوہ ایست کہ بالاے طاعت ست

جہاں کہیں دقت آفرینی سے کام نہیں لیتے تشبیہ و تمثیل میں اچھے اچھے شعر بھی نکالتے ہیں، مثلاً

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک — اڑتا پھرا شجر سے جو برگِ خزاں گرا

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کے سر بلند — آسماں پیشِ زمیں بہرِ تواضع خم ہوا

طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہے عجب — ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

کیا روزِ بد میں ساتھ رہے کوئی ہمنشیں پتّے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

مشک میں بو ہے تو پیچ و تاب مثلِ مو نہیں پیچ ہے سنبل میں مثلِ مو مگر خوشبو نہیں

عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں نشّہ ہے جامِ مئے انگور میں لیکن بو نہیں

مستی آلودہ لب پہ رنگ پان ہے تماشا ہے کہ آتش دھوئیں سے

۵۔ سب سے بڑی بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ شاعری کے اس فطرتی جذبہ کو جس کا تہذیب و تمدّن سے اس قدر مضبوط تعلق ہے کہ جس قوم میں فکر کی روشنیاں اور باریک بیں شاعر نہ ہوں تو وہ متمدّن نہیں کہی جا سکتی، اسکو ضلع جگت کے ساتھ فحش اور گندے مضامین سے اس دور کے شعرا پاک نہیں رکھ سکے، عشق کو فسق اور آوارگی کا مترادف بنا دیا، گویا ہماری اخلاقی حالت پستی کی انتہائی حد تک پہونچ گئی، نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی قوت باقی نہ رہی، ملک و قوم کا مذاق سر سے بگڑ گیا، اور قبولِ عام حاصل کرنے کو جامۂ عریانی اختیار کر کے بے پردہ مضامین، سوقیانہ محاورے اور مبتذل الفاظ سے کلام کو ناپاک کر دیا اور ایسا چوٹیں پھبتیں کسے گئے،

متوسطین میں جرأت، انشا اور رنگین نے جس کام کی ابتدا کی تھی اور مکمل کرنے نہ کر سکے تھے اُس کو طبقۂ متاخرین کے شعرا نے پورا کر دکھایا، زمانہ بھی انکو بدقسمتی سے ناہموار ملا، غازی الدین حیدر نواب وزیر سے بادشاہوں کو باپ کی جمع کی ہوئی دولت ملی، اس نے جن مشاغل کی بنیاد ڈالی، اس پر نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ نے شاندار عمارتیں کھڑی کر دیں اور

ایسا رنگ اچھلا کہ ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی بیرات ہوگئی،

شیخ امام بخش ناسخ کی گل افشانی ملاحظہ ہو۔

دانے ہیں انگیا کی چڑیا کو بنت کی چنیاں ‏ ‏ ‏ بلتی ہیں بنے کی مچھلی موتیوں کی آب میں

دکھاتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک صفحے سے ‏ ‏ ‏ تری جانی کی زری میں ہے عالم کا مدانی کا

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا ‏ ‏ ‏ آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجکو

اڑ نہیں سکتی تری انگیا کی چڑیا اے پری ‏ ‏ ‏ جالی کی زری کا اس پر لے پر پرو جال ہے

تصور میں ہے اک انگیا کی چڑیا ‏ ‏ ‏ یہ دل کنجشک کا اب آشیاں ہے

رات کو چوری چھپے پہونچا جو میں ‏ ‏ ‏ غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے

یہ ابتجا ہے پیر مغاں کی جناب میں ‏ ‏ ‏ رکھوں میں ساق ساقی گلفام دوش پر

نواب سید محمد خاں رند

یہ دن تو جاپایا کئے سر سال میں ہیں لیکن ‏ ‏ ‏ اب کی نوچندی میں اک چاند سا کھڑا دکھیا

کھولنے شوق ست بند انگیا کے ‏ ‏ ‏ بٹ گرا سا ہاتھ نہ شرمانا آپ کا

کیونکر نبھے گی ہم سے ملاقات آپ کی ۔۔۔ وہ شان کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی

یاں ہم پہ یہ ادا ہے اثر غم و حسرت وصال ۔۔۔ کٹتی ہے عیش باغ میں اوقات آپ کی

آسمان پہ ہوا نے کھنکی اگائے ہے گی ۔۔۔ صاحب بھر جلی ہے بہت گات آپ کی

مرزا محمد رضا برق

وہ وقت آ رہی زلف جھکی اور اس پہ بکھری گوشہ لگی ۔۔۔ ابر سے نکلا چاند کا ٹکڑا برق کے دل کو چوٹ لگی

خیر گذری کہ چلے آئے کہا ان لیا ۔۔۔ ورنہ ہم دیکھتے اس وقت کہ کیا ہوتا

عشق اگر منظور ہے اس سیم تن سے آپ کو ۔۔۔ پہلے رکھ لیجئے منگا کر برق توڑے زر کے پاس

حکیم مسیحا

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی ۔۔۔ آج ہم عنقا کو لائے دام میں

تیرے سینے پہ نظر آتا ہے عالم نور کا ۔۔۔ اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا

امداد علی بحر

دوپٹے کو آگے سے دہرا نہ اوڑھو ۔۔۔ نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

۴۔ اس دور کی نسبت جو کچھ اب تک کہا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اس دور کے شعرائے اردو کی کسی حیثیت سے بھی کوئی مفید خدمت نہیں کی، میں نے خود نمبر ۱ میں اصلاحِ زبان کے متعلق انکی مساعیِ جمیلہ کا جو ذکر کیا ہے وہ انکے افتخار کیلئے کچھ کم نہیں ہے،

علاوہ اس کے اس دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کر کے زبان میں زیادہ صفائی، لوچ اور وسعت و صفائی پیدا کر دی یعنی مرزا دبیر اور میر انیس کا ذکر ہم نے ضمیمہ نمبر ۲ میں کیا ہے۔ اس لئے کہ ان کی شاعری کی جولانگاہ ایک دوسرا میدان ہے، مگر حقیقت میں وہ اسی دور کے شاعر ہیں۔

ان دونوں نے مرثیہ گوئی کی صنف میں ایسی ترقی کی ہے کہ جس کے آگے قدم بڑھانا نظر بحالات موجودہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے اور مبالغہ کی تو حد کر دی ہے، مگر باوجود اس کے زبان میں وہ لوچ اور وسعت پیدا کی ہے جو انھی کا حصہ ہے۔ ایک ایک مضمون کو [illegible] جگہ سے ادا کیا ہے۔ [illegible] خیال کا [illegible] باندھا ہے [illegible] صبح کا عالم، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام غریباں، رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں، کبھی اندھیری راتوں کی ظلمت، ان کو گرمی کی دھوپ، لوؤں کی لپیٹ، آفتاب کی آتش فشانی، غرضکہ قوتِ تخیل سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی شاعری سے اردو زبان کو گلہائے رنگا رنگ [illegible] مالا مال کر دیا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان ہمیشہ ان کی منت پذیر رہے گی۔

نواب مرزا شوق خواجہ آتش کے شاگرد اور اسی دور کے شاعر ہیں۔ انھوں نے زہرِ عشق، بہارِ عشق وغیرہ چند مثنویاں ان صفائی اور سادگی سے لکھی ہیں جو اخلاقی حیثیت سے کتنی ہی قابل ترک ہوں، مگر زبان اور بیان کے لحاظ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

مرزا نسیم دہلوی کو بھی میں نے اسی دور کے شعرا میں شمار کیا ہے، اس واسطے کہ جو زبان اس دور کے شعرا کی ہے وہی ان کی بھی ہے۔ انھوں نے اپنے استاد حکیم مومن خاں کی دقت پسندی کو دور کر کے

انکی نادر ترکیبوں کی میناکاری کو اس قدر صاف اور روشن کردیا ہی، جو قابلِ تحسین ہے،

دورِ دوم

اس دور میں جن شعرار کا ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے بیشتر شعرلے دو دہاؤں کے منت پذیر ہیں، زبان اور بیان دونوں چیزوں کو انھی سے سیکھا ہے اور انھی کے کلام کا تتبع کیا ہے اس وجہ ان کا انداز وہی ہے جو اُن بزرگوں کا تھا،

تاہم انھوں نے اپنے اساتذہ کی زبان میں زیادہ صفائی اور سادگی پیدا کردی ہے اور جو قوانین ان لوگوں نے وضع کئے تھے ان پر عملدرآمد پورے طور پر ان کے زمانہ میں نہیں ہوا تھا انکو انھوں نے اچھی طرح سے نباہا، جس کثرت سے ثقیل لفظوں اور فارسی ترکیبوں پر ان لوگوں نے شاعری کی بنیاد رکھ دی تھی، یا تشبیہوں اور استعاروں میں جو پیچیدگیاں ڈال دی تھیں ان سے بہت کچھ انھوں نے اپنا دامن بچایا ہے،

اس دور میں بھی خصوصیت کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کو اول درجہ پر رکھنا چاہئے جنھوں نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت، صفائی اور بانکپن پیدا کردیا ہے، انکے ہمعصروں میں کوئی بھی زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاوروں کی فراوانی میں اُن کا مثل نہیں،

دوسرے درجہ پر حکیم ضامن علی جلال کا درجہ ہے، جن کی زبان اور طرز ادا کو لکھنؤ کی روزمرہ اور طریقۂ بیان کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے،

۲- جیساکہ ہر زمانہ میں ہوا کرتا ہی، اس دور کے شعرا میں بھی ہر ایک کا رنگ اور انداز علیحدہ ہی، شکوہِ الفاظ، مضمون آفرینی اور ہر رنگ کے شعر کہنے میں منشی امیر احمد امیر کو خاص قسم کی قدرت حاصل ہی، روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ طرز ادا کی شوخی اور بانکپن داغ کا حصہ ہے، طرز ادا میں ایک قسم کا لوچ جو اہل زبان کے ساتھ مخصوص ہوا کرتا ہے جلال کے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے، الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دلآویزی میں تسلیم سب سے بڑھے ہوئے ہیں

اور تشبیہوں اور استعاروں کی برجستگی میں محسن کا کوئی ہم پلہ نہیں، اصنافِ سخن کے لحاظ سے مثنوی کے سوا ہر صنف میں امیر کو قدرت حاصل ہے، مثنوی میں تسلیم کو جو مرتبہ حاصل ہے اس میں ان کے ہمعصروں میں سے کوئی بھی ان کا شریک و سہیم نہیں۔ قصیدے میں یہ دونوں بھی کچھ کم نہیں، مگر محسن نے جس زور و شور کے قصیدے لکھے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ غزل میں داغ کو اور ان کے بعد جلال کو ان سب پر مزیت ہے۔

بات یہ ہے کہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، مگر شروع ہی سے شعرا نے اس کو جذباتِ انسانی کے ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے، خواہ ان کا منشا خوشی ہو یا غم یا حسرت یا ندامت یا دنیا کی بے ثباتی یا موت کا خیال اور کسی قسم کا جذبہ، یہاں تک کہ اخلاق و مواعظ کو بھی اسی میں داخل کر دیا ہے۔ اسی لحاظ سے جب تک غزل کو جذباتِ انسانی کے ظاہر کرنے کا آلہ بنائے رکھو گے، غزل غزل رہے گی، ورنہ نری لفاظی ہو گی۔

(۳) خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعراء کا کلام بہ حیثیت مجموعی کسی طرح کی تازگی نہ پائے گا، وہی گل و بلبل کی داستان، شمع و پروانہ کا قصہ، لیلیٰ و مجنوں کی کہانی، جفائے یار، رشکِ اغیار، شوقِ وصل، رنج و فراق، زلفِ پریشان، چشمِ فتاں، نرگسِ بیمار، سیبِ زنخداں، رندی و بادہ خواری، اور زاہدوں پر طعن و تعریض کے مضامین کو الفاظ کی الٹ پھیر اور ردیف قافیہ کے ردل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کر لی ہیں۔

چاہو تو اسی کو ان کی شاعری کا کمال سمجھو کہ ان کے اساتذہ نے جن مضمونوں کو اپنے خاص انداز سے باندھا ہے، انھوں نے اس میں فی الجملہ صفائی اور سادگی پیدا کر کے شکل بدل دی ہے، یا یوں سمجھو کہ سانچہ بدل دیا ہے، پہلے جو چیز ایک شکل پر ڈھلی تھی وہ اب دوسری شکل پر ڈھل گئی ہے جس میں بہ نسبت شعرائے دورِ اول کے کلام کے کسی قدر صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ متاخرین کے کلام میں کسی قسم کا ولولہ اور جوش بہت کم پایا جاتا ہے، اگر یہ لوگ اپنے کلام کو خود اپنے خیالات اور جذبات کا آرگن بناتے تو اس کا بہت عمدہ نتیجہ پڑتا، اور ان کو اپنے اساتذہ کی پیروی کرنے پر قناعت نہ کرنی پڑتی، اور آسیر کا یہ شعر ان کے حسبِ حال نہ ہوتا،

شاعرانِ حال کیا مضمونِ نو پائیں اسیر
ڈھونڈھتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

حصۂ اوّل

طبقۂ متقدمین

اس طبقہ کے شعرا کو تین دور پر تقسیم کرنا چاہیئے، پہلا دور قطب شاہ اور مولنا نصرتی وغیرہ کا جن کا نشو ونما حیدرآباد اور بیجاپور میں ہوا ہے ان کی زبان عالم طفولیت میں ہے دکنی زبان کے الفاظ و روابط کثرت کے ساتھ ان کے اشعار میں پائے جاتے ہیں،

یہ دور ابوالحسن تاناشاہ اور اس کے معاصرین پر ختم ہو جاتا ہے، اس دور کے جن شعرا کا حال مجھے معلوم ہوا ہے، ان کا ذکر مقدمہ میں کر چکا ہوں،

دوسرا دور ان شعرا کا ہے جن کا نشو ونما اورنگ آباد کی آب و ہوا میں ہوا ہے جو عالمگیر مرحوم کے پایہ تخت ہونے کی وجہ سے اہل فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا؛ اور ہندوستان و ایران کے نامی گرامی خاندانوں کے لوگ وہاں مجتمع تھے، اسی وجہ سے اُن کی زبان اور ان کے محاورے دور اول کے شعرا کی زبان اور محاوروں سے زیادہ صاف ہیں،

تیسرا دور شعرائے دہلی کا ہے جو فرخ سیر کے عہد سے شروع ہو کر احمد شاہ کے زمانے پر ختم ہو جاتا ہے، اس چالیس پچاس برس میں ریختہ نے کافی طور پر ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی، خصوصاً محمد شاہ کے عہدِ دولت میں جو لوگ فارسی میں بجا طور پر شعر کہتے تھے، وہ بھی تفنن کے خیال سے ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے،

دورِ اوّل

دور اول کے شعرا کا ذکر مقدمہ میں کافی طور پر ہو چکا ہے، مگر قصداً اُن کے دہی اشعار

نقل کئے ہیں جو زیادہ صاف ہیں، زیادہ حصہ اس دور کے کلام کا ایسا ہے جس میں دکنی زبان کی ترکیب غالب ہے،

یہاں پر صرف مولانا نصرتی کا ذکر کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں جو اپنے زمانہ کے ملک الشعرا تھے، اگر مولانا ہاشمی یا ابو الحسن تانا شاہ کے زمانہ کے لوگوں کے حالات ملتے تو وہ بھی اس دور میں نمایاں جگہ پاتے، مگر افسوس ہے کہ تاریخ اور تذکروں سے ان کے حالات کا کافی مواد بہم نہیں پہنچا اس وجہ سے مجبوراً ان کو نظر انداز کرتا ہوں،

مولانا نصرتی

یہ محمد عادل شاہ اور اس کے بیٹے علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر ہیں اور اپنے وقت کے ملک الشعرا تھے، افسوس ہے کہ ان کے حالات گمنامی کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں، نام نسب ملک کا ہم کو علم نہیں،

زبیری نے بساتین السلاطین (تاریخ بیجاپور) میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ان کی تصنیفات میں گلشن عشق ایک مثنوی ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کی عشق بازی کا قصہ نظم کیا ہے، دوسری کتاب علی نامہ ہے، شاہنامۂ فردوسی کا جواب جو سنہ [illegible] میں لکھا تھا، جس میں علی عادل شاہ کی فتوحات اور اس کے زمانہ کے کارنامے نظم کئے ہیں تیسرا مجموعہ قصائد کا ہے، چوتھا غزلوں کا دیوان ہے،

میری نظر سے ایک پرانی بیاض گذری ہے، جس میں مولانا نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل ہے، تاریخ کتابت ۲۲ محرم سنہ [illegible] اس میں لکھی ہے اور اکبر آباد میں یہ لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا کلام اس وقت اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اسکی نقلیں انہی کی زندگی میں اکبر آباد پہنچیں، اور شائقین نے اپنی بیاضوں پر اتار لیا، میرے نزدیک کسی کلام کی

مقبولیت کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

معراج نامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ محمد عادل شاہ کے عہد میں لکھا گیا ہے، اکیس (اکتیس)
شعر اس میں ہیں، بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے،
زبان اس کی زیادہ سخت ہے، کیونکہ دکنی زبان کے الفاظ بکثرت اس میں استعمال
کئے ہیں، زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے عیب جو ان کی زبان پر ہنستے
اور اعتراض کرتے تھے، نصرتی نے علی نامہ میں اس کا جواب دیا ہے،

خریدار کو خوب سودے سے کام ۔۔۔ نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

مضامین سوں حجابات بول ۔۔۔ دکھایا سکت (طاقت) فیض کا حق کے کھول
یلگ فن میں کی سحر کی بہت چھند ۔۔۔ خبیثاں (خبیثوں) کے جیباں (زبانوں) کو کیتا ہوں بند
کیا ہوں سخن مختصر بے گماں ۔۔۔ کہ پوشاہنا نہ دکن کا توجاں
کہ ہر اک زباں حضرت عیسیٰ یاں ۔۔۔ سکھایا سب آدم کو سو تھے نہاں
ہوئی نسبہ جو نسل آدم کی اصل ۔۔۔ کلاماں انہی کے ہوئے فصل فصل
انوں میں جو تھے شہر کے اوستاد ۔۔۔ گیا وہ زمانہ ہے شعر یاد
سخن میں نزاکت کے نا دیکھ بھول ۔۔۔ کہ خوش بانیں سوں قدر پایا ہے کھول
نہ کہتا ہوں میں بے وقوفوں کی بات ۔۔۔ نہ کم ہوں مثالیں تو حاسد نے بات
وتے جو سخنداں ہیں صاحب تمیز ۔۔۔ کہ رکھیں اس سخن کوں رکھیں نت (ہمیشہ) عزیز

نقل | ایک دن علی عادل شاہ خاص محل میں فوارہ کے چھوٹنے کا تماشا دیکھ رہا تھا، اس
وقت پانی کے قطرے موتی کی طرح چمک رہے تھے، بادشاہ کے دل پر اس نظارہ کا ایسا اثر

پڑا کہ اس کے منھ سے بیساختہ یہ مصرع نکل گیا، ؎

ابر آ ہو یو فوارہ پانی پے کیا پھل ہے
(ہرا، یہ، پڑا، صاف)

مولانا نصرتی حاضر تھے انھوں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پہنچایا۔

تجھ شہ او پر اڑنے کا ایک مورچھل ہے

علی نامہ کا ایک قلمی نسخہ نواب عماد الملک کے کتب خانہ میں موجود ہے، اصغی نے محبوب الزمن میں لکھا ہے کہ نصرتی نے ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی ہے،

دور دوم
شعرائے دکن

میر محمد تقی میر نے نکات الشعراء میں شعرائے دکن کا ذکر میر عبد الولی عزلت کی بیاض سے نقل کیا ہے، حال تو کچھ لکھا نہیں، کسی کے ایک دو شعر، کسی کے کچھ زیادہ لکھے ہیں اور ان کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے،

"یکے از یں شاعران سمت دکن کہ پر بی رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولی و سید عبد الولی و سراج و آزاد کہ معاصر ولی بود سر رشتہ مضبوط گوئی بدست ایشان یافتہ می شود، باقی سر کلافہ داشتہ اند"

میر صاحب نے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے، اور جو کلام ان کا انھیں ملا ہے اس کے لحاظ سے یہ رائے ان کی صحیح ہو تو ہو مگر اصلیت اور واقعہ کے اعتبار سے غلط اور بالکل غلط ہے میر صاحب نے دکن کے سینکڑوں شعراء میں سے کم و بیش پچیس شاعروں کا ذکر کیا ہے، ان سینکڑوں میں بیسیوں ایسے ہیں جو میر عبد الولی عزلت سے بہتر شعر کہتے ہیں،

کسی کے ایک دو شعر پڑھ کر اس کی نسبت جو رائے قائم کی جائے گی وہ اصلیت سے دور ہوگی، مرزا داؤد کا صرف ایک شعر میر صاحب کو ملا ہے۔ حالانکہ ان کے دیوان میں پانسو شعر سے کم نہیں، اگر تم اسی ایک شعر کو پڑھ کر سارے دیوان کو خرافات کہدو تو اس سے زیادہ زبردستی کیا ہو سکتی ہے،

جن لوگوں کی خبر میر صاحب کو نہیں ہوئی، ان میں سے میر عاشق علی خاں ایما، میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبدالحیٰ خاں صارم، عارف الدین خاں عاجز، میر ولاد محمد ذکا، لچھمی نراین شفیق، اور بہت سے ایسے شعرا ہیں جن کے ہاں زبان کی صفائی، خیالات کی رنگینی اور پختگی کلام کے تمام لوازم موجود ہیں،

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ چھاپہ خانوں کی کثرت سے نایاب کتابیں کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں، ان کے دواوین اور پرانے تذکرے اب تک گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں،

شمس الدین ولی

شمس الدین لقب، ولی اللہ نام، ولی تخلص، اورنگ آباد میں تقریباً ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے، خاندان کا حال معلوم نہیں، آزاد نے آب حیات میں ان کو گجرات کا باشندہ اور علامہ وجیہ الدین علوی کی نسل سے بتایا ہے، مگر اس کی کوئی تاریخی سند نہیں بتائی، صرف تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کا حوالہ دیا ہے، یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گذرا، مگر میر محمد تقی میر اور میر حسن کے تذکرے پیش نظر ہیں، وہ ان کو اورنگ آباد کا باشندہ ظاہر کرتے ہیں،

ملہ اختلاف است درینکہ اول کسے کہ بہ ریختہ سخن کردہ داد ست یا بیشتر ہم فکر دریں زبان شایع بود بہ تحقیق تقدیم ثانی براول است و توفیق آن ست کہ تا زمانش دیگرے بہ تبہ او نرسید دیوان موجد گفتنش را علت ہمین باشد، گلشن بیخار

آصفی ملکاپوری نے حال میں ایک بسیط تذکرہ شعرائے دکن کا شائع کیا ہے انہیں بھی ولی کو اورنگ آباد کا ظاہر کیا ہے اور خود ان کے کلام اور ان کے لب و لہجہ سے اسکی سند بہم پہنچائی ہے کہ وہ دکن کے رہنے والے تھے،

علامہ وجیہ الدین کا خاندان گجرات میں اپنے فضل و کمال اور فیض رسانی کے لحاظ سے بہت معزز و ممتاز سمجھا جاتا تھا، گجرات پر مغلوں کے قبضہ ہو جانے کے بعد اچھے اچھے گھرانوں کے لوگ پریشان ہو کر بیجاپور، احمد نگر، برار اور برہان پور کو چلے گئے تھے، انہی نقل مکان کرنے والوں میں شاہ اسد اللہ علامہ وجیہ الدین کے پوتے بھی تھے، جنھوں نے بیجاپور میں بود و باش اختیار کی تھی، اگر یہ صحیح ہے کہ ولی کو علامہ وجیہ الدین کے خاندان سے نسبت تھی تو کیا عجب ہے کہ یہ شاہ اسد اللہ سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں،

آصفی کہتے ہیں کہ بیس برس کے سن میں تحصیل علم کے لئے گجرات گئے اور علامہ مذکور کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، چند روز کے بعد اسی خاندان کے ایک سجادہ نشین کے ہاتھ پر طریقہ قادریہ شطاریہ میں بیعت کی،

سید ابو المعالی احمد آباد گجرات کے ایک بزرگ زادے سے ولی کو ایسی محبت ہو گئی تھی کہ اس کو دیکھنے والے عشق سے تعبیر کرتے تھے انھوں نے بزرگان دین کی زیارت کی نیت سے دلی، سرہند کا سفر اختیار کیا، ولی بھی ان کے ساتھ ہو لئے،

دلی میں شاہ سعد اللہ گلشن نقشبندیہ سلسلہ کے ایک نامور بزرگ اور بہت پر گو شاعر تھے ولی نے ان کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا، اور اپنے شعر سنائے، میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے ان کے شعر سن کر فرمایا کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"

آزاد کہتے ہیں کہ خود ولی نے ایک رسالہ نور المعرفتہ تصوف میں لکھا ہے، اس میں کہتے ہیں کہ میں نور الدین محمد صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاک پا اور شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد ہوں

ولی، محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دلی آئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں ان کا جی لگ گیا تھا، چنانچہ ولی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دلی سے اورنگ آباد واپس آئے، یہاں ۱۱۴۴ھ میں وہ مجلس شہدائے کربلا کے حال میں ایک مثنوی لکھی، اس کے خاتمہ میں کہتے ہیں ؎

ہوا ہے ختم جب یہ درد کا حال تھا گیارہ سے پہ اکتالیسواں سال

کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

ایک چھوٹی سی مثنوی ان کی سورت کی تعریف میں بھی ہے، قیام گجرات کے زمانہ میں یہ سورت گئے تھے، وہیں یہ مثنوی تصنیف کی، اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ،

عجب شہرواں میں ہے پر نور یک شہر بلاشک ہے وہ جگ میں مقصد دہر

رہے مشہور اس کا نام سورت کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت

بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

ولی کو گجرات سے بہت دلچسپی ہو گئی تھی، اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر اپنے پیر و مرشد اور اساتذہ کی زیارت کو پھر احمد آباد چلے گئے اور تقریباً ۱۱۵۵ھ میں وہیں وفات پائی،

ان کا دیوان یورپ میں بھی چھپ گیا ہے، اس میں علاوہ ردیف وار غزلوں کے، رباعیاں، قطعے، دو تین مخمس، قصیدے اور دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں،

ناواقفیت کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال چلا آتا ہے کہ ریختہ میں سب سے پہلے ولی نے

دیوان مرتب کیا ہے، اسی بنا پر مولوی محمد حسین آزاد نے اردو نظم کی اولیت کا تاج اُن کے سر پر رکھ دیا ہے، اور اردو شاعری کی نسل کا آدم ان کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں ان کو وہ رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے، حالانکہ ان سے سو سوا سو برس پہلے ریختہ میں شاعری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ اُس میں بے تکلف دیوان مرتب ہونے لگے تھے محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دیوان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں، مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے، مگر زبیری نے بساتین السلاطین میں اس کا ذکر کیا ہے،

قصائد میں مولانا نصرتی کا قصیدہ میری نظر سے گذرا ہے، جس پر تاریخ کتابت ۲۲ محرم سنہ ۱۰۸۳ھ لکھی تھی، اور قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ محمد عادل شاہ (متوفی سنہ ۱۰۶۳ھ) کے عہد حکومت میں تصنیف کیا گیا ہے،

مثنویوں میں مولانا نصرتی کا شاہنامہ، مولانا ہاشمی کی یوسف زلیخا، اور ولی کے ایک ہمعصر مولوی سید محمد کی فیض عام جو سنہ ۱۱۴۲ھ میں لکھی گئی ہے، جس سال ولی نے دہ مجلس لکھی تھی

مراثی میں میرزا ان مولانا نصرتی کا ہمعصر اور شاہ قلی وغیرہ ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں ایسے خوشگو شاعر تھے کہ ان کے مرثیے ہاتھوں ہاتھ دلی اور آگرہ پہونچے اور لوگ انکو شوق سے پڑھتے تھے

غرضکہ تمام اصناف سخن میں سے ہر ایک صنف ولی سے دیڑھ سو برس پہلے ریختہ میں آچکی تھی، مگر زبان کی حیثیت سے دستور کے موافق عالم طفولیت میں تھی،

ولی کے زمانہ تک منجھتے منجھتے زیادہ صاف ہوگئی، ولی، آزاد، سراج اور داؤد کے اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی ایک زبان ہے،

تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہمعصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور

اس کے کلام کو قبول عام حاصل ہو جانا اس کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔

کلام کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن میں لالہ بلبل پہ مت ستم کر — گرمی سوں تجھ نگہ کے گل گل گلاب ہوگا
مت آئینہ کوں دکھلا اپنا جمال روشن — تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا
مجکو ہوا ہے معلوم اے مست جام خوبی — تجھ انکھڑیاں کو دیکھے عالم خراب ہوگا
ہاتف نے یوں دیا ہے مجکو ولی بشارت — اسکی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر — حرف حرف اس مخزن اسرار کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی — بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں — بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی شرعیاں کے حضور — خود بخود رسوا ہے اسکو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گلرنگ کا — جامۂ زیبا کو رنگ جامۂ دیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب — زیور لب کر سبحان الذی اسریٰ کروں
آرزو دل میں یہی ہر وقت ہے مجھ کو ولی — سرو قد کو دیکھ کر سجدہ بپا کروں

مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے | چمن حسن پری رو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع | جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
ست گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور | گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے
ہے وہی رہنے کوں دنیا میں مقام عاشق | کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے
تا حشر رہے بوئے گلاب اسکے عرق سے | جس بر مینے یک بار وہ گل پیرہن آوے
سایہ ہو مرا سبزہ یہ رنگ برہ طوطی | گر خواب میں وہ نوخط شیریں بچن آوے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو | کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی | کہ دل سے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجاوے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن | باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

دشمنِ دین کا دین دشمن ہے | راہزن کا چراغ رہزن ہے

فقیر اللہ آزاد

حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے، بچپن میں یتیم ہو گئے، مزاج میں اہلیت و غربت تھی کہ اہلِ محلہ ان کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے،

کچھ معلوم نہیں کہ کس خاندان کے چشم و چراغ تھے اور تعلیم و تربیت کیسی ہوئی، قرینہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق فارسی کی پوری اور عربی کی بقدر ضرورت کتابیں پڑھی ہونگی،

تعلیم پوری نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ جوان ہوتے ہی کسی پری پیکر کو دل دے بیٹھے اور تنگ چٹنے لگے، ایک حال اور ایک مقام پر قرار نہیں آتا تھا، بیتابانہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے، اسی حالت میں اپنے دوست وہموطن فراقی کے ساتھ دلی آئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی نہیں ٹھہرے،

میر محمد تقی میر نے نکات الشعراء میں انکا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ بعصر ولی بود بسیار صفا حرف می زد، میر حسن نے بھی اسکی تصدیق کی ہے، مگر دونوں نے ایک ہی شعر انکا نقل کیا ہے، ولی نے ان کی غزل پر غزل کہی ہے، اور ان کی غزل کے ایک مصرع کو تضمین کیا ہے، اور اپنے معمول کے موافق اُن پر نوک جھونک نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزاد کی شاعری کا ایک حد تک معترف ہے، ؎

آزاد سے شاید دل یہ شعر مناسب ۔۔۔۔۔۔ جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا یہ شعر ہے،

آئیں جہاں کی ساری آزاد صنعتیں پہ ۔۔۔۔۔۔ جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

میر سراج الدین سراج

از مردم اورنگ آباد در وقت عالمگیر اول بود، از شاگردان سید حمزہ علی دکنی روشن طبع معلوم می شود، خدایش بیامرزد، (تذکرہ میر حسن)،

سراج الدین نام، سراج تخلص، اورنگ آباد کے سادات صحیح النسب سے تھے، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، وہیں ان کا نشو و نما ہوا، اس زمانہ کا اورنگ آباد آج کا ایسا نہ تھا، عالمگیر مرحوم کے پایہ تخت ہونے کی وجہ سے مرجع اہل کمال بنا ہوا تھا، ہر علم و فن کے اہل فضل و کمال وہاں مجتمع تھے، ان کے دامن تربیت میں پرورش پائی،

میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سید حمزہ کے شاگرد ہیں مگر اس کی تصدیق اہلِ دکن نہیں کرتے، خود سراج نے شعرائے فارس کے دیوانوں کا انتخاب کیا ہے، اس کے دیباچہ میں کچھ اپنے خیالات بھی لکھے ہیں، مگر اس میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا،

عنفوانِ شباب میں غلبۂ شوق سے ان پر خود رفتگی کی کیفیت پیدا ہوئی، سات برس تک برہنہ پا و برہنہ سر مولانا برہان الدین غریب کے روضہ کے اطراف میں چکر کاٹتے رہے، اور اسی حالت میں فارسی میں شعر کہتے، مگر لکھتے نہیں تھے، خود فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اشعار جمع کیے جاتے تو ایک ضخیم دیوان تیار ہو جاتا،

سات برس گذرنے پر سید عبدالرحمن چشتی (متوفی ۱۱۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر طریقۂ چشتیہ میں بیعت کی اور عرصۂ دراز تک انکی صحبت سے مستفید ہوتے رہے اپنے پیر بھائی عبدالرسول خاں کے کہنے سے ریختہ کی طرف توجہ کی، اور عرصہ تک ریختہ میں فکرِ سخن کرتے رہے، عبدالرسول خاں نے دیوان مرتب کیا، جو پانچ ہزار شعروں پر مشتمل ہے اس دیوان کی اشاعت سے دکن میں ان کی دھوم مچ گئی، اور اس پر اتفاق ہو گیا کہ ولی کے بعد دکن میں اس پایہ کا کوئی شاعر نہیں ہوا، خود سراج کو بھی اسکا دعویٰ تھا، فرماتے ہیں،

تجھ بنا اے سراج بعد ولی ۔۔۔ کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

ا بسے سراج آرزو سے قند نہیں ۔۔۔ شعر تیرا ہے جوں نبات لذیذ

شاید کہ بعد مرگ کریں خاص و عام یاد ۔۔۔ مشہور نہیں سراج کا شیریں سخن ہنوز

مصنفینِ دکن نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ریختہ گوئی میں سراج ولی کا قائم مقام تھا،

وؔلی نے زمینِ شعر پر جو پودے لگائے تھے اُن کو سراجؔ نے سرسبز و شاداب کیا، اور اہلِ دکن نے مزے لے لے کر اُن کے پھل کھائے،

اورنگ آباد کی محفلوں میں سراجؔ ہی صدر نشین ہوتے تھے، اور خود اپنے یہاں بھی ہفتہ میں دو بار مجلسِ سماع منعقد کرتے، اس میں شہر کے علما و مشائخ اور ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے تھے، قوال انہی کی غزلیں گاتے اور وجد و حال کا ہنگامہ دیر تک گرم رہتا،

فارسی میں بھی اچھے اور صاف شعر کہتے تھے، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

گلِ بے رنگِ حقیقت کہ بہ دامانم بود ۔۔۔ ہمچو اشک از مژہ خویش چکیدم دیدم

نمازِ عشق ادا کردنی است عاشق را ۔۔۔ خوشم کہ دستِ ز جاں شستم و وضو کردم

آتشی در دلِ دل سوختہ افتاد سراجؔ ۔۔۔ باز سیماب ز خاکسترِ اکسیر چکید

سراجؔ بہت خوش فکر، سنجیدہ مزاج، شگفتہ پیشانی، صاف دل اور پاکیزہ مشرب تھے، آخر عمر میں شعر گوئی ترک کر دی تھی، اور ہمہ تن تزکیۂ باطن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے مگر احباب سے بے تکلف ملتے اور لطفِ صحبت حاصل کرتے تھے، مولانا غلام علی آزاد سے زیادہ صحبت رہی،

ایک دیوان فارسی کا، ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار شعر ہیں، ایک منتخب فارسی شعرا کے دیوانوں کا سنہ ۱۱۶۱ھ میں تیار کیا تھا، اس کا تاریخی نام منتخب دیوانہا ہے، ایک مثنوی سنہ ۱۱۶۰ھ میں لکھی تھی جس میں گل و بلبل کے افسانے میں جذباتِ معرفت کی ترجمانی کی ہے

ان کے شاگردوں میں خواجہ ابو البرکات عشرتؔ، خواجہ عنایت اللہ فتوتؔ، اشرف علی فغاںؔ، مرزا محمد جان نثارؔ، مرزا عطا ضیاؔ تخلص، جے کشن داس بیجاںؔ بہت خوشگو شاعر تھے،

۴ شوال روز جمعہ ۱۱۷۷ھ میں وفات پائی، میر غلام علی آزاد، میر اولاد محمد ذکا، اور لچھمی نراین شفیق نے تاریخیں لکھیں، میر اولاد محمد کی تاریخ نقل کرتا ہوں،

چہ رفت دودۂ آل عبا سراج الدین	کہ بود روشن ازو محفل سخندانی
نود چارم شوال و صبح آدینہ	بہ شمع انجمن عمر دامن افشانی
ز تیرہ بزم جہان فنا بہ دار بقا	فروغ ناصیۂ خویش کرد ارزانی
کشید شعلۂ تاریخ سر ز طبع ذکا	سراج بزم ارم را نمودہ نورانی

کلام کا رنگ ملاحظہ ہو،

ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشم مست میں	شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

شکر اللہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا	شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

آہ سوزاں سے مرے دامن صحرا میں سراج	قبر مجنوں پہ چراغاں ہوا تھا سو ہوا

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں	کہاں سراج کہاں آفتاب عالمتاب

نہیں حقیقت میں حسن و عشق جدا	طوق قمری ہے طرۂ شمشاد

ہائے رہ گئی دل میں دامنگیریوں کی آرزو	سبزۂ تربت مرا ہے پنجۂ گیرا ہنوز

عجب وہ سروِ گلزارِ ادا خوش قد ہوا واقع
پر بلبل نہالِ گل کو دستِ رو ہوا واقع

شعلہ خو جیب سے نظر آتا نہیں
ٹوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

مجھ نگین داغِ دل پر نقش ہے حرفِ وفا
عشق کی امت میں ہوں مہرِ نبوت کی قسم

نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف اُسکے مکھڑے کی
کہ یہ مضمون مجھکو عالمِ بالا سے آتے ہیں

یاد رکھ اے دلِ خوں گشتہ کہ جوں تکمۂ لعل
جامہ سیوں کے گریباں کا گلوگیر نہ ہو

مدت سے گم ہوا دلِ بیگانہ اے سراج
شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

تم پر فدا ہیں سارے حسن و جمال والے
کیا خط و خال والے کیا نقشِ کاکل والے

بہار ساقی ہے بزمِ گلشن میں مطربانِ چمن شرابی
پیالہ گل سرو شیشہ شراب بو اور گل گلابی

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زبان سے بیاں کروں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

مرزا داؤد داؤد

مرزا داؤد نام، داؤد تخلص، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی، اس زمانہ میں اورنگ آباد فضل و کمال کا گہوارہ تھا، علما و شعرا کی صحبت میں داؤد نے علمی استعداد ایسی پیدا کر لی تھی کہ شعر و سخن کی ضرورتوں سے پورے طور پر آگاہ ہو گئے تھے،

یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کے شاگرد تھے، میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے، "شاگرد سید" خدا جانے سید سے مراد سید حمزہ ہیں یا سید عبدالولی عزلت،

عزلت نے اورنگ آباد میں مستقل بود و باش جس زمانہ میں اختیار کی ہے، اس سے بہت پہلے داؤد کی شاعری زوروں پر تھی، اس لئے عزلت کی شاگردی قیاس میں نہیں آتی،

آصفی نے لکھا ہے کہ یہ ولی کا تتبع کرتے تھے، خود بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کو سنکر
تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

کم و بیش پانسو شعروں کا ان کا دیوان ہے، ۱۱۶۹ھ میں وفات پائی، لچھمی نراین شفیق نے تاریخ کہی ؎

بلبلِ گلزارِ معنی، طوطیِ رنگیں زباں
از غمِ آبادِ جہاں بگذشت چوں تیرِ کماں

مصرعِ تاریخ فوتش گفت با من ہاتفے
گو برفتہ میرزا داؤد فانی از جہاں

داؤد کے کلام کا انتخاب،

عزیزاں محراب میں دیکھا ہوں آج اُس سروِ قامت کو
ہوا معلوم وقت آیا ہے میری سرفرازی کا

قانونِ شفا نطق میں ہے یار کے موجود
سنے دل نہ ہو محتاج طبیبانِ دوا کا

ہوا ہے ابرِ گریاں دیکھ میری چشمِ گریاں کو
پڑا ہے شور دریا میں مرے اس اشکباری کا

مجھ بزم میں رقیب عبث سرکشی نہ کر
شعلہ پڑا ہے شمع پہ مجھ سوزِ آہ کا

اُس صنم کے خیالِ ابرو نے
ناتواں مجکو جوں ہلال کیا

دستِ رنگیں کو دیکھ کر تیرے
رنگِ مہندی چھپا ہے پاتوں پات

کہتے ہیں عاشقاں مرا حال دیکھکر
شاید تو دل دیا ہے کسی بیوفا کے ہات

مجھ برسوں بوسے لے اگر آوے عجب نہیں
اُس چشمِ پرخمار کو دیکھا ہوں خواب میں

تیمم اُن کا اوروں کے وضو کرنے سے افضل ہے
کیا ہے جن نے حاصل خاکساری کی عبادت کو

مرا احوال چشم یار سے پوچھ حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

مرے حال پریشاں کی حقیقت صنم کی زلف کے ہر تار سے پوچھ

آگے زاہداں اٹھاؤ اجبیں کو زمیں سے جو سرنوشت ہے اُسے کہاں تک مٹاؤ گے

میر عبد الولی عزلت

نسبتے تمام بہ سخن دارند از اسالیب کلام شاں واضح می گردد کہ بہرۂ بسیارے از

در ہندی دارند (نکات الشعراء)

میر عبد الولی نام، عزلت تخلص، سید سعد اللہ سلونی کے بیٹے، وہ شاہ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، سلون ضلع رائے بریلی میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، شاہی زمانہ میں صوبہ الہ آباد میں شامل تھا، اب اودھ میں اس کا شمار ہے،

سید سعد اللہ علوم و فنون میں فاضلِ یگانہ اور علامۂ وقت تھے، سفر حج سے واپس ہونے وقت سورت میں بود و باش اختیار کر لی تھی، میر عبد الولی کا نشو و نما سورت میں ہوا، اپنے والد سے علوم و فنون کی تعلیم پائی، اور مدتوں درس دیتے رہے، طبیعت میں تیزی و جالا کی خدا داد تھی، اول فارسی میں شعر کہنے کا شوق ہوا، اس کے بعد ریختہ پر طبیعت مائل ہوئی، اور اس میں ایسی ترقی کی کہ استاد سمجھے جانے لگے،

بھاشا میں بھی فکر کرتے تھے، دوہے، کبت، جھولنے، سوال و جواب، بارہ ماسے، مکرنیاں، پہیلیاں، سبھی چیزوں میں طبع آزمائی کی، اور ہر ایک چیز کو سلیقہ سے کہا، موسیقی کا شوق ہوا تو زیر و بم اور تال و سر میں مہارت پیدا کی، ساز و قانون و سرود وغیرہ میں

سب سے آگے نکل گئے، اور اس زمانہ کے اچھے اچھے گویّے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے،

مصوری میں وہ کمال دکھایا اور رنگ و روغن میں ایسی صفائی پیدا کی کہ اس فن کے ماہر ان کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتے تھے،

غرضکہ جامعیت اور ہمہ دانی میں اپنے بہت سے ہمعصروں سے ممتاز تھے، اسی وجہ سے جہاں جاتے قدر شناس ان کی عزت کرتے تھے،

سنہ ۱۱۴۳ھ میں دلی آئے، سراج الدین علی خاں آرزو کا زمانہ تھا، اُن سے ملے اور عرصہ تک دلی میں رہے، میر محمد تقی میر سے زیادہ ربط ہو گئی تھی، میر صاحب نے نکات الشعرا میں شعرائے دکن کا کلام انہی کی بیاض سے نقل کیا ہے، اور ان کا ذکر خوبی سے کیا ہے،

دلی سے مرشد آباد گئے، نواب مہابت جنگ علی وردی خاں کا زمانہ تھا، نواب تپاک سے ملے، اور جب تک زندہ رہے، ان کی عزت کرتے رہے،

نواب کے مرنے کے بعد دکن گئے، اور اورنگ آباد میں بود و باش اختیار کی، نواب ناصر جنگ نظام الدولہ بہادر کا زمانہ تھا، انھوں نے تنخواہ مقرر کر دی، ان کی شہادت کے بعد حیدرآباد گئے، نواب صلابت جنگ آصف الدولہ بہادر نے دو گانوں جاگیر عنایت فرمائے، غرضکہ جب تک جیتے رہے فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، میر غلام علی آزاد، میر اولاد محمد ذکا، مرزا علی نقی خاں ایجاد، عبد القادر سامی اور لچھمی نراین شفیق سے صحبتیں گرم رہتی تھیں،

۱۲ رجب سنہ ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی، حیدرآباد میر مومن کے دائرے میں مدفون ہوئے

جلایا مصحفِ دل تونے کیوں برقِ تغافل سے   جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں — اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہوگا

اس کو پہونچی نہ خبر دم توڑتا ہوں میں — کسی دشمن سے سنا ہوگا

غربت گمان یوں تھا کہ تب اثر نہ آہ کو — پھر دود آہ دل میں مرا دیدہ تر کیا

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نہ رہا — سوائے بیکسی اب اور آشنا نہ رہا

جس خوش نگہ کو بھیجوں غفلت کی نیند لیوے — میں خفتہ بخت شب کا افسانہ ہو رہا ہوں

تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں — تجھ آنکھوں کے مانند کا بیمار میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم — کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں

صحیح اپنا مرض الفت کا جب میں عرض کرتا ہوں — جلے دل کی تشفی کو مجھے آنکھیں دکھاتا ہے

چینِ ابروئے سجن میں مرا دل الجھا ہے — دل کھلے گر کبھی دونوں میں گرہ پڑ جائے

سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے — گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنا

دیکھ مت رنگیں چمن کو دل مرا غمناک ہے
گل کے ہاتھوں خونِ بلبل کا گریباں چاک ہے

خاطرِ یاراں میں ہے ہم خاکساروں کا غبار
صاف ہو شکوہ دلوں میں کیا بجز خاک ہے

اے بلبل آتی رو نے دعا ہر سحر تو مانگ
حق تیری آہ و سر دچمن کی صبا کرے۔

عارف الدین خاں عاجزؔ

عارف الدین نام، عاجز تخلص تھا، باپ دادا بلخ کے باشندے تھے، عالمگیر مرحوم کے عہدِ دولت میں ان کے والد ہندوستان آئے۔ نواب فیروز جنگ کی عنایت سے شاہی منصب حاصل ہوا۔

عاجز ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ بہت چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مگر خدا کے فضل نے دستگیری کی، نواب لشکر خاں (رکن الدولہ نصیر جنگ) نے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، ان کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی، اور انہی کے ساتھ اورنگ آباد آئے، نواب آصفجاہ اول کی سرکار میں منصب و خطاب سے سرفراز ہوئے۔

منصب زیادہ نہیں تھا، مگر مزاج میں قناعت تھی اور نواب لشکر خاں نے رسالہ کی بخشی گیری کو منصب کا ضمیمہ کر دیا تھا، اس لئے اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے، مزاج میں ظرافت اور شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا، اورنگ آباد پہنچ کر شوق بڑھ گیا،

سلہ دہ دوازدہ سال باشد کہ در شاہجہان آباد تشریف داشت، بندہ شعرا و شنیدہ بودم، از چندیں بہت دکن رفتہ اکنوں از زبان پسند کو بوضوح می پیوندد کہ در بیان پور است راہ نکات۔ (نکات الشعراء)

فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے کرتے دونوں زبانوں میں بہت اچھا شعر کہنے لگے، تاریخ کہنے میں بھی سلیقہ تھا، ایک روز مرزا افضل قاقشال مؤلف تحفۃ الشعرا کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ مکان بیاہن کرتیار ہوا تھا، افضل نے کہا کہ آپ کو تاریخ گوئی میں دعویٰ ہے اس مکان کی فی البدیہہ تاریخ کہئے، کہا کہ آپ کیا دیں گے، انھوں نے کہا جو کچھ کہئے حاضر ہے تھوڑی دیر نہیں گذری تھی کہ یہ تاریخ کہہ کر سنا دی، ؎

منزلِ عیش بہ از چار محل | کرد بنیاد چو مرزا افضل
گفت تاریخ بنا نش ہاتف | منزلِ جاہ و مکانِ افضل

کبر سنی میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، نواب موسوی خاں سے کہلا بھیجا کہ میں مرتا ہوں تاریخ کی فکر کیجئے، انھوں نے جواب دیا کہ تاریخ گوئی میں خود آپ کو مہارت ہے، آپ ہی تکلیف کیجئے، یہ سنکر مسکرائے اور اپنے نام و تخلص کے اعداد جمع کئے، ایک عدد بڑھتا تھا، فرمایا کہ کاش ایک سال کی مہلت اور مل جاتی تو نام کا نام اور تاریخ کی تاریخ ہو جاتی، خدا کی قدرت دیکھو دو چار روز کے بعد اچھے ہو گئے،

اچھے ہو کر کسی ضرورت سے نانڈیڑ گئے، وہاں چند روز رہے تھے کہ وعدہ پورا ہو گیا، او نانڈیڑ میں مدفون ہوئے، میر اولاد محمد ذکا کو ترا دہوا، انھوں نے "عارف الدین خاں عاجز" سے تاریخِ وفات نکالی جس سے ۱۱۸۰ھ نکلتے ہیں، یہی سنہ ان کی وفات کا ہے،

ایک دیوان فارسی میں، ایک اردو میں یادگار چھوڑا، ایک مثنوی لکھی ہے جس میں لال و گوہر کا قصہ نظم کیا ہے، ایہام اور ذو معنیین کا شوق تھا، مگر مثنوی بہت صاف، ذیل میں چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں،

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی | عطا کر مجھکو یاقوت بیانی

سخن کے در کا مجھکو جوہری کر | سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
سخن کا لال دے میری زباں کو | دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

جنوں کے دشت کا بنکر بگولا | خرد کی راہ کو وحشت سے بھولا
سحر سے شام تک مانند خورشید | طلب کے فرق پر رکھ پاے مالید
غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا | بیاباں اس کو گلزارِ ارم تھا
برس دو جب چلا جب راہ میں آہ | نظر میں اس کے آیا دشتِ جانکاہ
کروں اس دشت کی کیونکر صفت کو | زباں پر کس طرح لاؤں نعت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار | اجل کا بہشت تھا وہ دشتِ خونخوار
بیاباں عدم کے تھا برابر | وہاں تھا جانِ عزرائیل کو ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی | وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی گرد تھی پانوں کی دارو | وہاں کی خاک تھی دوزخ کی بالو

غزلوں کے منتخب اشعار

دیکھکر دامنگیر محشر میں ترے ہوئینگے ہم | خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ لے قاتل چھڑا

عاجز ہوں شاہِ ملکِ جنوں میرے واسطے | سورج کلاہ و چترِ فلک اور زمیں ہے تخت

ہے ہمارے بت کا دل پتھر کے جیسے کی طرح | کیا کروں اسکا صفت ہے سخت ہیرے کی طرح

ہر سحر کیا دیکھتی ہو آرسی اے سادہ رو　　ہے تمہارے حسن کی دفتر کی دونوں صا

بہت ہے اے رنگیں ادا تیرا ہی رنگِ گل میں نقش　　تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

عاجز بھی شمع آہ جلاتا ہے باغ میں　　روشن اگر گلوں سے ہوا ہے چراغ با

باغ میں اُس لالہ رو کے آہ جب جاتے ہیں ہم　　دل کے داغوں کو گلوں کے تازہ کرتے ہیں
عشق سے خوش قامتوں کی سبز پوشی کر پسند　　سرو کے بوٹے قبا پر اپنی چھپواتے ہیں

خوش نگہ کی یاد میں ساغر کو جب گرداں کروں　　بے تکلف گردنِ مینا کو نرگس داں کر
اُس حنائی ہاتھ کی تعریف خونِ دل سے لکھ　　ریشۂ نخلِ قلم کو پنجۂ مژگاں کر

چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے　　گلوں سے رنگ اڑ کر لال سا جنگل کو
ہمارا اشکِ خونیں یاد میں گلرو کے بہہ کر　　نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بنا

تیسرا دور

متقدمین شعرائے اردو کا

شاہ مبارک آبرو

شاعر نادرہ گوئے ریختہ۔ می گویند کہ طبعی شوخی داشت، غرض مستغنیِ وقتِ خود بود کہ عہد

محمد شاہ باشد (از نکات الشعرا)

نبیرۂ حضرت محمد غوث گوالیاری نور اللہ مرقدہٗ از ابتدائے جوانی مشقِ سخن می کرد، شاعر

خوش گو در وقت خود بودہ (تذکرۂ میر حسن)

آبرو تخلص، نجم الدین نام، شاہ مبارک لقب تھا، اور اسی لقب سے مشہور تھے حضرت محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں اور سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار، باوجودیکہ بڑے شاعر اور کہنہ مشق تھے، مگر خان آرزو کو اپنا کلام ہمیشہ دکھاتے رہے،

علمی استعداد کا حال معلوم نہیں، کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کے لئے جن معلومات کی ضرورت ہے، اُن سے بے بہرہ نہ تھے، عنفوانِ شباب میں یہ دلّی آگئے تھے اور ساری عمر یہیں بسر کر دی،

ایک آنکھ ان کی جاتی رہی تھی، مگر جو کمال اُن کو خدا نے عنایت فرمایا تھا، اُس نے اس عیب کی پردہ پوشی کر دی تھی، ابنائے وطن نے دل کھول کر ان کی قدر دانی کی اور حق یہ ہے کہ دلّی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہی سے ہوا ہے،

طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی، اس زمانہ کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام الجھا ہوا ہے، مگر محاورہ کی چاشنی نے اس کو بامزہ کر دیا ہے، دیوان انکا غدر میں ضائع ہو گیا، ایک مختصر دیوان اب بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے، شاید اسی کا انتخاب ہو،

کلام ملاحظہ ہو،

آیا ہے صبح نیند سے اٹھ رسمسا ہوا — جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد — سونا وہی ہے جو ہوئے کسوٹی کسا ہوا

انداز سے ہے زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں — جو خال ہی حد سے بڑھا سو مسا ہوا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے — کہ اس ظالم کی جو ہم پہ گھڑی گذری سو جگ بیتا

یہ سبزہ یہ آب رواں اور ابر یہ گھرا — دیوانہ نہیں گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی — ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

دل تو دیکھو آدمی بے باک کا — عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوئے گی — اس دل بے قرار کی صورت

نہ تھا کچھ اور میرے شوق کا حسن صفا باعث — یہی پیاری طرح موجب، یہی کافر ادا باعث

مجلس رنداں میں مت لیجا دل بے شوق کو — شیشۂ خالی کی کیا عزت ہے میخواروں کے بیچ

جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے — ہر چند ہو گیا ہے چمن کا چراغ گل

نکلے تم آ صبا کی طرح جب چمن میں بھول — گلشن کے دیکھ تجکو گئے ہاتھ پانوں پھول

حسن ہے پر خوبرویوں میں وفا کی بو نہیں — پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

کریں جو بندگی ہو دیں گنہگار — بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد — روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے — وہ عاشقی کے زمانے کدھر گئے

تک چلنا چمن کا بھولتا اب تک نہیں مجکو — طرح وہ پانوں رکھنے کی مری انکھوں میں پھرتی ہے

شیخ شرف الدین مضمون

حریف ظریف بشاش بشاش ہنگامہ گرم کن مجلسہا ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ، دیوانش بہمہ جہت وحدیت خواہد بود۔ (نکات الشعرا)

شیخ شرف الدین مضمونؔ جاجمؤ متعلقہ اکبرآباد کے رہنے والے حضرت شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی اولاد میں تھے عنفوانِ شباب میں دلّی گئے، اور زینت المساجد میں قیام کیا، اُس زمانہ میں جیسا دستور تھا کہ اکثر شریف زادے پڑھنے کو باہر نکل جاتے تھے، یہ دلی ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے، اور مرکر بھی نہ نکلے،

ساری عمر زینت المساجد میں بسر کردی، سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے شاگرد تھے، زلزلہ سے اُن کے دانت گر گئے تھے، اس لئے خان آرزو ان کو شاعر بے دانہ کہتے تھے،

مرزا رفیع سوداؔ اُن کے حق میں فرماتے ہیں،

بنائیں اُٹھ گئیں یارو! غزل کے خوب کہنے کی گیا مضمونؔ دنیا سے رہا سوداؔ سو دیوانہ

مضمونؔ کا کلام ملاحظہ ہو۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا صبرِ ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا

افسوں یار جھٹ پٹ لیتے ہیں دل کو اُٹکا کن ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
چھپ کر مخالفوں سے اس طرح آ پلنگ پر کوئی سنے نہ پیارے تیرے قدم کا کھٹکا

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

نہیں ہے ہونٹھ تیرے پان سے سرخ ہوا ہے خون میرا آکے لبریز

تیرِ مژگاں برستے ہیں مجھ پر آبِ پیکاں کا اس طرف ہو ڈھال

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جور باغباں

میرا پیغام وصل اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

میر محمد شاکر ناجیؔ

"مردے ظریف طبع بود، اکثر از لطائف و ظرائف مردماں را بہ خندہ می آرد و خود نمی خندد گر تبسمے می کرد، متوطن شاہجہاں آباد بود، تلاش صنعت ایہام بسیار داشت۔" (از تذکرۂ میر)

سید محمد شاکر ناجیؔ عمدۃ الملک امیر خاں محمد شاہی[1] کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے، تیز مزاج، شوخ طبع، راہ چلتے سے الجھتے، اور جس کے گرد ہوتے اُسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا

---

[1] عمدۃ الملک نواب امیر خاں محمد شاہی عمدۃ الملک نواب امیر خاں عالمگیری کے بیٹے تھے، امیر خاں عالمگیری نواب علی مردان کے داماد اور میر میران شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں تھے۔ ان کے ایک بھائی روح اللہ خاں عالمگیر بادشاہ مرحوم کے مصاحب خاص تھے، امیر خاں محمد شاہی کا نام سید اسحٰق، والد کا نام سید میر مہ آن تھا، ان کے والد عالمگیر مرحوم کے زمانہ میں بائیس برس کابل کے صوبہ دار رہے اور وہاں وفات پائی، انھوں نے خود ترقی کرتے کرتے محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بخشی گیری کے کام تک ترقی کی، اور اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بادشاہ سے ایسے شیر و شکر ہوئے کہ بادشاہ کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا ۱۱۵۲ھ میں محمد شاہ بادشاہ کی کچھ آنکھیں کھلیں تو آصفجاہ اول نظام الملک، میر قمرالدین خاں بہادر وغیرہ بادشاہ کے ... ان کا آنا اس بات پر موقوف تھا کہ نواب امیر خاں دربار سے دور رہیں، چاروناچار بادشاہ

میر صاحب فرماتے ہیں "مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود، بندہ بار یک دو ملاقات کردہ بودم ہزل خود می خواند و مردماں را بخندہ می آورد" افسوس ہے کہ میر شاکر ناجی کا نوجوانی میں انتقال ہو گیا، طبیعت ان کی شعر و سخن سے بہت مناسب تھی، اگر عمر طبعی کو پہنچتے تو تبدیلی مزاج کے ساتھ کلام کی گرمی بہت بڑھ جاتی۔

نہ پوچھو خود بخود ہے عارضِ خورشید کی خوبی
لیا ہے ذرہ ذرہ حسن مہرویاں سے کر چندا

(بقیہ حاشیہ صلاا) ان کو الہ آباد کی صوبہ داری دے کر رخصت کر دیا، مگر جب اصفجاہ واپس گئے تو پھر میرزا دلی آ گئے، اُن کی طبیعت نہایت بذلہ سنج و لطیفہ گو واقع ہوئی تھی، وقت پر ان کو ایسی سوجھتی تھی کہ دوسروں کو پہروں کاوش کرنے سے وہ مضمون ہاتھ نہ آتا تھا،

یہ شاعر بھی تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اور انجام تخلص تھا، افسوس ہے کہ ۱۱۵۶ھ میں ایک سنگدل نے دیوانِ شاہی میں ان کو قتل کر دیا،

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم

کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر
کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ مکنت
شکر ہے ترسے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

میں یو لائے پھیریں یہ مجھ سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو
سوزنِ تقدیر بھی گو سو برس سیتی رہے

مجکو باتوں میں لگا کیا جانے کیا کہہ گیا　　　مجھے چلا جب [illegible]

دیکھو تم [illegible]　　　[illegible]

اعتدال کے [illegible] تک ہو نہ جا　　　[illegible]

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی　　　بھبھوں [illegible]

نرگس کے تیں میں ہرگز لاتا نہیں نظر میں　　　[illegible]

نہ سیر باغ، نہ ملنا نہ میٹھی باتیں ہیں　　　یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

عید ہوتی جو کوئی افطار کرتا جس کے گھر　　　اب بتا دیں سے کا روزہ دیکھ کر مہمان کو
آج تو ناجی سجن سے کرے اپنا عرض حال　　　مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہو لی ہو سو ہو

نادر شاہ کی چڑھائی کے وقت موجود تھے، اس وقت دربار دہلی کا رنگ سرداروں کی خود غرضی باجیوں کی گرم بازاری اور ہندوستانیوں کی آرام طلبی و نازپروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے، آزاد کو صرف دو بند ہاتھ آئے ہیں انہی کو ضیافت طبع سمجھو،

لڑے ہوتے تو برس بیس ان کو بیتے تھے　　　دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے　　　نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلا کی تال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانہ تھا

نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا
سنے تھے وہاں جو لشکر تمام چھاتا تھا

نہ ظرف و مطبخ و مکاں نہ غلہ و بقال

مصطفےٰ خاں یکرنگ

"شاعر ریختہ، معاصر میاں آبرو، می گویند کہ بسیار چپیاں اختلاط و آشنائے در بود" (نکات الشعراء)

کہن سال اور کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا کلام دکھاتے اور اُن سے مشورۂ سخن کرتے تھے، مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک قول کے موافق وہ خان آرزو کے اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آرزو کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں مگر خود اُن کے قطعے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے شاگرد تھے،

آزاد کہتے ہیں بزرگوں سے سنا اور تذکروں میں بھی دیکھا۔ بڑے مشتاق تھے، اور اپنے وقت میں سب انھیں خوش فکر و باکمال مانتے تھے، اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یکرنگ یکتا تھے،

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی
ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن
جب سے تیرا وہ دوستدار ہوا

سننا نہیں ہے بات کسی کی تو اے سجن
تجکو ترا غرور نہ جانوں کریگا کیا

کم نہیں کچھ بوئے گل سیتی فغانِ عندلیب
برگِ گل سے ہے گی نازک تر زبانِ عندلیب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جاے
راستی ہے گی دار کی صورت

پھر گیا ہائے ہم سے وہ مہرو
سرد مہری سہی ہوا کی طرح

کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
گر غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں

ہرگز تم اب کسو کے سخن آشنا نہیں
سب خوبیاں ہیں تم میں پر اک وفا نہیں
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے
مظہر سا اس جہان میں کوئی میرزا نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہے تو اے صیّاد
ہاتھ سے تشکار جاتا ہے

کیا جانیے کہ وصل ترا کس کے ہو نصیب
ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

محمد حسین کلیمؔ

،، اگرچہ کلیم در فارسی گذشتہ است،، ما کلیم رتبہ بیشتر دیگرانیست، قطع نظر بندہ وا

بخدمت او قرابت قریبہ است یک اخلاص تہ دلی دارم و اکثر بہ حالِ این ہیچمدان شفقت
می فرمایند (داخلِ نکات الشعراء)

در فنِ شعر و انشاء عربی ید طولی دارد، بحرِ خاطرش در نثر و نظم موجزن، رسالہ در عروض و قافیہ
ہندی تصنیف نمودہ و فصوص الحکم کہ کتاب عربی است بہ زبانِ ریختہ ترجمہ کردہ و کتابے
در نثر ہندی نیز ایجاد فرمودہ (تذکرہ میر حسن)

میر محمد حسین کلیم دہلوی کے بیٹے اچھے تھے نظم و نثر دونوں میں ان کو قدرت تھی، میر محمد تقی
میر اُن سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔

میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فصوص کا اُنھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے، فصوص الحکم شیخ محی الدین بن عربی کی حقائق و معارف میں بڑی دقیق اور مشکل کتاب ہے جس کا سمجھنا معمولی مولویوں کے بس کی بات نہیں، انھوں نے اردو میں اُس کا ترجمہ کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ علوم عربیہ میں مہارت کے ساتھ حقائق و معارف میں بھی بہت بلند پایہ شخص تھے،

عروض و قافیہ میں بھی ایک رسالہ لکھا ہے، غالباً ہندی عروض و قافیہ کا یہ پہلا رسالہ ہوگا، اسی طرح اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھی ہے، اس کی نسبت میر حسن کہتے ہیں کہ "در ہندی نثر کتابے نیز ایجاد کردہ" اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ اُن سے پہلے کسی نے نثر اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی مگر یہ صحیح نہیں، مقدمہ میں میں نے بیان کیا ہے کہ فضلی نے دہ مجلس ۱۱۴۵ھ میں لکھی تھی، ان کی کتاب کا سنہ تصنیف معلوم نہیں، مگر یقیناً احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا کیے جانے کے بعد لکھی گئی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل فقرہ سے معلوم ہوتا ہے جس کو میر حسن نے نقل کیا ہے،

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر
ایسی دولت سے زنہار رہا عتبروا یا اولی الابصار

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ گلشن بیخار میں ... میر تقی میر ... دونوں زبانوں میں ... دیوان اور مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں ...

میر حسن کی راے ہے کہ ان کے کلام میں نمک نہیں تھا، اسی وجہ سے اس کو شرف قبول حاصل نہیں ہوا۔ میر محمد تقی میر فرماتے ہیں کہ میرزا عبدالقادر بیدل کی روش پر شعر کہتے تھے، اسی وجہ سے ان کے تہ دار شعر سمجھنے سے لوگ عاجز رہتے، وہ اپنے طرز کے آپ مالک ہیں، ان کے قصیدوں غزلوں، رباعیوں اور مخمس کا رنگ کسی کے رنگ سے ملتا نہ تھا۔

صاحب دیوان تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا دیوان نظر سے نہیں گذرا، تذکروں میں ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار درج ہیں، ان کو پڑھ کر اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا،

سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ ایسے بڑے فاضل شخص کے حالات اب تک نہ تذکرہ مشایخ میں ملے نہ اور کسی کتاب میں معلوم نہیں کہ کس خاندان میں پیدا ہوئے کب پیدا ہوئے، کس سے تعلیم پائی، کس کی صحبت میں حقائق و معارف کا چسکا پڑا، کس سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور کس سنہ میں وفات پائی،

حقیقت یہ ہے کہ دلی عجب مردم خیز جگہ تھی، جہاں سے ایسے بڑے بڑے محدث، فقیہ، صوفی اور شاعر اٹھے کہ جس زمانہ میں آج کا ایسا قحط الرجال نہیں تھا اس وقت دوسری جگہ ان کا نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں مل سکتا تھا،

کلیم کا کلام ملاحظہ ہو۔

کس پریشانی نے قدم کھاہے پیچ و تاب سے ۔۔۔ جادہ آتا ہے نظر جوں زلف کج برہم ہوا

عمر رفتہ کا نہ پایا کھوج ہر گز اے کلیم ۔۔۔ آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

لگتی ہے اب تو قلقل مینا سے دل کو ٹھیس ۔۔۔ وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

پاسِ ناموسِ محبت ہی مجھے اُن سے کلیم
باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب

رکھتا ہے زلفِ یار کا کوچہ ہزار پیچ
اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ

زلف کو خواب میں دیکھا تھا جنوں سے شب کو
صبح بیدار ہوا پائی گلے میں زنجیر

سوز غم کھا چکا ہی دل اُس پر جگر جلا
کہتا ہے زخم مجکو ہے اک آرزو ہنوز

ہو گیا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق
رہ گیا میں ترے کوچہ میں گرفتار ہنوز

ہم ہو گئے ہیں ضعف سے جوں بومیانِ باغ
پھرتا ہے رنگِ گل کہ ہمارا کرے سراغ

طریقِ عشق میں مجنوں و کوہکن کو نہ کہہ
ہزاروں ہو گئے غارت سو ایک دو معلوم

دراز ہی شبِ ہجراں نہ زلفِ یار کلیم
نہ مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

مانندِ سرو ہوں کہ نہ گل ہے نہ بر مجھے
بیکارِ باغ ہوں نہ سزاوارِ باغ ہوں

نے اور طنبور میں یہ سوز تو معلوم اے مطرب
کسی کا دل ہوا ہی شاید اس پردہ میں نالاں

غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہونچے غرض تم سُن چکے احوال ہم فریاد کو پہونچے

تجھے یہ ان آنکھوں نے یوں کر دکھوں کہ تہ رہ جات پھرا ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب اٹکے ہے

شاہ ظہور الدّین حاتم

صاحبِ کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت، معاصر میاں آبرو و دو دیوان ترتیب دادہ یکے بہ زبانِ قدیم بطور ایہام، دوم بہ زبانِ حال ادو زنیہ، شہرۂ اشعارش بسیار است، اکثر غزلہائے او را نغمہ سرایانِ ہندی می خوانند (از تذکرۂ میرحسن)

ظہور الدین نام حاتم تخلص، والد کا نام فتح الدین تھا، عمدۃ الملک نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں ملازم تھے، اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے،

میر بادل علی شاہ کا تکیہ دلی میں قدم شریف کے پاس رند مشرب لوگوں کا ٹھکانا تھا یہ بھی وہاں جایا کرتے اور پہروں پہر دل بہلا کر چلے آتے تھے، کچھ فقر کی صحبت، کچھ زمانہ کے انقلاب کا پھیر، وہاں آتے جاتے یہ بھی فقرائے آزاد منش میں شامل ہو گئے،

شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا، مشقِ سخن کرتے کرتے استاد بن گئے، پہلے رمز تخلص کرتے تھے پھر حاتم ہو گئے، کلیات ان کا بہت بڑا ہے، جو قصائد، غزلیات، رباعی اور مثنوی پر مشتمل ہے، آخر عمر میں کلیات مذکور سے منتخب کر کے ایک دیوان مرتب کیا، اس کا نام دیوان زادہ رکھا، آزاد کہتے ہیں کہ "وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے"

ولادت ان کی بقول آزاد ۱۱۱۱ھ میں، اور وفات ۱۲۰۷ھ اور بقول مصحفی ۱۱۹۶ھ

شائع ہوئی ہے۔ دیوان زادہ عزیز الدین عالمگیر ثانی کے زمانہ میں مرتب کیا ہے،

میر محمد تقی میر حسب معمول ان سے سخت ناخوش ہیں نکات الشعراء میں ارشاد فرماتے ہیں:-

"مردیست جاہل و متمکن بتقطیع وضع، در آشنا غنا نہ دارد، دریافتہ نمی شود کہ این گمان

بسبب شاعری است کہ ہیچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمین است۔"

چونکہ مرزا رفیع حاتم کے شاگرد تھے، اور وہ میر صاحب کے حریف تھے، کیا عجب ہے کہ شاہ حاتم میر صاحب کو خیال میں نہ لاتے ہوں،

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند
جراح زخم عشق کا آکر سیا تو کیا

محتاجگی سوں مجکو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

زندگی درد سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر نہ کہیو تو
کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

ایک دن ہاتھ لگایا تھا تیرے دامن کو
آج تک سر ہے خجالت سے گریباں کے بیچ

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک
تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

دلوں کی راہ خطرناک ہوگئی آیا | کہ چند روز سے موقوف ہے سلام پیام

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں | دور ہو پہلو سے ہمت کے مرے قابل نہیں

پیری میں قائم اب نہ جوانی کو یاد کر | سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

بے مدد زلفوں کے اُس کے حسن نے قیدی کیا | صید دل بے دام کرنا صنعتِ استاد ہے

اے خردمندو! مبارک ہو تمھیں فرزانگی | ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

اشرف علی خاں فغاں

"بسیار جوانِ قابل وہنگامہ آرا، شعر ریختہ را بہ خوبی می گوید، وگاہے فکر غزل فارسی می کند شاگرد قزلباش خاں امید مرحوم است" (از نکات الشعرا)

"شعر بہ صفائی می گوید ونسبتِ شاگردی بہ ندیم می رساند. چنانچہ خود گفتہ،" (گلشن ہند)

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں | دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہو ویگا

اشرف علی خاں فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے، علی قلی ندیم سے مشق سخن کی، آزاد نے آب حیات میں تذکرہ مصحفی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قزلباش خاں کے شاگرد تھے، میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے مصحفی کا تذکرہ نہیں دیکھا،

میر تقی میر نے بھی ان کو قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے، ممکن ہے کہ پہلے اُن سے

اصلاح لیتے ہوں، پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں یا فارسی میں ان کے شاگرد ہوں اور اردو میں ندیم کے، جو کچھ بھی ہو مصحفی نے ان کو ندیم ہی کا شاگرد بتایا ہے، اس لئے آزاد کا حوالہ غلط ہے،

فغاں شعر و سخن ہی میں ماہر نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے احمد شاہ نے اسی لئے ان کو ظریف الملک کا خطاب دیا تھا، درانیوں کے حملوں نے دلی کیا ہندوستان کو تہ و بالا کر رکھا تھا، یہ پریشان ہو کر اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد چلے گئے، وہاں سے لوٹتے ہوئے فیض آباد ٹھہر گئے، نواب شجاع الدولہ نے اعزاز و اکرام سے لیا، مگر ایک دفعہ جوشِ اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا ڈالا، یہ چل کر عظیم آباد چلے گئے، راجہ شتاب رائے نے ان کی قدر دانی کی یہ وہیں رہ پڑے اور باقی عمر خوشحالی سے بسر کر کے ۱۱۸۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا،

آزاد کہتے ہیں کہ ایک دن اختلاط میں نواب کے ہاتھ سے ان کا کپڑا جل گیا، یہ نازک مزاج بہت تھے، رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے، معلوم نہیں کپڑے جلنے کی روایت کہاں سے لی ہے مصحفی نے ہاتھ جلنے کا ذکر کیا ہے اور یہی صحیح ہے،

مت قصد کر صبا تو دلِ داغدار کا ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا

اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گذر گئی دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا

کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنا نہیں خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

وابستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں　　یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار پر

تا حشر کم نہ ہووے گی ظالم تپش دل　　کافر ہوں گر گور میں آرام کروں میں

نے زندگی میں وصل میسر نہ بعد مرگ　　عاجز ہوا ہوں اے دل ناشاد کیا کروں

خط دیجیو چھپا کے سے وہ اگر کہیں　　لیتا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

صیاد راہ باغ فراموش ہو گئی　　کنج قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

آخر فغاں یہی ہے جو اُسے کیوں بھلا دیا　　وہ کیا ہوا تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھیے تو بہر حال شکر ہے　　یوں بھی گذر گئی مری ووں بھی گذر گئی

صنم نامہرباں ہو اس قدر نے میرے سب کیا ہے　　مری تقصیر کچھ ثابت نہیں جو غضب کیا ہے
قدم پر ہاتھ جب رکھتا ہوں یوں کہتا ہے جھنجھلا کر　　یہ گستاخی مجھے بھاتی نہیں لے بے ادب کیا ہے

بھر دیجیو دامن میں فغاں لخت جگر کو　　ہم خانہ بدوشوں کا سرانجام یہی ہے

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو ہاں فغاں　　الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

حصّہ دوم

طبقہ متوسطین

دورِ اوّل

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ

"می گویند که اول کسے که طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبانِ اردوے معلّی شاہجہان آباد
که اسی ال پسند خاطرِ عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقفِ
رموزِ جنابِ اکبر، کاشفِ کنوزِ طریقۂ پیغمبر مرزا جانجاناںؒ متخلص بہ مظہر، مردے است فرشتہ صفت
علوی نسب، ہندی مولد، حنفی مذہب، نقشبندی مشرب۔" (از طبقات الشعراء مصنفہ مولوی قدرت اللہ
صدیقی، تالیف ۱۱۸۸ھ)

"در ابتدائے شوقِ شعر که ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود، دورِ ایہام گویان
بود، اول کسی که شعر ریختہ بہ تتبعِ فارسی گفتہ اوست، چون دران روزہا میر عبدالحئی تاباں دوستی تمام
داشت چند غزلیات متعددہ از خامۂ فکر ایشان بر صفحۂ کاغذ ریختہ بود، که مشار الیہ مانع آمد
آخر ایشان را اقرارِ شعر گفتن بہ زبانِ فارسی داد، بعد ازیں بہ ریختہ زبان نیالودند، مگر بہاں قدر
که با صلاح و دستہ شاگردان بکار آید، چنانچہ تربیت انعام اللہ خان یقین، نسبت بہ مجموعہ
دیدہ شد که ساقی نامۂ ایشان شہرت دارد، و متوجہ بودند در تمامِ دیوانش فصاحت و بلاغت بیان

استادِ جلوۂ ظہوری دید، فی الحقیقت نقاشِ اول زبانِ ریختہ بہ اعتبار فقیر مرزاست بعدہ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ" (از تذکرہ مصحفی تالیف سنہ ۱۲۰۹ھ)

لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا ان سے پہلے گزرے تھے انھیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اہلِ زبان کو نیا نمونہ تراش دیا جس سے پرانا رستہ ایہام گوئی کا زمینِ شعر سے مٹ گیا، انکے کلام میں مضامینِ عاشقانہ عجب ترتیب دکھاتے ہیں، اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے، اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں، انکے اصل حال" (از آبِ حیات)

شمس الدین جانجاناں نام مظہر تخلص، والد کا نام مرزا جان تھا، عالمگیر مرحوم کے دربار میں صاحبِ منصب تھے، نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے، دادی بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں، دادا بھی دربار شاہی میں صاحبِ منصب تھے، دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں، پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں، ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے، کالا باغ علاقہ مالوہ میں ۱۱ رمضان سنہ ۱۱۱۱ھ کو پیدا ہوئے عالمگیر مرحوم کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ "پسر جان پدر می باشد" اس کا نام ہم نے جانِ جاں رکھا، کثرتِ استعمال سے جانجاناں ہو گیا۔

اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے، منصب کے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا، مگر توفیق خداوندی نے رہبری کی، اور سعی بے حاصل کو چھوڑ کر مدرسوں اور خانقاہوں کی طرف رجوع کی، شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے جو اس زمانہ میں شیخ المحدثین تھے، باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس برس تک مشایخِ نقشبندیہ سے کسبِ کمال کیا۔

خدا نے مرزا صاحب کی طبیعت عجب باغ و بہار بنائی تھی، شیخ شہید ارشاد سے اگر

بحث نہیں، ان کے اوضاع و اطوار اور ادب و آداب پر غور کرو کتنے سنجیدہ و برجستہ تھے، جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا، لطافت مزاج اور سلامتی طبع کی نقلیں ایسی بیان کی جاتی ہیں کہ تعجب آتا ہے، خوش تقریر ایسے تھے کہ بات کہتے وقت منھ سے پھول جھڑتے تھے، ان سب کمالات کی گوناگونی کی وجہ سے ہر ایک کو ان سے ملنے کی تمنا رہتی تھی، میر صاحب نکات الشعراء میں فرماتے ہیں، بندہ چند مرتبہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است...... خوش تقریریہ مرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد۔ انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں:

از بسکہ تو از فصاحت و بلاغت جناب فیضمآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش را سخن خودی در شنیدن دل با دیدہ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دید، او مرزا صاحب خود را این ہمہ تحریر می پسندی از دولت جاودانی نقش و حالی کہ در کلام معجز نظام آنحضرت است باز میدار ترقی

شیخ علی حزیں ہندوستان میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایک بار دلی میں لب سڑک ایک کوٹھے پر بیٹھے ہوئے تھے، مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہو اسی سڑک سے گذرے، شیخ علی حزیں نے دیکھ کر پوچھا: ایں کدام جوان است؟ سامع ایک شاعر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے کہا مرزا جانجاناں، شیخ نے کہا: چشم بد دور ہمہ دانی و ہمہ جانی ہے[1]

استغنا اور بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا ایک بار محمد شاہ نے نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے اس میں سے جو کچھ چاہئے قبول فرمائیے، ہنس کر فرمایا، قل متاع الدنیا قلیل، خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے۔[2]

---

[1] معمولات مظہریہ [2] مقامات مظہریہ

نواب فیروز جنگ نے خانقاہ، مسجد، کنواں، یومیہ اور گاؤں فقرا کے لیے پیشکش کرنے قبول نہ کیے۔ اور فرمایا کہ موت قریب آپہونچی ہے۔ اس کی تدبیر کرنا ضروری ہے۔ معلوم نہیں کہ شب تک حیات وفا کرے یا نہ کرے[۱]۔

نواب آصفجاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا۔ آپ نے قبول نہیں فرمایا۔ نواب نے کہا کہ لے کر محتاجوں کو بانٹ دیجیے، فرمایا کہ مجکو اس کا سلیقہ نہیں۔ یہاں سے کہیں باہر جائیے۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے تقسیم ہو جائیگا، نہ ہو تو وبال ہو رہے گا[۲]۔

حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب جس طرح زندگی بسر کرتے تھے اس کے لیے اس کو گوارا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اُنھوں نے زندگی بھر کہیں گھر نہیں بنایا۔ کسی دوست کے گھر یا کرایہ کے مکان میں رہتے۔ ایک جوڑے سے زیادہ کپڑا نہ رکھتے۔ کھانا کسی کے گھر پکوانے، وقت کے وقت بازار سے منگوا کر کھا لیتے۔ عام دعوتوں کو قبول نہ فرماتے۔ دوسرے مشایخ کی طرح عرس اور فاتحہ نہ کرتے، جس کے لیے روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

نذر و نیاز کے لیے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں کہ مشکل سے پوری ہوتی ہونگی (۱) یہ کہ پیش کرنے والا شریف و نجیب ہو (۲) دنیاداروں سے اختلاط نہ رکھتا ہو (۳) فی الجملہ صالح و پرہیزگار ہو (۴) حلال و حرام میں تمیز کرنے کا علم رکھتا ہو (۵) اپنے ملک سے تازہ وارد نہ ہو، جہاں لوٹ مار ہوتی ہو (۶) اخلاص و عقیدت سے پیش کرتا ہو[۳]۔

سچ یہ ہے کہ نازک مزاجی اور مرزائیت کے ساتھ درویشی کا بلند پایہ پیدا کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ مولانا نعیم اللہ نے ٹھیک کہا ہے کہ احوال اجتماع اوضاع آنحضرت سعید باوجود مرزائیت و نازک مزاجی کہ بہ اطوار درویشی موافقت نہ دارد، بمیزان تقریر نگنجد[۴]۔

---

۱ مقامات مظہریہ ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ معمولات مظہریہ

خود مرزا صاحب نے بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے، ؎

ور جنوں ہم میرزائی از دماغِ ما نرفت — کہ برائے خویش حمامے زگلخن داشتیم

بجائے سنگِ طفلاں پارہ ہائے شیشہ باید زد — چو مظہر میرزا دیوانۂ نازک طبیعت را

مظہر زما بریدہ و دیگر یاد ما نہ کرد — دیوانہ خوش نہ بود، وضعِ کرخت ما

افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے، جس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں۔۔۔۔۔ کچھ تو اس اعتقاد سے ع،

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اور کچھ۔۔۔۔ میں روسیاہ، بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں" الخ (صفحہ ۱۳۵) تاباںؔ[۱] کا حال جیسا چمکا کر لکھا ہے اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح سے بیان کیا ہے وہ بھی ملاحظہ طلب ہے، (صفحہ ۱۳۶) شعر مندرجۂ ذیل ۞ اکو پڑھئے، پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو

---

[۱] میر عبد الحی تاباں رضوی سید تھے، دلی میں پیدا ہوئے ایسے حسین وجمیل تھے کہ لوگ انکو یوسف ثانی کہتے تھے اس حسن وجمال کے ساتھ عشق مزاج بھی تھے، اور شعر وسخن سے ان کو خدا داد مناسبت تھی، شاہ حاتم نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں انکو اپنا شاگرد لکھا ہے اور شیفتہ نے گلشن بیخار میں انکو مرزا رفیع سودا کا شاگرد لکھا ہے، مگر خود تاباں کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ میر محمد علی حشمت کے شاگرد تھے، (بقیہ صفحہ ۱۲۹ پر)

اور آزاد کی معذرت کو دیکھئے، فرماتے ہیں کہ "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے مگر کیا کیجئے ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور ظرافت کا نمک ہے" (صفحہ ۱۴۱) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ "ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی" (صفحہ ۱۴۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸) میر صاحب نکات الشعراء میں فرماتے ہیں "نسبت بہ شعر او استاد اور رتبہ شاگردی [illegible] نہ بود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشمت ہی کے شاگرد تھے، ممکن ہے کہ شاہ حاتم سے بھی اصلاح لی ہو سودا کی شاگردی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ تاباں مرحوم کو عنفوان شباب میں مے گساری کی عادت پڑ گئی تھی اور وہ بڑھتی گئی کہ ان کے لئے بلائے جان ہو گئی، ہر وقت مدہوش رہنے کی وجہ سے دوستوں نے ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ میر صاحب فرماتے ہیں کہ [illegible] دوستوں کو اس مضمون کے رقعے لکھ بھیجے [illegible] بسبب کثرت استعمال مزاج من [illegible] شدہ بود [illegible] از حواس من بودن از عقل بسیار دور است" آخر کار وہی ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔

میر تقی میر اور میر حسن نے انکے اور مرزا مظہر علیہ الرحمہ کے تعلقات کا [illegible] نہیں [illegible] کہ تاباں کو مرزا صاحب سے عقیدت اور مرزا صاحب کو [illegible] ہوگئے تھے مگر جو شخص پیر و مرید کے تعلقات خصوصاً مرزا صاحب [illegible] وہ بھی ان خرافات باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا، جن کو آزاد نے آب حیات میں بیان کیا ہے۔

تاباں مرحوم کے چند اشعار

کس کس طرح کی دل میں گذرتی ہیں حسرتیں | ہے وصل سے زیادہ مزہ انتظار کا

ہنستا ہے گل چمن میں، تو نالاں ہے عندلیب | دو دل ہیں خوش نہ دیکھے کبھی آسماں [illegible]

کسی واقعہ کی صورت بنانے کا نمونہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ "ایک نواب صاحب انکے خاندان کے مرید تھے، ملاقات کو آئے، اور خود صراحی لیکر پانی پیا، اتفاقاً جو آبخورہ رکھا ٹیڑھا رکھا مرزا صاحب کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا، اور بگڑ کر کہا کہ عجب بیوقوف احمق تھا جس نے تمھیں نواب بنا دیا، آبخورہ بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا" میں پوچھتا ہوں کہ اس میں لطیفہ کیا ہوا جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ مرزا صاحب کی نازک مزاجی نہیں، آتش مزاجی، ضبط و تحمل کی کمی اور بے تہذیبی کی بین مثال ہو سکتا ہے۔ نواب کے قصور پر بادشاہ کو بیوقوف اور احمق مرزا صاحب کی زبان سے کہلانا کتنی نازیبا بات ہے،

واقعہ یہ ہے کہ ایک نواب زادے ملنے کو آئے جن کا تمام خاندان مرزا صاحب سے عقیدت رکھتا تھا، اور خود یہ صاحبزادے مرزا صاحب کے شاگرد تھے، اُن کو پیاس معلوم ہوئی اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کوئی آدمی نظر نہیں آیا، مرزا صاحب سمجھ گئے، فرمایا کہ پیاس ہو تو خود اٹھ کر پی لو، گھڑا اور آبخورہ قرینہ سے ایک طرف کو رکھا ہوا تھا، اُنھوں نے اُٹھ کر پانی پیا اور آبخورہ جو رکھا ٹیڑھا رکھا، گھڑے کو بھی سیدھا نہیں کیا اور آکر بیٹھ گئے، اور جوشِ عقیدت میں آکر عرض کیا کہ بغیر کسی پیش خدمت کے آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی، اگر ارشاد ہو تو ایک خدمتگار متعین کر دوں، مرزا صاحب نے ہنس کر گھڑے کی طرف دیکھا، اور فرمایا کہ تم کو آبخورہ

بقیہ شعر (۱۲۶) | بیگانہ ہو تو اس کو کوئی رد دل سے کرے | جو جانتا ہوں میں اُسے آگاہ کیا کروں

اے باغباں اُڑ جاتے ہیں ہم قفس میں | چھوٹے تو پھر ملیں گے گر بال و پر رہیں گے

بیہوشی ہے کہ ہر دم ہم کو خبر نہیں ہے | کیا جانئے کہ کب تک ہم بے خبر رہیں گے

رکھنے کا سلیقہ نہیں تو تمہارے خدمت گار کو کیا ہوگا۔"

اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آبحیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے جیسا کہ اُن کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش و خروش اور کثرتِ کلام ڈھونڈھتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا، اس کا حال مصحفی سے سنو، وہ کہتے ہیں "ہنوز از تیرہ مرزا کسے در عرصۂ وجود نیامدہ بود۔ .... در ایہام گویاں بود، اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔" آگے بڑھ کر کہتے ہیں "نقاشِ اول زبانِ ریختہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است۔"

مرزا صاحب کا دیوان ریختہ گوئی موجود نہیں یقین کا دیوان تھا کہ دیکھو اور انصاف کرو۔ مصحفی کہتے ہیں "در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبانِ استادہ جلوۂ ظہور می دہد۔"

مرزا صاحب کا ایک دیوان فارسی ہے، ساٹھ برس کی عمر ۱۱۷۰ھ میں ۲۰ ہزار شعر میں سے ایک ہزار شعر انتخاب کیے تھے، اسی واسطے اکثر غزلیں ناتمام ہیں۔ فارسی کلام کے متعلق میر تقی میر کی رائے ہے کہ وہ سلیم و کلیم کے کلام سے کم پایہ نہیں۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں "دیوانِ مختصر فارسی او بہ نظر فقیر مؤلف آمدہ است، از سلیم و کلیم پاے کمی ندارد، اگرچہ شعر گفتن زیب مرتبۂ اوست لیکن گاہے متوجہ این فن بے حاصل می شود۔"

خریطۂ جواہر ایک مختصر انتخاب اساتذۂ فارسی کے اشعار کا ہے کہ اپنے پسند کے موافق لکھتے گئے تھے، وہ حقیقت میں خریطۂ جواہر ہے، اور فارسی دیوان کے ساتھ یہ بھی چھپ گیا ہے۔

۱؎ یہاں تو نہیں مگر میر ضاحک اور میر خلیق کے یہاں کیا مل گیا، میر ضاحک کا ایک شعر اور میر خلیق کے دو شعر ہاتھ آئے ہیں مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحک کے حالات میں فرماتے ہیں: "ابتدا دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا۔ ...... اب کہ طبع ثانی کا موقع پڑا آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول (بلکہ) افسردہ طاق میں پڑے تھے انہی کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں۔" (آبِ حیات ص ۱۹۱)

اردو میں پورا دیوان نہیں، غزلیں اور اشعار ہیں، جو سودا اور میر کی زبان ہے، وہی انکی ہے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، خواجہ احسن اللہ خاں بیان، مصطفیٰ خاں یکرنگ، بساون لعل بیدار، ہیبت قلی خاں حسرت، محمد فقیہ دردمند صاحب دیوان اور اچھے شاعر ہوئے ہیں۔

ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص آیا، دروازہ بند تھا اس نے آواز دی، باہر نکلے تو ایک قرابین ماری، وہ تو بھاگ گیا، مگر حضرت کو زخم کاری لگا، تین دن تک استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ زندہ رہے، عالم اضطراب میں لوٹتے تھے، اور یہی اشعار پڑھتے تھے،

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن　　　خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

سیلِ خوں از سینۂ گرمم، رواں کردست عشق　　　نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخمِ دل مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش　　　کایں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا پتہ بتائیے تو ہم اسکو سزا دیں، جواب میں فرمایا کہ "فقیر ازکشتۂ راہِ خدا ہیں، مردہ کا مارنا قتل نہیں، قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں یہاں بھیجدیں" آخر دسویں محرم ۱۱۹۵ھ کی شام کو اہل بیت کرام سے جا ملے، میر قمرالدین منت کی تاریخ ہے، جس کا مادہ خاص الفاظ حدیث ہیں، اور اتفاق یہ کہ موزوں ہیں، "عاش حمیداً مات شہیداً" لوحِ مزار پر خود حضرت کا یہ شعر کندہ ہے، جو بالکل حسب حال ہے اور صحیح پیشین گوئی ہے،

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے　　　کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

چونکہ اردو کلام حضرت کا نایاب ہے، لہذا جس قدر مجھکو مل سکا ہے، بغیر انتخاب کے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہوں،

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا — نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے — اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا — ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی — مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبل بیکس کی غربت پر — کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے — غلط تھا جانتے تھے تجھکو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم — کہ دولتخواہ اپنا، مظہر اپنا، جان جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا — لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
لوگ کہتے ہیں موا مظہر بیکس افسوس — کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

نہیں کچھ غم کہ کیوں جلتا نہیں پیماں گسل میرا — کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر جلے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر — بھلا تھا یا برا تھا ور کچھ تھا خوب کام آیا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا — صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار　　ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور　　کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب　　پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک　　جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
شاخِ گل ہلتی ہے یہ بلبلوں کو باغ میں　　ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم　　مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں　　بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اک دم وہ چپ رہے　　آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

مت اختلاط کر اے نوبہار تو ہم سے　　چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر　　فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے　　قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

آج مت رنگِ حنا سے کفِ پا لال کرو　　اے بتاں اس دلِ پرخون کو پامال کرو

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن　　نہایت منہ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پان کو

آتش کہو شرارہ کہو کوئلا کہو　　مت اس ستم زدہ سوختہ کو دل کہا کرو

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ　　اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ہاتھ
برگ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا　　شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے　　بیانا لگا ہے جب سے مجھے بے نوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزا یہ گل دیکھ ہر سحر　　سورج کے ہاتھ چنوری تو پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کو اپنے تو　　یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے　　ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

تجلی گر تری پست و بلند آں کو نہ دکھلاتی　　فلک یوں پیچ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کف پا کو نہ اس شوخی سے دہلاتی　　یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں ترا بھنووں کی نیند کیوں جاتی
اگر یہ سرد مہری تجھ کو آسائش نہ سکھلاتی　　تو کیونکر آفتاب حسن کی گرمی میں نیند آتی
الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا　　محبت گر ہماری چشم تر سے مینھ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے　　کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے　　نہ مجھ کو وہ دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ او پر خواب یہ سر پانوں سے تیرے ہل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

خدا کو اب تجھے سونپا رے دل یہیں تک تھی ہماری زندگانی

مرزا محمد رفیع سودا

جوانے است خوش خلق و خوش خوے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روے، مولدش شاہجہان آباد است، فکر پیشہ، غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ خوب می گوید، سرآمد شعرائے ہندی اوست، بسیار خوش گو است۔۔۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید۔ (از نکات الشعرا، میر تقی)

در فنون انواع سخن طاق و بہ جمیع کمالات سخنوری شہرۂ آفاق، در مضمار قصیدہ گوئی گوے سبقت از عرفی و خاقانی ربودہ و در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گذارد بسیار خوش فکر و پُرگو است، چند مدت بہ سبب ویرانگی دہلی در بلدۂ فرخ آباد ہمراہ مہربان خاں۔ از آنجا بہ طرف لکھنؤ رفتہ نوکر شجاع الدولہ بہادر شدہ است۔" (از طبقات الشعرا)

* الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بہ وسیلۂ فن شاعری سرفراز است در علم موسیقی نیز ماہر است و تصانیف بسیار دلفریب ہم دارد تا حال مثل او در ہندوستان جنت نشان کسے بر نخاستہ، اکثر فقیر در خدمت آں بزرگوار می رسد بسیار کرم می فرمایند (از تذکرۂ میر حسن)

" زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سودا، در غزل گوئی بود دیگر نبود

نہ دیدہ اما حق آن ست کہ ہیچ ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است" مرزا دریاے ست بیکران و میر نہرے است عظیم الشان، در معلومات قواعد میر را بر مرزا برتریت و در قوت شاعری مرزا را بر میر سروری" (اے تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں)

"بہ زعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل، اگر گوئی کہ غزل از اشعار رکن مملو است و قصیدہ از آن خالی زیادہ از یں چہ تواں گفت کہ قباحت یں تحقیق بر نظارگیان دیوانش حالی" (اے گلشن بیخار)

مرزا محمد رفیع سودا کے والد مرزا محمد شفیع میرزایانِ کابل سے تھے، بزرگوں کا پیشہ سپہگری تھا، مرزا محمد شفیع بہ طریق تجارت ہندوستان آئے، ہند کی خاک دامنگیر ہوئی یہیں کے ہو رہے، مرزا رفیع ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے، دلی میں تربیت پائی، اول سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، طبیعت شعر و سخن کے مناسب تھی، کثرتِ مشق نے اس میں جلا دیدی، استاد کی زندگی ہی میں ان کی استادی کو خاص و عام نے مان لیا، اور انکی غزلیں گھر گھر ہر ایک کی زبان پر چڑھ گئیں، شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے انکو دینے لگے، اور دلی جیسے شہر میں ان کے فضل و کمال کو سب لوگوں نے مان لیا،

یہ بھی جب تک ہو سکا دلی سے باہر نہیں نکلے، شاہ عالم کا جب کھیل بگڑا، اور بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بادل ناخواستہ نکلے، فرخ آباد میں نواب احمد خاں غالب جنگ سر حکومت تھے، مہربان خاں رند، ان کا دیوان تھا، وہ خود شاعر اور شاعروں کا قدردان تھا، اس زمانے میں دلی سے جو نکلتا تھا، اس کی پہلی منزل فرخ آباد ہوتی تھی، یہ بھی براہ راست فرخ آباد آئے اور مہربان خاں کی مہربانی سے چند سال تک اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کی،

۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا، یہ برداشتہ خاطر ہو کر فیض آباد چلے آئے

اس وقت ان کا سن ساٹھ برس کا ہو چکا تھا، نواب شجاع الدولہ بر سر حکومت تھے، وہ بہت اعزاز سے ملے تھے ان کی تنخواہ مقرر کر دی۔

شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے، ان کا فیض آباد میں جی نہیں لگا اپنی ماں بہو بیگم[۵] کی روک ٹوک سے گھبرا کر لکھنؤ چلے آئے، اور اس کو مرکز حکومت

---

[۵] بہو بیگم کا اصلی نام امۃ الزہرا بیگم تھا، یہ موتمن الدولہ نواب محمد اسحٰق خاں شوستری کی بیٹی تھیں، محمد شاہ بادشاہ نے انکو اپنی بیٹی بنایا تھا، اور شجاع الدولہ کے ساتھ شادی کی تھی، جہیز میں وہ کچھ دیا جو ایک شہزادی کو مل سکتا تھا، سسرال سے بہو بیگم اور خاص محل کا خطاب ملا، یہ بڑی فرزانہ اور دانش مند بیگم تھیں، فیاضی اور سیر چشمی میں انکا کوئی نظیر نہیں تھا، جیتے جی کی سلطنت بگڑی تو بھائیوں کو بھی سمیٹ لیا، اور ماں باپ بھائی کے ملنے والوں پر کیا موقوف ہے، ادنیٰ کا ادنیٰ اور اعلیٰ جو آ جاتا، اسکے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی تھیں، ان کے حسن سلوک کی وجہ سے فیض آباد دلی کا ایک محلہ بن گیا تھا۔ نواب آصف الدولہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے، مگر ان میں نہ باپ کا سا سنجلاپن تھا، نہ ماں کی سی فرزانگی، صرف ایک فیاضی ماں سے ترکہ میں ملی تھی، ماں ان کی خفیف حرکتوں سے ناخوش ہوتیں اور روک ٹوک کرتی تھیں، اور ان کو دل کھول کر اپنے ارمانوں کے نکالنے کا موقعہ نہ ملتا تھا، اس وجہ سے شکار کے بہانے فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے اور پھر یہیں محلسرائیں باغات اور بازار تیار کرا کے رہ پڑے، بہو بیگم کی جاگیر بہت بڑی تھی جو بجائے خود ایک چھوٹی سی ریاست تھی، علاوہ اس کے جواہرات کا ذخیرہ بھی ان کے پاس بہت کچھ تھا، ساری عمر دل کھول کر خرچ کیا، آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں ہمیشہ انکے مرنے اور اس دولت پر قابض ہونے کے متمنی رہے، مگر بہو بیگم ان کو مار کر مریں، اور مرتے مرتے ایک کروڑ کے روپیے اور کچھ اوپر چھپن لاکھ کا وثیقہ سرکار کمپنی کی تحویل میں دیکر دستاویز کر دی کہ ان کے اعزہ اور متوسلین کی جو تنخواہیں انھوں نے کر رکھی ہیں، ہمیشہ جاری رہیں، چنانچہ ان لوگوں کی اولاد اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

قرار دیا تو مرزا رفیع بھی لکھنو آرہے، اور جب تک جیتے رہے نواب اور اہل لکھنو کی قدردانی سے فارغ البال رہے۔

آزاد کہتے ہیں کہ ۱۱۸۵ھ میں لکھنو پہونچے۔ نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی سے بالطنز کہا مرزا تمھاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے، یہ بیاس وضعداری پھر دربار نہ گئے یہ سب افسانہ ہے۔ شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے لکھنو کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ دلی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ ان کی ملازمت میں رہے ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں۔ مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت نواب مرحوم مغفور نیز بودن او در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند"

آزاد نے دلی کے قدردانوں میں بسنت خاں کے ساتھ مہربان خاں کا نام بھی لیا ہے، دہلی میں بھی کوئی مہربان خاں ہوں تو مجھے اس سے کچھ بحث نہیں مگر کلیات میں جہاں جہاں مہربان خاں کا نام آیا ہے، اس سے مراد مہربان خاں رند ہیں، جو فرخ آباد میں دیوان تھے۔[۱]

[۱] نواب مہربان خاں رند دیوان فرخ آباد بڑے مہمان نواز، دانشمند اور خوش اخلاق امیر تھے۔ باوجودیکہ علم نہیں رکھتے تھے، مگر اہل کمال کی صحبت میں معلومات بہت وسیع ہوگئی تھیں، میر سوز مدت تک ان کے یہاں رہے، ان سے شاعری، تیر اندازی اور شمشیر شناسی وغیرہ کی مشق کی تھی، موسیقی میں بہت ماہر تھے، کبت بہت اچھے کہتے تھے، قیافہ شناسی اور قدردانی میں کمال رکھتے تھے، جب مرزا رفیع سودا نے دلی چھوڑی، انکو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور مدت تک فرخ آباد میں رکھا اور ان سے مشق سخن کرتے رہے، مصحفی کہتے ہیں کہ "اگرچہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا داشت و از ہم بعرضہ قلیل مرتبہ والاے شاعری رسانیدہ" میر حسن فرماتے ہیں،

کلیات اُن کا ہر جگہ مل سکتا ہے، اوّل اردو کے قصائد ہیں، پھر چوبیس چھوٹی مثنویاں ہیں ایک مختصر دیوان فارسی کا، ایک تمام و کمال دیوان ریختہ کا جس میں بہت سی غزلیں، مطلع، رباعیاں، قطعات، مستزاد، تاریخیں، پہیلیاں، ترجیع بند، مخمس، اور ہر قسم کی نظم میں ہجویں ہیں۔

عبرۃ الغافلین نام ایک رسالہ ہے بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھا ہے، مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب جو انھوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کئے تھے، اور ان کے کلام میں دخل بیجا کیا تھا، اور خود مرزا فاخر کے کلام پر اعتراض کر کے اسے ناقص ٹھہرایا ہے،

آزاد نے سچ کہا ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے، وہ ایسی طبیعت لیکر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی۔۔۔۔ ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس پر سب رنگوں میں ہمرنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز، نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے، وہ کہیں رکے نہیں، چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام اُن کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے، اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں، کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۹) از شاگردان میر سوز و مرزا رفیع مشہور است، در تصانیف نفسہ بہم رسیدہ پیدا کردہ چنانچہ اکثر اہل غنا دل عشاق را بہ نغمہ دلاویزی او می برند و بسیارے کلامش را چون کلام میرزا سودا و میر سوز سرلوح دیوان می انگارند" کلام ملاحظہ ہو

خلقت تمام گردشِ افلاک سے بنی — ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

مجھ ساتھ تیری دوستی جب ہوگئی آخر — دنیا کی مرے دل سے طلب ہوگئی آخر
حاصل تو ہوا وصل ہمیں اس پہ افسوس — اک پل میں شب عیش و طرب ہوگئی آخر

گریباں ہے، جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں، گویا ولایتی طپنچہ کی چابنیں جڑی ہوئی ہیں، اور یہ خاص اُن کا حصہ ہے، چنانچہ جب اُن کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں، تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا، خیالات نازک ومضامین تازہ باندھتے ہیں، مگر اس باریک نقاشی پر اُن کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے، تشبیہ واستعارے ان کے ہاں ہیں، مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ، رنگینی کے پردہ میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے،

مرزا نے تقریباً ستر برس کی عمر پائی ۱۱۹۵ھ میں دنیا سے انتقال کیا، اور آقا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے، مصحفی نے تاریخ کہی، ع

سودا کجا و آں سخن دلفریب او

مرزا کے بہتر جوہر تلاش کرنے سے پیشتر اُن کے قصیدوں اور ہجووں کا رنگ بھی دیکھ لینا چاہئے جس کے وہ مرد میدان ہیں، اور اس میں کوئی اُن کا حریف نہیں،

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے ۔۔۔ دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو ۔۔۔ اللہ رے اللہ رے کیا نظم بیاں ہے

اتنا میں کیا عرض کہ فرمائیے حضرت ۔۔۔ آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یہاں ہے

۵ؔ اہل مذاق جس طرح میر تقی میر کے کلام میں بہتر نشتر بتاتے ہیں، سودا کے زبردست کلام میں سے بہتر نشتر تیار کرتے ہیں، اسکی نسبت آزاد کی رائے ہمیشہ یہی ہے کہ جو کلام آج کے طرز کے موافق ہے، وہ ایسے مرتبہ عالی پر ہے جہاں ہماری تعریف کی پرواز نہیں پہونچ سکتی، اور دل کی پوچھو تو جن اشعار کو پرانے محاوروں کے جرم میں ردی کرتے ہیں، آج کے ہزار محاورے ان پر قربان ہیں،

سن کر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا
اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ کی کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کے خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں ہے پر گیری تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے، فاقہ میں میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید دگرنہ
شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

گر ہوجیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
اس کی تو اذیت ہی بڑی آفت جاں ہے
وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہو اپنے تئیں بھوکھ
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے
گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
اور ریح خلا رودوں میں جوں اسپ دواں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپیے کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہے
صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے تو وہ اس کو بخشونت نگراں ہے
اور ماحضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہے
مطبوخ میں ہے خربزہ، اور خربزہ پر دودھ
ہے دودھ او پر کچھلی تس اوپر گاؤ زباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی پر ہو تسلی
اس سب پہ تفنن کے لئے عیسیٰ ناں ہے

اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں اُس کے … پھر بو علی سینا ہے تو وہ نہیجدان ہے
رکھتے ہیں غرض مرض سے لڑنے کو سپاہی … گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے

سوداگری کیجئے تو ہے اُس میں یہ مشقت … دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہان ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجئے منزل … ہر شام بدل وسوسہ سود و زیاں ہے
لیجا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس … یہ درد جو سنئے تو عجب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث … سمجھے ہے فروشندہ یہ دزدی کا گماں ہے
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق … پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت … کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لیجا … دیوان بیوتات یہ کہتے ہیں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس … ہر اک متصدی سے میاں اودتیاں ہے

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال … دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو بیاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ … تہنیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تو لڑکی رہے آٹھ پہر فکر … گر گھر میں بیگم کے سنے لطف خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا … پھر کوئی نہ پوچھے میاں سکین کہاں ہے

ملائی اگر کیجئے تو ملا کی ہے یہ قدر … پہرے دو دو دییے اسکے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دن کو تو بیچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے … شب خرچ کیجئے گھر کا اگر تب … داں ہے

تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کے — لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہرِ فراغت — چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعونِ زباں ہے
دیتا ہے دمِ خر سے کوئی شملہ کو نسبت — گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
اور اُس کو جو دیکھے کوئی وہ بہرِ معیشت — اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھکر — ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی — لے خیلِ مریداں یہ وہ بزمِ جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد — کودے ہے کوئی روئے کوئی نعرہ زناں ہے
اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو — ڈالا ہوا واں دال نخود قلیہ و ناں ہے

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری — یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحتِ جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خان جی کا احوال — چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال — جمعیتِ دل کی کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام — عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اُس کا نشاں ہے
سو اُس پہ یقیں کسی کے دل کو نہیں ہے — یہ بات بھی گو بندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکرِ معیشت ہے وہاں دغدغۂ حشر — آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

تضحیکِ روزگار

ہجو اسپ بخیل

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بہ یک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

تنہا وہی نہ دہر سے عالم خراب ہے
خست سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے مزہ جو اُن کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھے ہیں ایک سو اتنا ذلیل و خوار

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اُس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اُسکا حال
کرتا ہے راکب اُس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنوئیں بائیں مار مار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اُس کے تھان کی ہو دیں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پہ زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قصار او آشنا
مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس
گھوڑا مجھے سواری کو دو اپنا مستعار

فرمایا تب انھوں نے کہ اے مہربان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو تم انکسار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

تھا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار

دلی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر بہ وقت کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار کیجئے میدان میں کارزار

ناچار ہو گئے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتھیار باندھ کر میں ہوا اس اوپر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں اس اوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
ٹخ ٹخ کی پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑہ اسے دکھلاتے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لایا تھا رو براہ | ملتا نہ تھا جگہ سے تئیں جوں میخِ استوار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام | گزرندہ ان میں کے کہتے تھے یوں پکار
بیٹے اسے ٹنگا کو کہتا ہوسے یہ روان | یا بار بان بادیوں کے دو اختیار
کہتا تھا کوئی ہے یہ ٹٹو بھی نہیں یہ اسپ | کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ | کتوں نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار
کہنے لگا یہ آ کے اس اجماع میں ایک شخص | گھوڑا ہے یہ گدھا نہ یہ راکب گناہگار
سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں | ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار
اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور | فتنے کو آسمان نے کیا مجھ سے وہاں دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم | اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گذار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر | پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اسکے گرد و پیش | ساتھ اس سمندِ خرس نما کے ہو چشم چار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب | کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب | وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گذار
یہ کہہ کے حق ستی میں ہوا مستعد بہ جنگ | اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و سست و ضعیف و خشک | کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اسکو حریف پر | دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفلِ بے سوار
جب میں نے دیکھا جنگ کی یاں تو بندھی یہ شکل | لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

مرزا ہجو کے بادشاہ تھے، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، ترجیع بند، مثنوی
غرض کہ کوئی صنف اصنافِ سخن سے نہیں چھوٹی، جس میں اُنھوں نے اپنے دل کا بخار نکالا ہو
یوں تو بہت کم لوگ اُن کی شرر باری سے بچے ہونگے، مگر مکین، ندرت، فدوی، مولوی ۹
ساجد اور میر ضاحک کی تو جیسی مٹی پلید کی ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، یہ تمام ہجویں ان کے
کلیات میں موقع موقع سے شامل ہیں، اُن کو پڑھا کرو تو خاصا زعفران کا کھیت نظر آئیگا، جس کے
دیکھنے سے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجائیں گے۔

ان ہجووں کے پڑھنے سے جو خاص قسم کا اثر دل پر پڑتا ہے، وہ اُن کی قادرالکلامی اور
گرمیِ کلام کے زور کا ہوتا ہے، قصیدوں میں وہ واقعات کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم
کرتے ہیں کہ دوسرا شخص نثر میں بھی اس طرح سے نظم نہیں کرسکتا۔
مگر فدوی کے ہجو میں تو وہ جی کھول کر اور آنکھیں بند کرکے ایسا منھ آئے ہیں کہ اسکا معمولی
سا نمونہ بھی پیش کرنے سے طبیعت ہچکچاتی ہے، جس کو شوق ہو وہ کلیات اٹھا کر دیکھے۔

تغزل کا رنگ دیکھئے،

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

بیکس کوئی مرے تو جلے اُس پہ دل مرا — گویا ہے یہ چراغ غریبوں کی گور کا

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا — سنتا ہے اے دوانے جب دل دیا تو پھر کیا

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منھ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

رخصت ہو باغباں کہ ذرا دیکھ لیں چمن جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائیگا

چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہت گل پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
اس خرابی سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے تو کہے آج نکلنا میں کہوں کل جاؤں گا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجکو غیر پاس پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

کیا کرونگا ہاتھ سے جو روکے واعظ کے جام ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگس مخمور کا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

کدھر کو چھوڑ گئے مجکو ہمرہاں تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں تنہا

ترا تجھ سے نہیں ملتا مرا دل رہ نہیں سکتا غرض ایسی مصیبت ہو کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

اے لالہ گو فلک نے دیئے تجکو چار داغ چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

نہ زر نہ زور نہ طالع نہ تیرے دل میں رحم جو چاہے تجھ سے یہ دل کامیاب ہو معلوم

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں، یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

بوسہ ہنس کر نہ دیا اس نے سوائے دشنام سو بھی یہ جب نہ ملا کوئی تو مجبور نہیں

کیفیت چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ناوک سے تیرے صید نہ چھوٹا زمانے میں　　　تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اے مرغ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول　　　تو نے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانہ میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　　اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

کیا گلہ صیاد سے ہم کو یوں ہی گذری یہ عمر　　　اب اسیر دام ہیں تب تھے گرفتار چمن

جی تک تو دے کے لوں کہ جو ہو کارگر کہیں　　　اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں
ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھکو نیند　　　جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں
ساقی ہے یک تبسم گل فرصت بہار　　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

سخت مشکل ہے کہ ہر بات کنایہ سمجھو　　　ہے زباں میری بھی گفتار کروں یا نہ کروں

دل کو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں　　　آنکھیں جو مانتی نہیں میں اسکو کیا کروں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں　　　دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو انصاف　　　جھوٹی بھی تسلی ہو تو جیتا ہی رہوں میں

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ / تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں / اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

دل کو چاہا میں کہ خالی کروں مانند حباب / ہو گئی جان ہوا اک نفس سرد کے ساتھ

جو طبیب اپنا تھا اس کا دل کسی پر زار ہے / مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا / ہونی جو کچھ تھی قبلۂ حاجات ہو گئی
پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے و لے / دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہو گئی
مستی سے اس نگاہ کی اے محتسب خبر / دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی
سودا کسی کو وہ تو ستائے نہ بے سبب / کیا جانئے کہ تجھ سے ہی کیا بات ہو گئی

سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا / جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لئے

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی / اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
دل اس نے لیا مجھکو ملی دولت دیدار / کیا لوٹ کا سامان اودھر بھی ہے ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ / کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات / آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

نسیم بھی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے — ہماری خاک سے کچھ دیکھیو رہا بھی ہے
ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم — ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں — کہ اس جوار میں سودا برہنہ پا بھی ہے

بلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو — زاہد قسم ہے تجھ کو جو تو ہو تو کیا کرے
قاتل ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے
فکر معاش عشق بتاں یاد رفتگاں — اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

حسرت میں میں کہتا نہیں کیا کوئی کب ہے — اک دیکھنا ہے کہ وہ قہر ہے آفت ہی غضب ہے
کیا چیز ہے وہ دل جسے کہتے ہیں الٰہی — اک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہے
دشنام کے دینے کی قسم کھائی ہے لیکن — جیتے دیکھے ہے نہ وہ تجھکو یہ تعجب ہے

ہے قسم تجھکو فلک سے تو جہاں تک جا ہے — جلوہ حسن بتاں حسرت دیدار مجھے

سن رند کسی اور یہ بیداد کروگے — یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

عشرت سے دو جہاں پہ دل ہاتھ دھو سکے — تیرے قدم کو چھو سکے یہ نہ ہو سکے

اثر ہے آہ میں ہر چند نے تاثیر نالے میں
پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا جی بہلتا ہے

خواہ کعبے میں مجھے خواہ میں بتخانے میں
اتنا سمجھوں ہوں مرے یار کہیں دیکھا ہے

پھر نظر تجھکو نہ دیکھی کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کار سے دھر مرتے

رباعی

سودا اپنے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ باں کو تک تب
حاصل یہی اس سے نہ کہ تا دنیا ہو
بالفعل ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

میر محمد تقی میر

مجموعۂ قابلیت و ہنر، صاحب طبع خوش فکر، سر آمد مشہوران عصر، محاورہ دان و متین، متلاشی مضامین نو و رنگین، متجسس الفاظ چرب و شیریں، در میدان غزل پردازی گوئے فصاحت از معاصران می برد، ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پرکارہا دارد۔"
(۱۰ طبقات الشعراء)

اکثرے در فن شعر ریختہ او را بہ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند و اکثرے در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ بر وے فضیلت می دہند، غرض ہر چہ ہست استادی ریختہ مسلّم است۔" (تذکرۂ مصحفی)

محمد تقی نام، میر تخلص تھا، اُن کے والد میر عبداللہ شرفائے اکبر آباد سے تھے، سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے۔ کسی نے میر صاحب کو خانِ آرزو کا بھتیجا، کسی نے بھانجا لکھا ہے، آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب میر عبداللہ کی پہلی بیوی سے تھے، وہ مرگئیں تو خانِ آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی، اسلئے سوتیلے بھانجے ہوئے، جو کچھ بھی ہو میر نے خانِ آرزو کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔

خود میر صاحب نے نکات الشعرا میں خانِ آرزو کا ذکر بہت محبت و ادب سے کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں "استاد و پیر و مرشد بندہ است"۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں "ہمہ استادانِ معتبر فن ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوارند"۔ ایک اور جگہ لکھا ہے "تا حال ہمچوں ایشاں ہندوستان جنت نشان بہم نہ رسیدہ بلکہ بحث[1] در ایران می رود"۔

میر صاحب کی تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں، مگر اُن کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں استعداد اچھی تھی، اور استاد کی تربیت کا پورا فیض حاصل کیا تھا۔

دلی میں میر صاحب کی بہن میر محمد حسین کلیم کو بیاہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھیں، اور ان کے لحاظ سے کلیم کو بھی میر سے بہت محبت تھی، میر نے نکات الشعرا میں کلیم کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے اس سے ان دونوں کے باہمی خلوص و محبت کا پتہ چلتا ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے یہاں بھی آمد و رفت تھی، ان کے یہاں ہر مہینہ کی پندرھویں کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا، اس میں میر صاحب شریک ہوا کرتے تھے، اور خواجہ میر درد سے بہت خلوص

[1] آزاد کہتے ہیں کہ خانصاحب حنفی مذہب تھے، اور میر صاحب شیعہ، اس پر نازک مزاجی غضب کی، کسی مسئلہ پر ماموں سے بگڑ کر الگ ہوگئے، تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کی تصدیق یا تکذیب کرنا دشوار ہے، اس واسطے کہ جتنے تذکرے پیشِ نظر ہیں، ان میں کہیں اس سے بحث نہیں، مگر میر صاحب نے جو کچھ خانصاحب کے متعلق خیالات ظاہر کئے ہیں، اُن میں دیکھتے ہوئے اس واقعہ کو باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

تھا نکات الشعرا میں فرماتے ہیں "فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوز می شد، از زبانِ مبارکش
فرمودند میر تقی میر تو میر مجلس خواہی شد، الحمد للہ والمنۃ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتادہ"

اتفاقات زمانہ سے مشاعرہ کا سلسلہ خواجہ میر درد کے یہاں درہم برہم ہوگیا تو انھوں
نے میر صاحب سے فرمایا کہ اپنے یہاں مشاعرہ کیا کرو، چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں ہر مہینہ کی پندرہویں تاریخ
کو انکے یہاں مشاعرہ ہونے لگا، خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت فرماتے تھے، تذکرہ میں لکھتے
ہیں "مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ در تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است وارثش بذات بس بزرگ است"

خوب معلوم نہیں کہ دلی میں اُن کی گذر اوقات کا کیا ذریعہ تھا، مگر اتنا یقیناً معلوم ہے
کہ سلطنت کی تباہی اور مرہٹہ گردی میں جس طرح اور شرفا مفلوک و تباہ ہوئے میر بھی اسی
کشمکش میں مبتلا تھے، تاہم اُن کی وضعداری کی داد دینا چاہئے کہ مرزا رفیع سودا، میر سوز اور خدا
جانے کتنے لوگ پریشان ہوکر دلی سے نکل کھڑے ہوئے، کوئی فرخ آباد گیا کوئی لکھنؤ کوئی اور آگے
بڑھ گیا مگر جب تک ہو سکا میر صاحب دلی میں قدم جمائے بیٹھے رہے،

جب پانی سر سے گذر گیا تو ساٹھ برس کے سن میں بقول مرزا لطف ۱۱۹۷ھ میں دلی
چھوڑ کر لکھنؤ آئے، نواب آصف الدولہ[1] کا زمانہ تھا، ان کی تعریف میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا

[1] نواب آصف الدولہ یحییٰ علیخاں ہز ہائینس امۃ الزہرا بیگم کے بطن سے نواب شجاع الدولہ کے ایک ہی بیٹے تھے ۱۱۸۸ھ میں باپ کے مرنے کے بعد مسند وزارت پر بیٹھے، اودھ اور روہیلکھنڈ، صوبہ الہ آباد اور گورکھپور میں چکلہ کوڑا اور چکلہ اٹاوہ کا زرخیز علاقہ ترکہ میں پایا، مگر ناقابلیت کیساتھ مزاج میں عیش پرستی تھی، یہاں خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں زمام حکومت، دوسری طرف حریف سلطنت مدبر اور زمانہ شناس، نتیجہ یہ ہوا کہ جونپور بنارس غازیپور کے تین سرسبز و شاداب ضلعے سرکار کمپنی بہادر نے وزیر سے برضا و رغبت لے لئے، اور ان کے مرتے ہی آدھا ملک ان کے جانشین نواب سعادت علیخاں کی ہوس حکمرانی کے نذر ہوگیا صرف اودھ کے اضلاع باقی رہے جس کا الحاق واجد علی شاہ کے زمانہ میں سرکار کمپنی کے ممالک محروسہ سے ہوگیا،
نواب آصف الدولہ سات برس فیض آباد رہنے کے بعد لکھنؤ آرہے اور اسی کو دار الحکومت بنایا،

اور اس میں اپنی عزت اختیار کرنے کا پورا ماجرا بیان کیا۔ نواب نے اسی دن خلعت فاخرہ سے سرفراز کرکے تین سو روپیہ ماہوار ان کے لئے مقرر کردیئے جو مرتے دم تک ان کو ملتے رہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ) زمانہ کی عمارتوں میں عالیشان امام باڑہ جو اب تک قائم ہے جو لکھنؤ میں فن تعمیر کے لحاظ سے ایک اعلیٰ عمارت ہے۔ اس کو کفایت اللہ خاں دہلی کے مشہور مہندس (انجینیر) نے بنایا تھا۔ اس کا رومی دروازہ، بڑی مسجد، امام باڑہ کے اندر کی تین چھتیں اور بھول بھلیاں دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں گنی جاتی ہیں۔ اور دور دور سے اس کے دیکھنے کو سیاح آکر محو حیرت بن جاتے ہیں۔

آصف الدولہ میں جہاں کچھ عیوب تھے وہاں ایک صفت فیاضی اور سیر چشمی کی ایسی تھی جس سے وہ اپنے ملک میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ آج تک لکھنؤ کے دوکاندار ان کا نام لیکر صبح کو دوکان کھولتے ہیں۔ اور یہ فقرہ بطور ضرب المثل کے بولا جاتا ہے کہ "جس کو نہ دلائے مولیٰ اسے کیا دیں آصف الدولہ"۔

امام باڑہ وغیرہ جیسی نادر اور عالیشان عمارتوں پر کئی کروڑ روپیہ صرف کیا، پچاس لاکھ روپیہ سے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کرائی جس سے ان کا نام عراق میں بھی اسی نیکی سے لیا جاتا ہے جیسا کہ لکھنؤ میں۔

شعراء کی قدردانی میں بھی یہ اپنے پیشرو سے آگے تھے۔ میر سوز ان کے استاد تھے ان کی خدمت جو کچھ کرتے ہوں گے وہ معلوم نہیں۔ مرزا رفیع سودا کو چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر دی تھی۔ میر تقی میر کو تین سو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ علاوہ اس کے داد و دہش میں جب ادنیٰ ادنیٰ نفروں کو ہزاروں کی خلعت ملتی تھی تو ان کا کیا پوچھنا۔

نواب آصف الدولہ کے زمانہ کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو و لعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انہوں نے دل سے کوشش کی۔ ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے۔ وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہوگئے اور ان کو جاگیریں ملیں، اور جو اپنی ضد پر قائم رہے ان کی جاگیریں جو شاہان مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کی گئیں۔ شاہ علی اکبر مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کرکے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتدا میں ۱۳ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علیحدہ کرلیا اور نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے

آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب اپنی بد دماغی اور نازک مزاجی سے کسی بات پر نواب سے بگڑ کر گھر بیٹھ رہے، اور فقر و فاقہ میں زندگی گذار دی، ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ جب سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار چھوڑ چکے تھے، وہاں سے کسی نے طلب نہ کیا، ایک دن نواب کی سواری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۷) ہاتھ میں زمام مذہب دی؛

مگر افسوس ہے کہ نواب آصف الدولہ کو ان کی غفلت اور عیش پرستی نے انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رکھا تھا، اور اسی غم میں ان کی جان گئی، ادا نستہ انھوں نے ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے جلد بیمار ہوں، اور ایسے بیمار ہوں کہ جانبر نہ ہو سکیں، حکیم شفائی خاں دلی کے نامور طبیب، معالج تھے، ان سے پوچھا کر اور جو بتاتے اس کے خلاف عمل کرتے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ آرزو ۱۲۱۲ھ میں پوری ہو گئی، اور استسقا کی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا، (کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو)

آصف نہ چھپے طشتِ تباں دل سے ہمارے　　سو بار اگر پھر بھی بنا دیں اسے گھڑ کر

شوخیٔ چشم کی شہرت کو تری سن سن کر　　شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں

جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے　　آب سے آتش ہوئے کیونکر بہم کیا جائے

پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو　　میں ہوں اور رات ہے اور بسترِ تنہائی ہے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح　　ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے

جاتی تھی یہ تحسین کی مسجد پر برسرِ راہ بیٹھے تھے، سواری سامنے سے آئی سب اُٹھ کھڑے ہوئے، یہ اسی طرح بیٹھے رہے، سید انشا خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے، نواب نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ عرض کی یہ وہی گدائے متکبر ہے، جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے، گذارہ کا یہ حال اور مزاج کا یہ عالم، آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا، سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھیجا، میر صاحب نے واپس کر دیا، پھر سید انشا خود لیکر گئے، اور سمجھا بجھا کر راضی کیا کبھی کبھی دربار جانے لگے،

میرے نزدیک کچھ عجب نہیں کہ برسنی کی وجہت یا خود داری کے خیال سے کہ بے بلائے نہ جائیں دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا ہو، مگر یہ صحیح نہیں کہ گھر بیٹھ رہنے سے ان کی تنخواہ بند کر دی گئی اور فقر و فاقہ میں اُنھوں نے زندگی بسر کی، مرزا علی لطف میر صاحب کے ہمعصر ہیں، وہ گلشن ہند میں لکھتے ہیں کہ

> "اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک کہ سنہ ۱۲۱۵ھ ہے، وہی حال ہے"

اب تم غور کرو کہ بقول آزاد نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں میر صاحب گھر بیٹھ رہے تھے، اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو چکے تھے جب سعادت علی خاں نواب وزیر ہوئے تو انھوں نے ان کو پوچھا نہیں، چند دنوں کے بعد انشاء اللہ خاں کی مہربانی سے ان کو خلعت بحالی ملا، لطف یہ کہ سنہ ۱۲۱۵ھ میں خود انشاء اللہ خاں کی رسائی نواب سعادت علی کے دربار میں ہوئی ہے اور اس وقت تک بقول لطف ان کی تنخواہ جاری تھی، حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے وہ ان کے منہ پر چلتی نہیں کچھ شبہہ

نہیں کہ میر صاحب نازک مزاج تھے مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں، اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں خود ماغ سمجھے گا،

آزاد کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں میر صاحب نواب ۔۔ سے بگڑ کر بیٹھ رہے تھے ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے، نواب کی سواری سامنے سے آگئی، دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا کبھی تشریف بھی نہیں لاتے، میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا داب شرفا نہیں، یہ کیا گفتگو کا موقع ہے، اگر تھوڑی دیر کے لئے اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو میرے نزدیک جس کو خلل دماغ ہو گا وہی اس کو نازک مزاجی سے تعبیر کر سکتا ہے، ورنہ جس کی نسبت بیان کیا ہے اس کے پاگل ہونے میں کچھ شک نہیں،

آزاد کہتے ہیں کہ افسوس یہ ہے کہ ان کو اوروں کے کمال بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ تیرے شخص کے دامن پر بدنما دھبہ ہے۔ ایک جگہ اور کہتے ہیں کہ خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلاتا گناہ سمجھتے تھے کسی کی اور حقیقت کیا ہے: مگر جب اس کی جانچ ہم ان کی کتاب نکات الشعرا سے کرتے ہیں تو حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی کہ یہ بیان کس قدر واقعہ کے خلاف ہے، میر سجاد میر صاحب کے زمانہ میں ایک نوجوان شاعر تھے ان کی نسبت فرماتے ہیں "سخن او بپایۂ استادی رسیدہ" آگے ایک ایک شعر پر وجد کرتے ہیں اور سو جگہ لکھنے کی تمنا کرتے ہیں، سجاد کا شعر ہے ؎

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

میر صاحب داد دیتے ہیں "ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدن این شعر تو اجد دست بہم می دہد از بسکہ از خواندن این شعر حظے بر می دارم می خواہم کہ بعد بیاں نمائیم"

آزاد کہتے ہیں کہ سوز مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے جب میر تقی مرحوم میر کے تخلص سے

عالمگیر ہوئے تو انھوں نے سوز اختیار کیا۔ دوسرے مقام پہ کہتے ہیں کہ سوز نے ایک مشاعرہ میں کہا تھا کہ فقیر نے تو تخلص میر کیا تھا۔ مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کلام کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز اختیار کیا۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ میر سوز کے ذکر پہ میر تقی میر نے کہا کہ شرفا میں ہم نے ایسے تخلص کبھی سنے نہیں، اب دیکھو کہ میر صاحب خود کیا کہتے ہیں۔ "محمد میر میر تخلص جوانے ست بسیار اہل خوش طبع ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن زخوش کردن تخلص من انصاف دلم ازو خوش است" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے ان کا تخلص پسند نہیں کیا۔ بلکہ میر سوز نے پسند کیا۔ تاہم خوشدلی سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے یہ بعید ہے کہ جب وہ میر صاحب کی بزرگی کا لحاظ کر کے اپنا تخلص بدل ڈالیں تو میر صاحب فرمائیں کہ شرفا میں ہم نے ایسے تخلص کبھی سنے نہیں،

آزاد میر صاحب کے سلسلہ تصنیفات میں نکات الشعرا کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ وہاں بھی بنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے۔ اس کے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعریست از شیطان مشہور تر" نکات الشعرا چھپ گیا ہے۔ اور پیش نظر ہے اس کے دیباچہ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا۔ یہ بھی نہیں ہے کہ ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ولی کی نسبت فرماتے ہیں "... از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد" شیطان والا فقرہ سارے تذکرہ میں کہیں نہیں ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی نظر سے نکات الشعرا نہیں گذرا۔ اس قسم کے مضامین

جو آبِ حیات میں لکھے ہیں کسی مستند ماخذ سے لئے گئے ہیں، صرف قصے کہانیوں پر انکی بنیاد ہے یا بقول مولانا شروانیؒ قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں اور اپنی سحر بیانی

۵ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، حسرت تخلص، بھیکن پور ضلع علی گڈھ کے مقتدر رئیس، خوش رو، خوش خو، خوش گو، خوش اخلاق امیر ہیں، علوم و فنون عربیہ کی تعلیم مولوی عبد الغنی خاں فرخ آبادی، اور ان کے استاد مولانا لطف اللہ مرحوم سے پائی ہے، شعر و سخن کی مشق منشی امیر احمد مینائی سے کی ہے، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ فضیلت علمی کے ساتھ خدا نے ان کو ایسی صفتیں عنایت کی ہیں جن پر ہمیشہ مجھکو رشک آتا ہے، سب سے نمایاں صفت انکی متانت اور اصابت رائے ہے جس کی آزمایش نازک ترین مواقع پر ہو چکی ہے اور ہر موقع پر ایسے جوہر کھلے ہیں، جس نے سب کو متحیر کر دیا ہے، دوسری صفت ان کی انتظامی قابلیت ہے جس کے لئے خدا نے ان کو نہایت موزوں دماغ عطا فرمایا ہے، اور اس کا بہترین نمونہ اُن کی ریاست کا انتظام ہے جس وقت ان کے ہاتھ میں کام آیا ہے، ریاست زیر بار قرض تھی، چند روز میں اپنی انتظامی قابلیت سے لاکھوں روپیے کا قرض ادا کر کے زیر باری سے اسکو محفوظ کر دیا، یہ بھی تھوڑی بات نہیں کہ انکا قیام حیدر آباد میں ہے، سال میں دو بار مہینے مہینے ڈیڑھ ڈیڑھ مہینے کو آجاتے ہیں، مگر انتظام کے ایسے عمدہ اصول بنا دیئے ہیں کہ ہر کام ٹھیک وقت پر ہوتا رہتا ہے، تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ باوجود نوجوانی اور رنگین مزاجی اور دولتمندی کے مذہبی جذبات کی پرورش و پرداخت سے غفلت نہیں کی، عنفوان شباب میں قبلۂ ارشاد حضرت مولانا فضل الرحمٰن قدس سرہ سے بیعت کی اور شیخ الحدیث مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کو حبیب گنج میں تکلیف اقامت دیکر صحاح ستہ کی سند حاصل کی اور اپنے اوقات کا بہترین حصہ تفسیر و حدیث کی خدمت میں صرف کیا، چوتھی صفت یہ ہے کہ باوجود ان تمام مشغولیتوں کے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ایسے کاموں میں صرف کرتے رہے جن سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود وابستہ ہے، ندوۃ العلماء کی بنیاد ۱۳۱۱ھ میں پڑی، اسی سال اس کے رکن انتخابی منتخب ہوئے، اس وقت سے اب تک کہ ۳۰ سال کا زمانہ ہونے کو آیا ہے، اس کے رکن رکین ہیں، اور ہر ممکن ذریعہ سے مدد دینے میں پہلو تہی

سے سامعین کو خوش کیا ہے،

نکات الشعرا کی مدد سے نیز تذکرہ نویسوں کی تحریر سے میر صاحب میں جو اوصاف ہمیں نظر آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند، وضعدار آدمی تھے میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے، بات بہت کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں، نرمی اور ملائمت، مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی جیلا رحمت و بر سرکاری کے ساتھ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین، ہر وقت محویت کا عالم طاری، اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے،

سو برس کی عمر پائی تھی، آخر آخر میں بڑھاپے نے ان صفتوں کو اور بھی ابھار دیا تھا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۲) نہیں کرتے، علاوہ اس کے برسوں محمڈن کالج علی گڈھ کے ناظم امور مذہبی رہے، اور کئی سال سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ہیں اور ہر کام کو دلچسپی سے انجام دیتے ہیں،

۱۳۳۰ھ میں اعلحضرت محی الملۃ والدین آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی نگاہ دوربین نے دولت آصفیہ دکن کی صدارت کیلئے انکا انتخاب فرمایا، باوجودیکہ ان کو اس عزت و جاہ کے پیدا کرنے کی حاجت نہیں تھی مگر جیسا مجھے معلوم ہے صرف اس خیال سے کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کا نادر موقع ہاتھ آتا ہے، اپنی صحت اور انتظام ریاست کے بگڑنے کی پرواہ نہ کرکے اسکو قبول کرلیا، خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کو اتنی ہمت و قوت عطا فرمائے کہ وہ اپنی دماغی قابلیتوں کے لحاظ سے دولتِ اسلامیہ دکن کے بہترین مشیر و وزیر ثابت ہوں،

مجھکو ممدوح الصدر کی خدمت میں تیس برس سے نیاز حاصل ہے، اس وجہ سے مجھکو ان کے محاسنِ اخلاق کے دیکھنے اور جانچنے کا کافی موقع ملا ہے، اسی وجہ سے میں نے ان کے انہی اوصاف کا ذکر کیا ہے جن کا خاص طور پر میرے دل پر اثر ہے، ان کی علمی خدمتیں اتنی نمایاں ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہ علمائے سلف کے مصنف ہونے کی حیثیت سے نیز سیکڑوں اخلاقی اور تاریخی مضامین کے لحاظ سے جو برابر شائع ہوتے رہتے ہیں ہندوستان میں شہرت حاصل کرچکے ہیں، اور امید ہے کہ آیندہ اس سے زیادہ حاصل کریں گے،

اسی مناسبت سے دل کی گرفتگی بھی بڑھ گئی ہوگی. مگر تم اس بات پر غور کرو کہ محمد شاہی دور کا ایک بڑھا وضعدار شاعر جس کی عمر کا بیشتر حصہ اُن لوگوں میں بسر ہوا جن کی وضع قطع عادات واطوار نو سیکھوں پر حجت کی سند لیجاتی تھی، قزلباش خاں امید، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا جانجاناں مظہر، خواجہ محمد ناصر عندلیب، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، اور محمد حسین کلیم جنمیں کا ہر ایک مجموعۂ قابلیت و ہنر تھا، ان کے ساتھ ہر وقت کی صحبت، علمی مذاکرے اور جلسوں کی گرمجوشیاں اور عفت و پرہیزگاری، شرم و حیا، مروت و ہمدردی، وضعداری اور دوستی کے اگلے آئین و قوانین کے ساتھ جو ہماری قومی زندگی کی علامتیں تھیں، ایک کارندہ سر سے میں جو ایسا بے نظیر اور قابل تقلید عمل درآمد تھا جس کی تعریف کرنے سے زبان و قلم کا حوصلہ تنگ ہے،

دیکھنے کی بات ہے کہ جب اسی شخص پر مصیبت پڑتی ہے تو یاران صحبت میں سے ایک ایک کر کے پیوند زمین اور کوئی آوارۂ دشت غربت ہو جاتا ہے اور مرہٹوں کی دست برد سے ایک عالم آشوب ہنگامہ برپا ہوتا ہے جس سے شہر میں خاک اڑنے لگتی ہے اس وقت اس کے پائے ثبات کو بھی لغزش ہوتی ہے، وہ ایسے شہر میں وارد ہوتا ہے، جہاں نئے انداز نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوانوں کو دیکھتا ہے، اُن کے مشغلوں[1] کو دیکھتا ہے اُنکے جذبات وخیالات کو

---

[1] میر صاحب کے کلیات میں ایک مثنوی ہے جس میں لکھنؤ کی مرغ بازی کا خاکہ اڑایا ہے یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا ہے، اور نواب کو مرغ بازی کا بہت شوق تھا اسی وجہ سے گھر گھر اسی کا چرچا تھا اور ہفتہ میں دو بار شہر میں پالیاں ہوتی تھیں، چند شعر اس مثنوی کے ملاحظہ ہوں، ان شعروں سے میر صاحب کی دلی کیفیات کا اندازہ ہو سکتا ہے

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

جا پہنچا ہے۔ ان کی طبیعتوں کی شوخی زبانوں کی طراری اختراعوں اور ایجادوں کے انوکھے پن سے سابقہ پڑتا ہے، پھر تم ہی کہو کہ اس بیچارے بڈھے پرانی لکیر کے فقیر کے دل پر کیا گذرتی ہوگی اس سے یہ شبہ نہ ہوسکتا ہوگا کہ وہ جرأت اور انشا کی شوخیوں اور مرزا سعادت یار خاں کی جدت پسند طبیعت کی رنگینیوں کو سن کر داد سخن دے، ور پھتیوں کی آواز میں خود بھی آواز ملائے اسی کو بد دماغی کہہ لو یا نازک مزاجی جس سے خود میر صاحب بھی واقف تھے چنانچہ ایک مخمس کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ | دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ | ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

(بقیہ حاشیہ صفحہ) مرغے لڑتے ہیں، ایک دو لاتیں | سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
انی پر جھاڑ رہے پھڑکنے لگے | انی کی نوک پہ اکڑنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ کج ہیں | ساتھ اس کے بدلتے ہیں پیچ دپیچ
مرغ کی زیاں پر فشانی ہے | ان کی صد رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ | ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں | لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک سا کے منھ میں مرغ کی منقار | ایک کے لب پہ نا سزا گفتار
منھ بہ منھ جو کچھ سو بکنے لگے | تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے | بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پہ بغل میں ہاتھ مرغ | لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

اگر جرأت و انشا کو تم خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا ہمرتبہ خیال کرتے ہو تو میر صاحب بے شبہہ اس بات کے گنہگار تھے کہ وہ ان کی شوخیوں پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، میں کہتا ہوں کہ ان میں فضل و کمال کے ساتھ خودداری کا نہ ہوتی تو ان نوجوانوں سے پگڑی بچانا مشکل پڑ جاتا جن میں سے ایک بھانڈوں سے برابر کی چوٹ لڑ سکتا ہو، اور دوسرے کی رذل اور فحش ہجووں کا ایک ایک مصرع ہزار تیغی اور چابک کا تڑاقا ہو، پھر ان کی بھی یہی گت بنتی جو غریب مصحفی کی بن کر رہی،

ف انشاء اللہ خاں اور مصحفی میں جو چوٹیں چلیں وہاں تک تو غنیمت تھیں جس حد تک شاعری کو دخل تھا اس کے بعد جو معرکے ہوئے اور آزاد نے نمک مرچ لگا کر بیان کئے ہیں، ان کو آب حیات میں پڑھو، خلاصہ یہ کہ سید انشا نے بہت سی رذل اور فحش ہجویں کہیں کہ جن کا ایک ایک مصرع بقول آزاد ہزار تیغی اور چابک کا طراقہ تھا بڈھا بیچارہ اپنی شیخی کی جریب اور عصائے غرور کے سہارے سے کھڑا ہو کر جتنا کر سکتا تھا، مقابلہ کرتا رہا جب نوبت حد سے گذر گئی تو اس کے شاگردوں سے لکھنؤ بھرا پڑا تھا، منتظر اور گرم سب کو لیکر اٹھ کھڑے ہوئے جو کچھ ہو سکا شاگردی کا حق ادا کیا، ایک دن شہدوں کا سوانگ بھر کے ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کی طرف روانہ ہوئے، ان کو خبر پہلے لگ گئی، اپنے یاروں کو لیکر استقبال کو نکلے، اور ان کو مکان پر لائے، خود دوبارہ پڑھوایا، شیرینیاں کھلائیں، شربت پلائے، ہار پہنائے اور عزت و احترام سے رخصت کیا (آزاد نے کوئی شعر اس ہجو کا نقل نہیں کیا، یہ یاد رکھنے کی بات ہے) اب سنو سید انشا نے جو اسکا جواب حاضر کیا وہ قیامت تھا یعنی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان کے ساتھ ترتیب دیا، اور عجیب غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا، ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے اور اشعار پڑھتے جاتے تھے، جن میں کا ایک شعر یہ ہے، ؎

سوانگ نیا لایا ہے دیکھا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں یہ بات نئی لکھی ہے کہ جب کلکتہ میں جان گلکرسٹ صاحب کی کوشش سے حکام کو اُردو زبان کی سرپرستی کا خیال ہوا، تو لکھنؤ سے بھی زبان دانوں کی مانگ ہوئی تو سب سے پہلے کرنل اسکاٹ کے سامنے میر صاحب کی تقریب ہوئی۔ مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہیں ہوا، میر شیر علی افسوس ایک نوجوان شخص بھیج دیئے گئے۔

میر صاحب کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان ریختہ غزلوں کے ہیں۔ چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ متفرق اشعار پر اُردو مصرعے لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے، رُباعیاں مستزاد چند صفحے، پانچ قصیدے، چند مخمس اور ترجیع بند، چند مخمس شکایت زمانہ میں، اور واسوخت ایک ہفت بند، بہت سی مثنویاں، ایک دیوان فارسی کا ہے جس میں دو ہزار شعر ہیں۔

میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں، قصیدے کے مرد میدان نہیں۔ آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ اُن کے قصیدے کم ہیں، اور اسی قدر درجہ میں کم ہیں۔ واسوخت لاجواب ہیں، فارسی میں فغانی یا وحشی، اُردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے۔

تذکرۂ نکات الشعرا شعرائے ریختہ کے حال میں ہے، فارسی میں لکھا ہے، سنہ تصنیف مجھے نہیں ملا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ کے زمانہ میں لکھا ہے۔ اور انجمن ترقی اردو نے اسے چھپوا دیا ہے۔ میر صاحب نے سو برس کی عمر پائی اور ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اب کوئی نہیں جانتا کہ لکھنؤ میں ان کا مزار کہاں پر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ بلکہ اکثر امرا نے سید انشا کا ساتھ دیا، اور حریف کا منھ ایک دفعہ کوتوال سے کہہ کر رکوا دیا۔ اس بات سے مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا، جس کی جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا　　سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

کلام ملاحظہ ہو۔

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا | بیچارہ گریہ ناک نہ گریباں دریدہ تھا

صیاد! دل ہے داغِ جدائی سے رشکِ باغ | تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھتا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے | ہے خیر میر صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر | تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا | دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ | نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا | ہم نے جانا تھا کہ بس اب یہ تو ناسور گیا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے | کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اُس کے عشق میں | دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

فلک کو منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا
ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے
خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق
میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

جہاں کو فتنہ سے خالی کبھی نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی
جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

آتی گذری جو مری ہجر میں سو اُس کے سبب — صبر مرحوم عجب مونس تنہائی تھا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا — جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا — جو کچھ کہ یاں ہو سو افسوس ہے جوانی کا

میر کے دین مذہب کو کیا پوچھتے ہو اُن نے تو — قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم — ہے خدا جانئے یہ کب کی بات

نظر میر نے کیسی حسرت سے کی — بہت روئے ہم اسکی رخصت کے بعد

مرگ اک زندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

منتظر قتل کے وعدہ کا ہوں اپنے یعنی — جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز

اُس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر — شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں

چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

اک بیمار جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

کاشکے دو دل تو ہوتے عشق میں ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں ایسی جنت گئی جہنم میں

بیقراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا میر کی وضع یاد ہے ہم کو

کہتے ہیں میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو

ہوگا کسی دیوار کے سایے میں پڑا میر
کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

یوں رفتہ اور بے خود کب تک رہا کرو گے
تم اب بھی میر صاحب اپنے تئیں سنبھالو

خطرے بہت ہیں میر رہ صعب عشق میں
ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دیں کو کھو رہو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر
جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

پہونچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر — اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

پاس ناموس عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

بارے سعی کیجے تو مر رہیئے میر — بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

آتے کبھی جو واں سے تو یاں آتے تھے اداس — آخر کو میر اس کی گلی ہی میں جا رہے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دوری بتاں سے — آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ — افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مقدور تک تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں — منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

واعظ ناکس کی باتوں پہ کوئی جاتا ہے میر — آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پہ گئے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میر عشق میں — جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے ۔ لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

شعر کا سلیقہ ہے یہ اک امر ہیں ۔ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

سو گئیں آنکھیں شرم آلودہ خاک میں ہم کو ملا گئیں ۔ کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی اوپر دیر جائیں گی

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں ۔ اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

او دواسیاں ہتیں مری خانقہ میں قابل پیر ۔ صنم کدہ میں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہے

خواجہ میر درد علیہ الرحمہ

زبان گفتگو یش گرہ کشائے زلفِ شام، عا مصرع نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کاکل صبح تو تماشا طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستان انداز است گاہے در کوچہ باغ تلاش بہ طریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید، در چمن شعرش نقط رنگیں چمن چمن گلچین خیال او را گل معنی دامن دامن شاعر زور آور، ریختہ در کمال علاقگی وارستہ خلیق متواضع آشنائے دست اشعر فارسی ہم می گوید اما شہرہ رباعی گرمی بازار وسعت مشرب اوست (از نکات الشعراء)

اکثرے از دستِ عسرت پریشان شدہ بہ طرفے افتند لیکن آں ثابت قدم تکیہ بر توکل نمودہ قدم از جا بر نداشت تا حال در شاہجہان آباد مقیم است، دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب۔ (از تذکرہ میر حسن)

"خواجہ میر درد کی غزل سات شعر، نو شعر کی ہوتی ہے، مگر انتخاب ہوتی ہے، خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے، گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ خیالات ان کے تین تھے، مگر کسی کی سمجھ میں زبان آ جو وہ نہیں ہوتی۔ تصوف جیسا انھوں نے کہا، اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔" (آب حیات)

سید خواجہ میر نام، دردؔ تخلص تھا۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے۔ گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاءالدین نقشبندی اور پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ انتیس برس کے سن میں دنیا سے منہ موڑ کر والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ سلطنت کی تباہی، آئے دن کے قتل و غارت کے سبب سے اکثر امرا و شرفا کے گھرانے گھر اور شہر چھوڑ کر نکل گئے، مگر ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی۔ اللہ پر توکل رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا، اس پر بیٹھے رہے۔

علوم و فنون میں طاق تھے۔ تصوف اور موسیقی میں اچھی مہارت تھی۔ دلی کے بڑے بڑے باکمال گویئے، اپنی اپنی چیزیں بہ نظرِ اصلاح لا کر سنایا کرتے تھے۔

ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی، اس میں علما و مشایخ اور اکثر امرا شرکت کرنا فخر سمجھتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ بھی کئی بار اس میں شریک ہوئے ہیں۔ ایک بار بغیر اطلاع کے چلے آئے، چونکہ پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکے، ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ خواجہ صاحب اس بے ادبی کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا یہ امر فقیر کی داب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا، اور معافی مانگی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے خواجہ صاحب کے استغنا کا اندازہ کرو۔ حقیقت یہ ہے

کہ وہ اپنے فضل و کمال کے ساتھ قدیم متانت اور تہذیب کی ایک مجسم تصویر تھے، ضبطِ نفس، استقلال اور قناعت اُن کی مشیخت کا طرۂ افتخار تھا،

اسرار الصلوٰۃ ایک رسالہ ہے، جو پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے، واردات درد نام ایک دوسری کتاب ہے جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں، نالۂ درد، آہِ سرد، درد دل، سوزِ دل، شمعِ محفل وغیرہ، اس کی شرح میں علم الکتاب جیسی کتاب تصنیف کی، اگر اُن کے فضل و کمال کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہو تو علم الکتاب کا مطالعہ کرو، ایک رسالہ بحث غنا میں لکھا ہے، ایک دیوان فارسی میں ہے، ایک ریختہ میں، میرے عزیز دوست نواب نور الحسن خاں مرحوم[1] نے اپنی حسنِ عقیدت سے یہ سب کتابیں چھپوا دی ہیں،

[1] یادش بخیر نواب نور الحسن خاں مرحوم امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر کے بڑے بیٹے جمال الدین خاں بہادر مدار المہام بھوپال کے نواسے، نانا کی طرح عالی حوصلہ، فیاض، سیر چشم اور اپنے زمانے کے نامور ذہین، ذکی، قوی الحفظ اور سریع الادراک تھے، ۱۷ رجب ۱۲۷۸ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد و دیگر علما و محدثین سے علوم آلیہ و عالیہ کی تحصیل کی، اور افتخار الشعراء حافظ نعمان محمد خاں شہیر سے مشقِ سخن کی،

ایک مدت تک اپنے والد اور نواب شاہجہاں بیگم والیۂ بھوپال کے سایۂ عاطفت میں نہایت عیش و آرام سے زندگی بسر کی، بچپن سے مزاج میں بے تعلقی اور وارستگی تھی، جمال الدین خاں بہادر کے بعد نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ نے چاہا کہ ان کو مدار المہام مقرر کریں، مگر اس کو منظور نہیں کیا، حقائق و معارف کے دلدادہ تھے، مطالعہ یا مذاکرہ میں صرفِ اوقات کرنے کو پسند کرتے تھے،

نواب شاہجہاں بیگم کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی اور اسی بے تعلقی اور وارستگی میں زندگی بسر کر دی، اخیر زمانہ میں گوناگوں امراض میں مبتلا ہو جانے خصوصاً اختلاجِ قلب و خفقان کی وجہ سے کاوشِ فکر کی عادت جاتی رہی تھی، مگر اس پر بھی تھوڑے تامل کے بعد نہایت آبدار شعر کہہ لیتے

آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے، میرے نزدیک میر صاحب پر یہ
بہتان ہے جس کو آبِ حیات میں آزاد نے چمکا کر دس پانچ جگہ بیان کیا ہے، میر صاحب کی
رائے خواجہ صاحب کے باب میں ہے، اس کو پڑھ چکے، نکات الشعرا چھپ گیا ہے، اس کو دیکھ لو،

(بقیہ حاشیہ صفحہ [illegible]) زود نویس ایسے تھے کہ جب بیٹھ جاتے تو جزو دو جزو ایک جلسہ میں لکھ ڈالتے تھے، زود نویسی کے ساتھ
خوش قلم بھی تھے، اور ان دونوں باتوں میں اپنے والد نامدار کی یادگار تھے، ذہن نہایت سلیم تھا، حافظہ کی یہ کیفیت
تھی کہ تیس پینتیس برس پہلے حدیث شریف کی کتابیں پڑھی تھیں، مگر موقع آجاتا تو متن اور اسناد کے ساتھ روایت
پیش کر دیتے،

فیاضی اور سیر چشمی میں اپنے نانا کے نظیر تھے، امیر فقیر بچہ بوڑھا جو آتا اس کو کچھ دیئے بغیر نہ رہتے، اور دینا
بھی وہی جو اس کے مناسب حال ہو، اور دیتے بھی اس طرح سے کہ ایک ہاتھ سے دیں دوسرے کو خبر نہ ہو، ان کے
بچوں کو معلوم نہ تھا کہ بیوی کو کیا دیا اور بیوی کو معلوم نہ تھا کہ بچوں کو کیا دے آئے، اسی پر باہر والوں کا قیاس کرو،
بڑی خصوصیت ان کے دینے کی یہ تھی کہ دیتے اس طرح سے تھے کہ لینے والے کو شرمندگی ہوتی اور اسکو
بغیر لئے نہ بن پڑتا، دینے کی اور کوئی تدبیر نہ پڑتی تو جس کسی کو کچھ دینا ہوتا، اس کی کسی شکستہ اور بوسیدہ چیز کی تعریف
کرتے اور کہتے کہ یہ مجھے بہت پسند ہے، میری فلاں چیز سے بدل لیجئے، وہ کہتا بدلنے کی کیا ضرورت ہے، آپ اس کو
یونہی قبول فرمائیے تو اسکو نہ مانتے اور بدل کر چھوڑتے اور اس کو دوسرے وقت کسی اور حاجتمند کو دیدیتے،

دسترخوان وسیع تھا، اور مزیدار کھانوں کے تیار کرانے کا شوق تھا، اپنے باورچی خانہ میں ہر روز طرح
طرح کے کھانے پکائے جانے کا حکم دیتے، علاوہ اس کے شہر میں جہاں کہیں ہوشیار رکابدار آجاتا بلا کر اس سے
پکواتے یا عرب و عجم سے کوئی سیاح آجاتا اس سے ترکیبیں پوچھتے اور پکانے کی فرمائش کرتے، اور بے تکلف دوستوں کو مدعو
کرکے خود بہت کم کھاتے، مگر دوسروں کو اصرار کرکے کھلاتے،

مرنے سے تقریباً پندرہ سال پہلے مجھ سے شناسائی ہوئی اور وہ یوماً فیوماً اتنی بڑھی کہ انکو بغیر مجھ سے ملے

خواجہ صاحب کی زبان اور طرز وہی ہے جو میر کی ہے، قصیدہ کی طرف مائل نہیں ہوئے

اس وجہ سے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے اس کو ہجو سے کیا نسبت۔ غزلوں کا دیوان بقول

بقیہ حاشیہ صفحہ ... چین نہ آتا تھا، روز ایک دو بار خود تشریف لاتے اور گھڑیوں بیٹھتے اور اس فکر میں رہتے

کہ مجھکو اپنے ساتھ لیجائیں،

گھر میں اگر کبھی کسی کو چھینک آگئی اور ان کو معلوم ہوگیا تو فوراً تشریف لاتے اور کہتے کہ چلئے فلاں مریض

کو دیکھ آئیں، وہاں پہنچتے تو اکثر ایسا ہوتا کہ علمی اذکار یا کھانے پینے کے شغل میں سارا وقت کٹ جاتا اور کسی مریض کے

دیکھنے کی نوبت نہ آتی، اور کچھ بہانہ نہ ملتا تو حسب معمول صبح سے آکر مطب میں بیٹھ جاتے، جس وقت پھر چھٹ جاتی

کہتے کہ میں نے فلاں کتاب نئی منگوائی ہے، چل کر دیکھو یا میں نے تمہارے لئے ماش کے فلاں فلاں کھانے پکوائے

ہیں، غرضکہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ لیجانے کا تلاش کر لیتے، مگر باوجود اس کے کہ ہر وقت یکجائی رہتی وہ پاس اور

ادب کا رکھ رکھاؤ، خیر وقت تک اتنا قائم رکھا جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا، میں ان سے عمر میں چھوٹا اور

فضیلت علمی میں کم پایہ تھا، مگر محبت کا قانون سب سے نرالا قانون ہے، خدا جانے کیوں وہ میرا ادب کرتے تھے، کاہے میں

کبھی میرے پاس نہیں بیٹھے، مکان میں تکیہ سے لگ کر نہیں بیٹھے، میرے سامنے کبھی ننگے سر نہیں بیٹھے، کبھی لیٹے نہیں، کبھی بغیر سہارے

بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو دوسرے کمرے میں چلے جاتے، وہاں تھوڑا سا آرام کرکے پھر آکر بیٹھ جاتے، مرض الموت میں بھی باوجود

شدت تنفس جس وقت میں جاتا گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرتے اور خود نہ اٹھ سکتے تو آدمیوں کو حکم دیتے کہ ہم کو اٹھا کر بٹھا دو

میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس وضعداری کو اب ترک کر دیں، مگر نہیں مانا، صرف اس وقت لیٹے جب سکرات کی حالت میں

اٹھ نہ سکتے تھے، اور حیف صد ہزار حیف کہ گنج خوبی ۔۔ محرم ۱۳۳۶ھ کو پیوند زمین ہو گیا،

مرحوم کو خواجہ میر درد سے بہت عقیدت تھی، ان کی تصنیفات جہاں تک مل سکیں نالۂ ... آہ سرد

سوز دل، شمع محفل، ایک مجموعہ ہیں، علم الکتاب جو مجلد ضخیم ہے، دیوان فارسی اور مجموعہ رباعیات فارسی اپنے

صرف سے، ان کے والد کی کتاب نالۂ عندلیب دو جلدوں میں سرکار عالیہ بھوپال سے کر چھپوائیں ان کے علاوہ دیگر

میر حسن کے مثل دیوانِ حافظ کے سراپا انتخاب ہے، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میر و مرزا کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔

خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ روز جمعہ اڑسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ دلی میں ان کا مرقد منور ترکمان دروازے سے باہر زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ہو گیا مہمان سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دلِ خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
ذکر میرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات — پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

درد ہم کو یہ رات دن تیرا — نالۂ زار خوش نہیں آتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۸) مصنفین کی بہت سی کتابیں چھپوائیں، خود بھی صاحب تصنیف تھے، اردو فارسی کلام کا مجموعہ گلزار عشق، اردو شعرا کے کلام کا بہترین مجموعہ اور مجموعہ رسائل تصوف بار چھپوا کر تقسیم کئے تھے۔

تو اپنے دل سے غیر کی اُلفت نہ کھو سکا　　میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر　　میں نے تو درگذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

ہے کدورتی انھیں کی طرف سے وگرنہ میں　　اک عمر سے اسیر ہوں زلفِ دراز کا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک　　اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا درد بس　　جی میں نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی　　جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لئے　　اے چشمِ اشکبار یہ کیا تجھکو ہو گیا

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا　　ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا
یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرا ہے　　غم رہ گیا کبھو، کبھو آرام رہ گیا
سو بار سوزِ عشق نے دی آگ پر ہنوز　　دل وہ کباب ہے کہ جگر خام رہ گیا

دل بھی اسے درد قطرۂ خوں تھا　　آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا — یعنی کبھو تو اپنے بھی دل تھا دماغ تھا

جانیے کس واسطے اے دوست [illegible] — [illegible] سی ہے اپنے دل کے [illegible]

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو — اب کس کو زندگی ہی تو تجھ بہار تک

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر — مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

مدت [illegible] جہاں میں ہنستے پھرا کئے — [illegible] ہے خوب [illegible] پھوٹکر ہمیں

جو اہل دید ہیں انھیں گلشن میں جا نہیں — نرگس کی طرح آنکھیں [illegible] پر سوجھتا نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلا کرتا نہیں — دل میں [illegible] وفا پر جی وفا کرتا نہیں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز — گلا تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو — کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

اپنے بندے پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے
دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی کا سنگ ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تندخو ہے

کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے
تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اگلے معانقے کو اگر کیجئے معاف
لگ جائیے گلے سے مکافات کیلئے

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے
معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

روندے ہے مثلِ نقشِ قدم خلق یاں مجھے
اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجے کیونکر ایک تو یار ہے اور تس پہ خدا بھی ہے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف جس کے ہاتھ آئے جام سو جم ہے

رباعی

اے درد یہ درد جی کا کھونا معلوم جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

سید محمد میر سوز

"میر تخلص جوانے است بسیار اہل خوش طبع۔ ہر چند طرز علحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصفت دلم از و خوش است" (نکات الشعرا)

"بسیار نازک طبع، زود رنج، نکتہ سنج مردے عجیب ہست و تخلصے غریب موید طرز علحدہ شعر را با دلے نادر کہ دست و چشم بلکہ تمام اعضا در حرکت می آیند می خواند و مردم نافہم را متوجہ جانب خود می گرداند" (طبقات الشعرا)

"در عہد خود از جملہ ابداں ممتاز طرز اداؤ ملک اوست و خواندن اشعارش از زبان او نیکو از خواندنش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید" (تذکرہ میرحسن)

سید محمد میر نام، سوز تخلص، میر ضیاء الدین کے بیٹے۔ اور قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں نشو و نما پائی۔ تعجب ہے کہ گلشن بے خار میں انکو لکھنوی لکھا ہے ایک طرح سے یہ بھی سچ ہے کہ یہ لکھنؤ میں آکر پیوند خاک ہوئے ہیں

خط شفیعہ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے، شہسواری اور تیر اندازی میں خوب ماہر تھے، ورزش کرتے تھے اور طاقت خداداد ایسی تھی کہ ہر ایک ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلے میر تخلص کرتے تھے، جب میر تقی میر کی شہرت نے میر کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تو انھوں نے سوز اختیار کیا۔

آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ میر تقی صاحب ریختہ گویان ڈھائی شاعر مانا ہے ایک خود ایک مرزا رفیع سودا۔ آدھے خواجہ میر درد، یا آدھے میر سوز، یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، خواجہ میر درد کے حال میں اس کو میں لکھ چکا ہوں،

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ میر سوز کی شاعری کو اس زمانہ کے شعرا خاطر میں لاتے تھے میر صاحب کا قول "دیکھو ہر چند طرز علیحدہ دارد" میر حسن کی بھی سنو "دیگر شعرایش نیز خوش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید" شیفتہ نے کھل کر کہدیا ہے "کلامش از جادۂ مستقیم شعرا برکران" مگر انصاف یہ ہے کہ آزاد کی رائے اس میں بے لاگ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میر سوز کی زبان عجب میٹھی زبان ہے، اور حقیقت میں غزل کی جان ہے۔ ان کی انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے، البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے

شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی تو میر سوز بھی گھبرا گئے، سیدھے فرخ آباد گئے، اور نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں کچھ دنوں زندگی بسر کی، اس کے بعد لکھنؤ آئے یہ رنگ نہیں جما، مرشد آباد گئے، وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی، پھر لکھنؤ واپس آئے ابکی تقدیر چمکی، نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہو گئے، چند روز آرام سے نہ گذری تھی کہ سنہ ۱۲۱۳ھ میں ستر برس جی کر دنیا سے گذر گئے۔

اہلِ ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا — آہ یا رب راز دل اُن پر بھی ظاہر ہو گیا

نہ پہنچی کیوں ہوئے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک چیں جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

قسمت سے یہ بےگنہ رہتی ہے اپنے اس لئے — ہاتھ میں آپ کے ورنہ تو دامانِ قاتل ہوئیگا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کریگا — جو قسمت بتاں ہوگا سو اثر کریگا

سوزؔ کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو — وہاں تجھے کیا تھی کمی یہاں تجکو کیا درکار تھا

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا — نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سے کچھ باور نہیں آتا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ — دیکھا مزا نہ تونے نادان عاشقی کا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا — تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر — سوزؔ کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص ہے عاشق کہیں — عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

منہ دیکھو آئینہ کا تری تاب لا سکے
خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

اشکِ خوں آنکھوں میں آکر جم گئے
دور کی بھی دیکھنے سے ہم گئے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

جوں خضر ہوس عمرِ ابد کی نہیں مجکو
اُس دم کی تمنا ہے جو تجھ پاس گذر جائے

پرکار کی روش پھرے ہم جتنے چل سکے
اس گردشِ فلک سے نہ باہر نکل سکے

شیخ قیام الدین قائم

"بسیار آدم با مزہ و اہلِ درد متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، خوش مقال و در سخن باکمال، از خوش خیالانِ زمان و بلند فطرتانِ جہان فکر رسا دارد و در نازک خیالی و معنی یابی دادِ سخنوری می دہد" (طبقات الشعراء)

"در پختگی کلام و چستی مصراع غزل در ریختہ قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بہ دوش استاد راہ می رفت، بلکہ بعضے بمقام رجحان می جست" (تذکرۂ مصحفی)

قیام الدین علی نام تھا، قائم تخلص، چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے، مگر ملازمت

کے تعلق سے زندگی کا بیشتر حصہ دلی میں بسر ہوا، نوجوانی میں اسامی تھی تحصیل علم کا حال معلوم نہیں، مگر اس قدر استعداد ضرور تھی کہ اپنی انشا پردازی میں فضل نہیں آنے دیتے، اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خانوادوں کے لئے عام تھا۔

دلی اس زمانہ میں آج کی سی دلی نہ تھی، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، میر محمد تقی میر، سید محمد میر اثر، حکیم ہدایت اللہ وغیرہ جیسے ارباب کمال کا جمگھٹا تھا اور شاعری کا ہنگامہ گرم تھا، ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے چند دنوں ان سے فیضیاب ہو کر مرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے، اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ ان کے طرز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

دلی کی تباہی کے بعد وطن واپس آئے اور کچھ دنوں نواب محمد یار خاں[۱] کے ساتھ ٹانڈہ

[۱] نواب محمد یار خاں امیر تخلص، نواب علی محمد خاں مورث نوابان رامپور کے چوتھے بیٹے، اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی تھے، اونولہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے، وہاں بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا، میر سوز اور مرزا رفیع سودا کو فرخ آباد بلایا تھا، وہ نہیں آئے تو شیخ قیام الدین کو بلا کر سودا و میر کا ہو ادا نکلے کہ دو اور ان سے مشق سخن کی، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، فدوی لاہوری، میر محمد نعیم پروانہ، علی شاہ، میاں عشرت، حکیم ابو الحسن سنبھلی وغیرہ شعراء بھی ملازم تھے اور رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، ان کے حکم سے عاقل خاں معمورنے ایک مرقع تیار کیا تھا جس میں نواب اور ان کے حاشیہ نشین شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں،

مرہٹہ گردی میں یہ تمام لوگ بنات النعش کی طرح منتشر ہو گئے، اور نواب کو فیض اللہ خاں اگر رامپور لے گئے، اور پچاس ہزار سالانہ ان کی جیب خاص کے لئے مقرر کر دیا، ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی،

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا	یارب برا ہو اس دل خانہ خراب کا
ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے	ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا
گر وقت ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا	پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زبان چلے

میں زندگی بسر کی، جب ان کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، اور احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی، جب تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آ گئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام لے گئے، جو وہ ملکیتیں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا،

اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے اور وہیں سنہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کر گئے،

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

غیر سے ملنا تمھارا سُن کے گو ہم چپ رہے
پر سنا ہوگا کہ تم کو اک جہاں نے کیا کہا

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون
پیامبر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنے قائم
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے میں آپ ہی من گیا

قائم ضرور کیا ہے اب اُس جنگجو سے صلح
مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفانِ گریہ کی ہے مرے حد عمرِ نوح
دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اُتر گیا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

جلوہ ہر رنگ میں ہے اس بت ہرجائی کا — یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری — مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی — اس سے جو کوئی جیا تو مر کر

تم کو کیا قدر ہے اے دیدہ مرے رونے کی — ایک بوند آتی ہے سو خون جگر سے باہر

جو سوز عشق کا چرچا وہاں نہیں قائم — تو کیا میں جاؤں لگا دینے بہشت میں آتش

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن — بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

تجھ بن جہان میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں — ہے یوں تو زلف یار بھی پر اس قدر نہیں

تنگ تو ہم کو تو اے جیب کرے ہو لیکن — اٹھ گیا ہاتھ گر اپنا تو پھر اک تار نہیں

آ گئے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی — سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

جورِ سپہر، دوریِ یاراں، ورودِ غیر — جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

ایک مدت سے یہاں وہ تو موا پھرتا تھا — آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو

تھا بد و نیک جہاں سے میں عدم میں آزاد — آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھکو

اس حسنِ نیرنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ — ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

دامانِ گل تئیں ہے کہاں دسترس مجھے — تکلیفِ سیرِ باغ نہ کر اے ہوس مجھے

بعد خط آنے کے تھا اس سے وفا کا احتمال — ایک واں تک عمر نے اپنے وفاداری نہ کی

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پہ اس طرح — دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

خدا نہ کردہ اسے غیر سے نہیں سروکار — تھی ایک بات ہمارے ہی یہ جلانے کی

کسی بلا میں پھنسے قید ہوئے جان سے جائے — پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم — مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

یہ شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم — پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے جو ابھی ہے — اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

گو ہم ملے[۵] تم سے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے — کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

مر جایئے کسی سے پر الفت نہ کیجئے — جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

فلک جو دے تو خدائی بھی اب نہ لے قائم — وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

تا بفلک نالہ تو پہونچا تھا رات — میں ہی کچھ قصد کا ذکر کر گیا

انعام اللہ خاں یقین

"جوانے بود خوش رو و خوش گو، خوش خلق و قابل مسطور نظر و تربیت کردۂ مرزا مظہر موصوف"

---

۵ حسرت کے مطبوعہ دیوانِ قائم میں یہ شعر اس طرح ہے،

ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے — کہنے کو رہ گیا یہ سخن دن گذر گئے

وعیب سخنوران جوانی پیداش نسبت تقصیرے کہ از یقین بوقوع آمدہ باشد گشت یقین است کہ مغفرتش شدہ باشد۔ (طبقات الشعراء)

"سبب عروج ریختہ گوئی بر طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و زیر انعامش سرزدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ والسنہ جاری است" (از تذکرۂ فتح علی شاہ)

"در زمرۂ ہمہ گویاں اول کسے کہ ریختہ را فصحتہ و رفتہ ایں جوان بود بعد ازاں تتبعش بہ کمال رسید، چنانچہ خود می گوید:۔

حق کو یقیں یاد رہ باد مت دو آتش ۔۔۔ طرز سخن کے اس کے تئیں رتبہ ہی یہاں پہنچا

انعام اللہ خاں نام تھا، یقین تخلص، نواب اظہر اللہ خاں کے بیٹے حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی کے پرپوتے اور جناب مرزا مظہر کے شاگرد رشید تھے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام کے زور میں وہ دوسروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، میر صاحب ان سے بہت خفا ہیں، نکات الشعراء میں لکھتے ہیں:۔

"مقصر بوجہ چندے کہ یافتہ است کہ ما دشمنیم لوائم یافت ایں قدر تو دیدہ ام کہ غرورش فرعون پیش او ہیچ است بر زمین می گذارد، بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقۂ سخن فہمی مطلق ندارد"

میر صاحب کی زبردستی دیکھو یقین کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ شہادت ہے، ایسے سخن گو کی سخن فہمی کا انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے اچھا نہیں لگتا اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کچھ لوگ سرے سے یقین کے کلام کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقین کو شعر کہنا ہی نہیں آتا تھا، محمد حسین کلیم نے اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

یقیں کے شعروں پہ ہیں بدگماں لیتے ہیں نام اس کا ۔۔۔ غلط ہے ہم نے بوجھا ہے کہ مرزا جانجاناں جو

مگر میر صاحب نے باوجود ناراضی کے اس سے انکار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہد و او ایں شعرہائے ریختہ خود گردانیدہ اند

قبول کردن این حیثیت بندہ ماخندہ می آید کہ ہمہ چیز بہ وارث می رسد الا شعر مثلاً کسے کہ شعر بد خود

یا مضمون او متصرف شود بہ کسی اور اوزد خواہد گفت تا بہ شعر استاد چہ رسد"

مصحفی کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵ برس سن میں یقین کا کلام تمام ہو گیا، اگر جیتے رہتے

تو میر ہوں یا مرزا ہوں کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔

کلام ملاحظہ ہو۔

ہر گھڑی صحرا نشینی پر نہ کر جرأت یقین | آگئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

آشنا کوئی جہاں میں کوئی بے وفا نہ ہو | ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقین ہے سزا تری | بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ | یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا ناصح | کہ میں تو مست تھا اس کو بھی کیا شعور نہ تھا

فصلِ گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقین | اب کی چلتا ہے جنوں پر بھی ہمارا بے طرح

ہمارا آخر ہوئی ہو اب تو سینے دے گریباں کو | یقین کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

ناصح سے مجکو غم نے کیا شرمسار حیف ۔ سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق ۔ اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

یہ سینۂ عشق ہے سے محروم درد و داغ نہیں ۔ ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

یقیں مارا گیا جرم محبت پر نہ ہے طالع ۔ شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح ۔ خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کہیں

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے ۔ کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے ۔ نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر ۔ کرنے کو کی یہ راس نہ آئی وفا مجھے

عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جوں کوہکن ۔ جانِ شیریں دیجئے تب خوابِ شیریں کیجئے

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا ۔ بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

یقیں کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا — یہ دیوانہ تو ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہیے

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچے کا — چمن پر یہ کیا ستم کرتا ہے لے بادِ صبا کوئی

شبِ ہجراں کی وحشت کو تو لے بیدرد کیا جانے — جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے

گریباں چاک کرنے کو کسی کے کیا تجھے ناصح — ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

خفا ہے سخت مر کر یار کیوں دیجے رقیبوں کو — ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

سخت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے — جی ہی لے کر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

یقیں جاتا رہا گر بلبلوں کے ہاتھ جانے دو — کوئی اس بے مروت گل کو اپنے پاس کیا رکھے

پڑیں پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بےکس — مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اٹھا لائے

یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم — نہ اٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

خواجہ حسن اللہ بیانؔ

"شاعر عذب البیان از خوشگویان زمان خواجہ حسن اللہ المتخلص بہ بیان از تلامذہ مرزا مظہر جانِ جاناں، مولدش شاہجہان آباد احال معلوم نیست کہ کجا است زیج نامہ از و مشہور است بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد" (تذکرہ میر حسن)

خواجہ حسن اللہ نام بیان تخلص، اصلی وطن اکبرآباد تھا، دلی میں پیدا ہوئے، اور مرزا مظہر جانِ جانجاناں علیہ الرحمہ کے آغوشِ تربیت میں ان کی شاعری نے ترقی کی، مولانا فخر الدین دہلوی کے مرید تھے، آخر عمر میں حیدرآباد گئے، اور نواب آصف جاہ ثانی کی سرکار میں عزت سے زندگی بسر کی،

خوش خلق، پاکیزہ سیرت، ظریف طبع اور لطیف مزاج تھے، دوستوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے، اور جو ایک بار ان سے ملتا وہ ہمیشہ ان سے ملنے کا متمنی رہتا،

۱۲۱۳ھ میں وفات پائی، اور حیدرآباد میں مدفون ہوئے، ان کے شاگرد رائے گلاب چند ہمدم نے تاریخ کہی، "استاد از جہاں رفت"

ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے، اور ہندوستان میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے،

ان کے کلام کے دیکھنے سے پرانے تذکرہ نویسوں کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب اصولِ شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے، ان کے کلام میں نمکینی اور رنگینی ایسے غضب کی ہے کہ شعر کو پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے، دور از قیاس استعاروں اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک صاف ہے، اور سادگی میں بھی اس کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان کر دیجائیں

کب تلک اس کی شکایت نہ ہو اپنے آتش
کب کیا نہ بتر مجھ سے اور سب سے آشنا

کوئی کسی کا یہاں آشنا نہیں دیکھا
سوائے اپنے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

کیوں آج سماتا نہیں سینہ میں خوشی سے
پہنچا ہے مگر دل کو جھے پیام کسی کا

خانماں کچھ ہم بھی رکھتے تھے کبھو لیکن یہاں
اب یہی ہے یہی گھر فنا؟ لعنت خراب

تو بزم سے اُٹھا تو ہوئی تلخ مے کشی
پینے کے دن شراب کو سمجھا حرام آج

کہتا نہیں میں عرش پہ اے نالہ جا پہنچ
کانوں تلک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ

ہمارا ضعفِ بصارت ہے مانعِ دیدار
وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آ سکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاں اب مجھکو اپنی آہ پر

ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

صاف منہ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اُسکے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہی میرا جس کے پاس

جانے دے مجھکو اے ہوس سیر گلستاں
اب اس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف

ہووے گا ذوق حسرت دیدار میں خلل
شیریں اگذر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

ہوئی آہ اب اس قدر نارسا
کہ سینے سے آتی نہیں لب تلک

تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی
مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو تو کافر ہوں

کافر ہو جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو
اک مختصر سی جا ہو میں ہوں بس اور تو ہو

قمار عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے
اسے کہتے ہیں جیتا جو کوئی یاں نقد جاں ہارے

رسوا گلی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے
آتا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی سے ابھی دم نہیں لیا
پھرنے چلا ہے یہ دل وحشی ادھر مجھے

مت پوچھ اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹا روز گذر جائے گی شب بھی
اب ہجر میں کہتا ہے کہ تھا وصل میں آرام
نالاں ہی یہاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

ہزاروں قصر جنت کے برابر میں سمجھتا ہوں
اگر گردوں دوں آسودہ زیر خاک رہنے دے

فرشتوں کی عبادت کا مصلیٰ ہے مرا دامن
اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دے

شبِ فراق کی دہشت سے جان جاتی ہو
یہی ہے صبح سے ڈر کہ رات آتی ہو

جانتا ہے یار کچھ تو بیاں منھ سے بول دے
اے بے نصیب مانع گفتار کون ہے

نہ تجھے مرے آغوش سے جدا نہ کرے
یہ بات گفتہ … ہوئے ہو دل خدا نہ کرے

کیجئے عرض حال گو کچھ ہو
نہیں رہتی زبان پر آئی

کیا ہوا عرش پر گیا نالہ
دل میں اس شوخ کے تو راہ نہ کی

میر محمد باقر حزیں

"میر محمد باقر حزیں تخلص، شاعرِ ریختہ است صاحبِ دیوان از نصیریاں مرزا جانجاناں مظہر شنیدہ می شود کہ بنگالہ رفت" (از نکات الشعرا)

"طبع رسا و فکرے والا داشت و در ملکِ سخنوری علم شاہی می افراشت. غنچۂ استعدادش از نسیم انفاسِ مرزا مظہر شگفتہ بود" (تذکرۂ فتح علی شاہ)

میر محمد باقر نام تھا، حزیں تخلص، دہلی کے رہنے والے اور جناب مرزا مظہر علیہ الرحمہ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، مرزا صاحب کو بھی ان سے بے حد لطف تھا، دیوان میں جہاں کہیں اُستاد کا ذکر کرتے ہیں، اس سے اُن کے اخلاص و عقیدت اور مرزا صاحب کے

لطف و کرم کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی ہے تو　　　حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

ایک اور موقع پہ فرماتے ہیں ؎

ہے تری شکر کہ ہے صحبت ارباب جنوں　　　فیض سے حضرت استاد کے دیوان میرا

افسوس ہے کہ مصائب روزگار سے تنگ آکر انھیں آخرکار دلی چھوڑنا پڑا،

عظیم آباد پہنچے، وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی قدردانی کی، اور انہی کی سرکار میں فراغت کے ساتھ زندگی بسر کی، اب تک کسی تذکرے میں ان کا [illegible] میری نظر سے نہیں گذرا

دیوان ان کا کہیں کہیں پایا جاتا ہے، جس میں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں،

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت معنی یاب و فکر رنگین رکھتے تھے، اور سوز و گداز کی چاشنی بھی ان میں کسی سے کم نہیں،

خوب سمجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا　　　معتقد دل سے ہوں اس دل کی میں دانائی کا

یاد ہے کہ باغ سے رخصت ہوئی نہیں کر بہت　　　کہا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جور یار آخر　　　ہمیں رنج و الم سے ہو گئی صحبت برآر آخر

تم ہی اے باغباں بلبل کو مانع گل کے لینے سے　　　نہیں رہنے کی گلشن میں بہار آخر سدا ہرگز

آتی ہے نو بہار دھڑکتا ہے دل کہ ہائے　　　پھر شور و شر کرے گا یہ خانہ خراب دل

فصلِ گل آخر ہوئی کیا دیکھ ہونگے شاد ہم — کچھ کرا ے صیاد اب ہونگے نہیں آزاد ہم

بیوفائی دیکھ کر ان خوش نگاہوں کی حزیں — اب کسی سے اس طرح ملنے کو میرا دل نہیں

آرزو میں عشق کی ہوتی نہ دیکھیں سر براہ — کوہکن بھی سر پٹک کر مر رہا آخر وہیں

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار — اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں
ویراں ہوا حزیں اس سے چمن یاں تلک کہ اب — چاہیں کہ بلبل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

نہ وصل میں اُسسے راحت نہ ہجر میں آرام — کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں

کچھ کہا شاید اُس نے قاصد سے — دل پہ میرے وہ اضطراب نہیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ — اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

کچھ کٹے ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گذرے — کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گذرے

ہر نصیحت میں تری مانونگا اے ناصح پر ایک — دلبروں کے دیکھنے میں دل مرا ناچار ہے

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں یہ کیا کروں / رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشمِ تر مجھے

راحت میں دل کے ہاتھ نہ پائی تھی ایک دم / جب تک کہ میرے ساتھ یہ خانہ خراب تھا

حوتیں میں دردِ دل کا کس طرح ظاہر کروں اس سے / مجھے کہتا ہے تیری بات مجھکو خوش نہیں آتی

وفا میری اگر جور و جفا تجھکو نہ سکھلاتی / تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت

"ہدایت تخلص از دہلی است، ریختہ را بہ طرز می گوید، از یاران خواجہ میردرد است، اگرچہ ظاہر بہ عجز و انکسار پیش می آید اما کمیت خامۂ او در عرصۂ میدان سخن بال بستہ راہ می رود" اھ ([illegible])

"مشاق قدیم معاصر و ہم طرح محمد قائم شریک دور تیر و مرزا شاگرد بلکہ مرید خواجہ میر درد نور اللہ مرقدہٗ، شخصے است بسیار حلیم و سلیم، شعر را بسیار بہ فصاحت می گوید، عمرش از شصت متجاوز خواہد بود، صاحب دیوان است" (اھ تذکرہ مصحفی)

ہدایت اللہ نام، ہدایت تخلص تھا، خواجہ میر درد کے فیضانِ صحبت سے دل کو روشن کیا اور شعر و سخن کی مشق بھی انہی سے کی، طبابت میں نام بر آورد۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم ان کے شاگردِ رشید تھے ۱۲۱۵ھ میں واصل بحق ہوئے، علاوہ دیوان ریختہ کے بقول مرزا لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے،

نہ رحم اس کے ہی جی میں نہ دل میں اپنے صبر / ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہو گا

دیکھ اس کی چشمِ مست کو دل تو بہک گیا — بس پھر تو جام وہ ہی پیالوں میں چھلک گیا
دیکھا نہیں ہے ہم نے بہت دن سے ان کو دوست — شاید کسی جگہ پہ دل اس کا اٹک گیا

ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں — کسی نے خوب کہی ہے جو اس سے چھوٹ گیا

کیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں — یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا
بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں — میں اتنی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

اک دن بھی مہرباں نہ وہ بے وفا ہوا! — اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا!

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک — پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

رہا مرتے مرتے مجھے غم کسی کا — نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا
کیا تیغ قاتل نے جب کام اپنا — میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

کس دل جلے کی خاک سے گزری چمن میں آج — دیکھا عرق فشاں میں نسیمِ بہار کو

تجھ بن تو چاہتا نہیں جی سیرِ باغ کو — لگتی ہیں ٹھیس نکہتِ گل سے دماغ کو

تم نہ فریاد کسی کی، نہ فغاں سنتے ہو | اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے | گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یاں رہے

کیا کہوں میں کہ ترے ہجر میں کیونکر گذری | وہی جانے ہے مری جان کہ جس پہ گذری

دن جو گذرا تو مجھے روز قیامت سے دراز | رات گذری تو شب ہجر سے بدتر گذری

میر محمد بیدار

"قریب چہار دہ سال شدہ باشد کہ فقیر او را در لباس درویشی در شاہجہان آباد دیدہ۔ جمع درد مند داشت، باریک و سخنی، بہ زیور علم و حیا آراستہ معلوم نیست کہ الحال کجا است۔"

(از تذکرہ میر حسن)

میر محمد علی نام بیدار تخلص، مگر شہرت میر محمدی کے نام سے ہوئی، دلی وطن تھا، وہیں نشو و نما بھی ہوا، مرتضی قلی بیگ فراق سے فارسی اور حضرت خواجہ میر درد سے اردو میں مشق سخن کی، پھر مولانا فخر الدین دہلوی کے فیضانِ صحبت سے بہرہ ور ہوئے، اور طریقۂ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی ورزش کرنے کے بعد خرقۂ خلافت پہنا، جب تک دلی میں رہے، عرب سرائے میں قیام تھا، ہر روز اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں آتے جاتے تھے، آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے، اور وہیں کٹرہ دندان فیل میں سکونت اختیار کر لی، دو دیوان یادگار چھوڑ کر ۱۲۰۹ھ میں وفات پائی اور آگرہ میں مدفون ہوئے، میر و مرزا کے ہمعصر تھے، جب انھوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدار نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ

قدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علیحدہ کر لیا، ان کے اشعار دلآویزی کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں، ع

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است

واہ واہ اے دلبرِ کج فہم یوں ہی چاہیے ۔۔۔ ہم سے ہونا آشنا غیروں سے ہونا آشنا

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار ۔۔۔ گل جدا سرو جدا نرگسِ بیمار جدا

کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک ۔۔۔ اک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا

پیدا نہ راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی ۔۔۔ صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

کروں ہوں شاد دل اپنا ترے تصور سے ۔۔۔ اگر یہ شغل نہ ہوتا تو کیا کیا ہوتا

اے شانہ کھولیو گرہِ زلف دیکھ کر ۔۔۔ دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

چھوڑ کر کیسے بتاں جاتا ہے تو کعبے کو ۔۔۔ جلد پھر تو تجھے بیدار خدا کو سونپا

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک ۔۔۔ دل سے نہ ترے غبار نکلا

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا ۔۔۔ ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا

دامن کو ترے نہ پہونچے اب تک ہرچند غبار ہو گئے ہم

بے پر پرواز سے بیدار نے فصلِ بہار کس توقع پر قفس سے ہوویں اب آزاد ہم

یہ بھی کوئی وضع ہے آنے کی جو آتے ہو تم ایک دم آئے نہیں گذرا کہ پھر جاتے ہو تم

صورت اُس کی سما گئی دل میں مو آہ کیا آن بھا گئی دل میں مو

ہم تری خاطرِ نازک سے حذر کرتے ہیں ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

شکوۂ کم نگہی آنکھوں سے اس کی نہ کرو گفتگو خوب نہیں مردمِ بیمار کے ساتھ

اب تک مرے احوال سے واں بیخبری ہے اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

کس باغ سے آتی ہے بتا مجھکو کہ یہ آج کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیم سحری ہے

ربط جو چاہیئے بیدار سو اُس سے معلوم مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن کون سی شب نہیں گذری مجھے روتے روتے

کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

جام و مینا و سے و مطرب و ساقی ہمراہ اس سرانجام سے بیدار کہاں جاتا ہے

بیدار کیونکر آتشِ دل اشک سے بجھے ظاہر کی آگ ہووے تو پانی بجھا سکے

نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے

میر قدرت اللہ قدرت

"مردے ست از متوسلانِ میر شمس الدین فقیر، درویش وضع خلیق طبع، رتبۂ قدرش رفیع، وشیوۂ معانیش بدیع، ہمسند طبعش در میدانِ فارسی و ہندی چالاک و چست و تصویر بے نظیر معانیش در استخوان بندی الفاظ درست، بندہ وے را یک بار در مشاعرۂ لکھنؤ دیدہ ام"

(از تذکرۂ میر حسن)

میر قدرت اللہ نام قدرت تخلص، میر شمس الدین فقیر کے عزیز قریب اور شاگرد رشید تھے دلی وطن تھا، اس کی تباہی کے بعد چندے ادھر ادھر پھرے، آخر کار مرشد آباد میں سکونت اختیار کر لی، وہاں کے امرا و شرفا نے اعزاز و اکرام سے ان کا خیر مقدم کیا، اور بہت فارغ البالی سے زندگی بسر کی،

میر تقی میر شاید ان سے ناخوش ہیں، فرماتے ہیں" و عاجز سخن است، لیکن برائے خاطر میر عارف کہ از یاران درست فقیر است نوشتہ شد" اس کے بعد ایک شعر نکات الشعرا میں

درج کیا ہے، ممکن ہے کہ قدرت کا بہترین کلام میر صاحب تک نہ پہنچا ہو، یا اُن کی کسی بات پر بگڑ گئے ہوں، اور ان کو یارانِ بزم میں شریک کرنا پسند نہ کرتے ہوں، قدرت کے قادر الکلام ہونے میں کچھ شک نہیں، ایسے شخص کو عاجز سخن کہنا میر صاحب کی زبردستی ہے، قدرت نے غالباً سنہ ۱۲۵ھ میں وفات پائی، اور مرشد آباد میں مدفون ہوئے،

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے　　　شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا

جب مسیحا دشمنِ جاں ہو تو کب ہو زندگی　　　کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

مجھکو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی　　　آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

اوپر سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے ولے　　　ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

یہ دلِ شوریدہ جب سے ساتھ ہے زیرِ زمیں　　　شورِ محشر ہی رہا قدرت کی مشتِ خاک پر

شایستہ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا　　　اے وائے میں قدرت نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں

زخم پر زخم لگے تب ہو تسلی دل کی　　　حوصلے پر مرے اک زخم کچھ افزود نہیں

تو بھی کم ابرِ بہاری سے نہیں اے چشمِ تر　　　کر دے اب رشکِ چمن خونِ جگر سے آستیں

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذری ہے — یہ حسرت دل زار تو تسکیں اور چشم پرخوں ہے

حسرت اے صبح تمہیں ہم سے چمن چھوٹے ہو — دل دوست شام غریبی کہ وطن چھوٹے ہے

سینہ اس کا ہے دل اس کا ہے جگر اس کا ہے — تیر بیداد صد ضرب تیغ کرے گھر اس کا ہے

قطعہ

کل مجھ کو اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — کیا ہی ملک روم و کیا ہی سرزمین طوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے — چل دکھا دوں تو کہ جس سے آرزو محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف — جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و مکنت دنیا سے آج — کچھ بھی ان کے ہاتھ ہے غیر از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پاسے خم لکھتے تھے تسبیح ریا — آج رہن جام سے پھر خرقہ ناموس ہے

میر ضیاء الدین ضیا

"ضیا تخلص متوطن دہلی جوانے است مہذب مودب متواضع با فقیر ربطے بسیار دارد" (نکات الشعراء)

"شعرش بر دل و جگر عاشقاں نشتر زارے است و برائے سوختگان عشق شرارے اکثر غزل در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامعقول را مقبول ساختن کار اوست" (تذکرہ میر حسن)

ضیاء الدین نام تھا، ضیا تخلص، دلی کے رہنے والے اور مرزا رفیع سودا کے ہمعصر تھے

مگر معلوم نہیں مشق کس سے کی ہے،

دلّی کی تباہی کے بعد فیض آباد چلے آئے تھے، کچھ دنوں وہاں رہے اور کچھ دنوں لکھنؤ میں، اس کے بعد عظیم آباد پٹنہ میں جا کر بیٹھ رہے، گوشۂ عزلت کے دلدادہ تھے، آشنا پرست اور رنج و راحت میں ہمیشہ خوش رہتے، اصناف سخن میں سے غزل کو پسند کیا تھا، قصیدہ و مثنوی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوئی، سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا شوق تھا جس میں شعر کا سر سبز ہونا ہر کسی کا کام نہیں،

عظیم آباد میں راجہ شتاب رائے کا بیٹا ان کی ضروریات زندگی کا متکفل رہا، وہ ان سے مشق سخن بھی کیا کرتا تھا، سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا،

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگ عشق
اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جاوے گا

برس لے ابر جتنا چاہیے تو اب شیری باری ہے
کبھی دل تھا تو میں بھی رو رو اک دریا بہاتا تھا

رو دیں ہم بزموں کو کیا اپنے دل تنگ ہیں
شمع محفل تھے جو کل سو داغ کے اب ٹھیرے ہیں

رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ حد تک نہیں
ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

آہستہ پاؤں رکھیو سنے یوسف مزار پہ
سوتے ہیں اس زمیں میں ناز نین نازک بدنے

کسی دشمن کا بھی یارب الٰہی نہ ہو تنہا
کہ جیتے جی جس سے میرے وصل کا یہ دن گزرتا ہے

راز دل میں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں ‏ ‏ ‏ ‏ بات منھ پر آ رہی ہے اور لب ہلانا منع ہے

آہ آہ بچ کر نہ کہیں دل تھلک پڑے ‏ ‏ ‏ ‏ یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا ‏ ‏ ‏ ‏ آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

رُباعی

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے ‏ ‏ ‏ ‏ کیا ناز و نیاز جاودانی کرتے

گر یار کے بس اپنے ہوتا تو ہم ‏ ‏ ‏ ‏ کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے

دوسرا دور

متوسطین شعرائے اردو کا

سید محمد میر اثر

"درویشے است موقر، صاحب سخن است موزوں فہم و فاضل، رتبہ قدرش بہ غایت بلند و کوہ صدرش نہایت ارجمند، در خدمت برادر بزرگوار خود گوشہ نشینی اختیار کردہ و قدم بر جادہ بزرگان خود نہادہ بسر می برد" (از تذکرہ میر حسن)

دیوان قلیل حجم دارد ملاحظہ شد بعض خیالات ایشاں بہ قصوی غایت دردمندانہ و دلپذیر مطبوع واقع شدہ، مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ ہست" (از گلشن بیخار)

سید محمد میر نام تھا، اثر تخلص، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے، اور خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی، بڑے بھائی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، اور انھی کے نقش قدم پر چلتے تھے، علوم و فنون اساتذۂ دہلی سے حاصل کئے تھے، تصوف، موسیقی، حساب اور دیگر فنون ریاضیہ میں ان کا جواب نہ تھا،

فنون ریاضیہ کی تعلیم خواجہ احمد دہلوی سے پائی تھی، جو مرزا خیراللہ مہندس کے شاگرد تھے، یہ وہی مرزا خیراللہ ہیں جن کے اہتمام سے دلی میں محمد شاہی رصد قائم ہوئی تھی، اور زیج محمد شاہی کے مصنف ہونے کی حیثیت سے وہ دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں،

میر اثر نے اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد کے بعد آبائی سجادہ کو زینت بخشی، اور مدت دراز تک اپنے ظاہری و باطنی کمالات سے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہے۔ تقویٰ، توکل، زہد و قناعت میں کسی طرح اپنے باپ اور بھائی سے پیچھے نہیں رہے۔ تصوف و شاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے وہی ان کا سمجھنا چاہیے۔

تصنیفات میں ایک دیوان غزلوں کا ہے، ایک مثنوی جو اپنے رنگ کی اردو میں پہلی مثنوی ہے اس کا نام خواب و خیال رکھا ہے، کہا جاتا ہے کہ نواب مرزا شوق نے زہر عشق، بہار عشق، وغیرہ مثنویوں میں اسی مثنوی کا تتبع کیا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گذری۔ مرزا لطف نے کچھ اشعار اس کے اپنے تذکرے میں نقل کئے ہیں، مگر صحیح اندازہ کسی مثنوی کے حسن و قبح کا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی ایک پوری داستان پیش نظر نہ ہو، خواجہ محمد میر کی تاریخ وفات مجھے نہیں ملی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ سے پہلے انھوں نے رحلت کی ہے۔

منتخب اشعار

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ ‏ — ‏ یہ دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہوگیا
دیکھیں گے اس کی سنگدلی کو ہم اے اثر ‏ — ‏ گر کوئی نالہ ہم سے سرانجام ہوگیا

اُس سنگدل کے دل میں تو نالے نے جا نہ کی ‏ — ‏ کیا فائدہ جو اور کے جی میں اثر کیا

بے وفا تیرا کچھ نہیں تقصیر ‏ — ‏ مجکو میری وفا ہی راس نہیں
تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینہ ‏ — ‏ ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں

یہ دن خدا کی حسن ادائی برحق ہو　　　پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

عاشقی اور عشق کی باتیں　　　سب جہان سے تیرے ساتھ گئیں

وہ تو چھپنے لگا ہے تک اب درگذر کریں　　　یہ ہم نہیں اس آہ میں یا آسمان نہیں

جی میں ہے از سر نو جور تیرے یاد کریں　　　تو سنے یا نہ سنے نالہ و فریاد کریں
ہم اسیروں کی اسے چاہیئے خاطرداری　　　دور اٹھے نہ کہ ہم خاطر صیاد کریں

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا　　　تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے　　　اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

وہی میں ہوں وہی اثر دل ہے　　　اب خدا جانے کیا ہوا مجھکو

ہر دم فزوں ہیں کج روییاں روزگار کی　　　پر کچھ سیکھتا چلا ہے روش میرے یار کی

غرض آئینہ داری دل سے　　　تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہے

اور تو کوئی نہیں دام و قفس دامنگیر — تنگ آیا ہوں بہت دل کی گرفتاری سے

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا — دشمنی پر تو یہ ستانا ہے

آپ ہی نہ جل بیٹھے کچھ اس میں او — اس پہ تہمت ہے کہ ہم نے بھی آہ کی

آپ چھپ چھپ دیکھنے کے مرے سب ہوش گئے — بے خود ہوں جب سے تو نے ادھر اک نگاہ کی

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی — تری کون سی بات پر جائیے

ہمیں حیرت ہے آپ ہی تجھکو دیویں کیا جواب اسکا — کہ تجھ بن اب تلک کس طرح ہم نے زندگانی کی

آپ بیٹھے لوگوں سے کہوں کہاں میری مجال — پوچھئے تو احوال میرا کس کو کیا پڑی

کب کب گلی میں تیرے ہم بے قرار آئے — سو بار جی سے جا کے تب ایک بار آئے
ہر چند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آئیں — آخر نہ رہ سکے ہم بے اختیار آئے

تیرے کوچہ میں دوبارہ خوب ہم ہو کر چلے — ڈھونڈنے کو دل کے آئے جان بھی کھو کر چلے

کلیجہ پک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیالِ خام آتا ہے،

شیخ بقاء اللہ بقا

جوان میرزا با خلق و ظریف مزاج و قانع و ذہن طبع متوطن ... بجرأت نو بیبا ... قادہ در شاہجہان آباد و با میر درد در لکھنؤ با مرزا رفیع سوداگری ہا کردہ، وقت طبع خود را ظاہر نمودہ (از تذکرہ مصحفی)

در مراتب نظم طبع شگفتہ و رنگین و طرز بامزہ و شیرین و اشعار متحرک بہ قند فارسی ہم کام زبان را حلاوت آگیں نمودہ، پارسی شاگرد مرزا فاخر مکین و در ریختہ از تلامذہ شاہ حاتم و خواجہ میر درد نوشتہ اند (از گلشن بیخار)

بقاء اللہ نام، بقا تخلص، حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے اور اکبرآباد کے رہنے والے تھے، دلی میں پیدا ہوئے، اور لکھنؤ میں جا بسے، اسی وجہ سے ان کا وطن بعضوں نے لکھنؤ کو قرار دیا ہے، طبیعت فن شعر کے لئے بہت مناسب تھی، فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے، اور غمگین تخلص کرتے تھے، جب ریختہ کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو شاہ حاتم کی خدمت میں پہنچے، اور شاہ صاحب کے ارشاد سے بقا تخلص اختیار کیا، شاہ حاتم نے ان کو اپنے شاگردوں میں شمار کیا ہے، اور فتح علی شاہ حسینی نے اپنے تذکرہ میں خود انہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ وہ خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے، ممکن ہے کہ دونوں سے مشق سخن کی ہو، میر و سودا، دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، دلی میں میر صاحب سے الجھے اور لکھنؤ میں سودا سے،

بقا کا شعر ہے،

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سن کر کہا یا توارد ہوا، ع

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں — سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

اس پہ بگڑ کر بقاؔ نے یہ قطعہ کہا ؎

میرؔ نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا — اے بقاؔ تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو

یا خدا میرؔ کی آنکھوں کو دوآبہ کردے — اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

ایک اور موقع پر کہا ہے ؎

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ — اور بستی نہیں یہ دلّی ہے،

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں :۔ ؎

میرؔ و مرزاؔ کی شعر خوانی نے — بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی

کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی

کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن — ایک تو تو کہے ہے اک ہے ہے

بقاؔ نے زندگی بہت بے مزہ گذاری، افلاس سے تنگ آ کر کسی کی رہنمائی سے تسخیر کواکب کے اعمال شروع کئے تھے، اُس نے سودائی بنا دیا، جب ہر طرف سے مایوس ہوئے تو ۱۲۰۲ھ میں عتباتِ عالیات کی زیارت کو چلے، راستہ میں موت نے اس ارمان کو بھی نکلنے نہ دیا،

ہم نفس کوئی نہ دیکھا ہے کسی میں اے بقاؔ — آشنا صورت مگر معنی میں وہ بیگانہ تھا

یار کو پہنچی خبر نالۂ تنہائی کی — مدعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا

ساقی کو دو نوید، بہار آئی باغ میں — سودے نے پھر خلل سا کیا ہے دماغ میں

اے عشق تو ہر چند مرا دشمن جان ہو　　مرنے کو نہیں نام کا اپنے میں بقا ہوں

دیکھئے منصب مجنوں پہ یہ لیلی صفتاں　　خاک میں ہمکو ملا کس کو سرافراز کریں

تونے اس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو　　کہ موسے پہ بھی کسی نے نہ اٹھایا ہم کو

پنہاں ہی بھلا ہے خون عاشق　　جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

تیرے بیمار کو کیا ہوئے شفا جس کے طبیب　　نہ تو کچھ درد کو پہنچے نہ دوا ہی جانے

ناتواں ہم ہوئے اتنے کہ تری محفل تک　　دُور سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے

رہرواں کہتے ہیں جس کو جرس محمل ہے　　محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستی وہمی کی نمود　　صفحۂ دہر پہ گویا یہ خط باطل ہے
کچھ تعلق نہیں اس راہ میں جوں ریگ رواں　　جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے
آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی　　یہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے

یہ رخ یار نہیں زلف پریشاں کے تلے　　ہے نہاں صبح وطن شام غریباں کے تلے
کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ چھپے　　داغ سے داغ ہیں کچھ میرے گریباں کے تلے

نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز کنجِ مزار
جاے آسودگی اس گنبدِ گرداں کے تلے

تہی کف آئے تھے ہم عدم سے چلے یہاں سے تو دست خالی
نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا نہ ساتھ یاں سے قدم اٹھائے

بقا جو راہی ہوئے عدم کے تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا
یہ راہ ہستی کی پرخطر ہے چلو یہاں سے قدم بڑھائے

مرزا جعفر علی حسرت

"جوان خوش خلق و حلیم و سلیم واقع شدہ از مدت مدید مشق سخن می کند، شاگرداں بسیار بہم رسانیدہ، فقیر اور ادر مشاعرۂ لکھنؤ دیدہ، در قصیدہ و غزل ید طولی دارد" (اعتذکرۂ مصحفی)

جعفر علی نام حسرت تخلص، ابوالخیر عطار کے بیٹے، جن کی عطاری کی دوکان لکھنؤ میں اکبری دروازے کے پاس تھی،

تحصیلِ علمی کا حال معلوم نہیں، غالباً رواج زمانہ کے موافق فارسی کی درسی کتابیں پڑھی ہوں گی، شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، راے سرب سنگھ دیوانہ سے مشق سخن کی، مگر آخر میں اُن سے منحرف ہوگئے تھے،

جب تلک والد زندہ رہے شاعری کی بدولت امرا اور شاہزادوں کی مصاحبت میں مزے سے زندگی بسر کی۔ پہلے مرزا حسن علی خاں بہادر کی سرکار سے تعلق رہا، اس کے بعد صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ کی مصاحبت میں رہے، جب والد کا انتقال ہوا تو ترک ملازمت کرکے اُن کی دوکان پر بیٹھ گئے، مگر عطاری کرتے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا کہ کسی درویش کی صحبت میں ترک لباس کرکے گوشہ نشین ہوگئے،

تصنیفات میں ایک کلیات ہے، جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند

ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں، اور دو دیوان غزلوں کے ہیں، غرض کہ اصناف سخن میں سے ہر قسم کے نمونے اس میں پائے جاتے ہیں

حسرت کے کلام میں ترکیبوں کی موزونیت، الفاظ کی برجستگی، اور خیالات کی سادگی ان کے پیشرو شعراء کی طرح بہت نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ سارا کلام ان کا ایک طرح کا نہیں ہے تاہم آزاد کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں کہ ان کے دیوان میں پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے،

حسرت کا خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ اکثر غزل کو قطعہ پر ختم کرتے ہیں، اور کبھی پوری غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

ان کو جس قدر شاگرد نصیب ہوئے بہت کم شاعروں کو ملے ہونگے، میر حسن اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ "کثرت شاگردانش چنان ست کہ در صورت شناسی خود ہم حیران است" ان سب شاگردوں میں شیخ قلندر بخش جرات، نواب محبت خاں، خواجہ حسن، بہت نامور شاعر ہوئے ہیں حسرت نے ۱۲۰۱ھ میں وفات پائی، اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے،

دل میں سو بات تھی پر اس نے جو پوچھا احوال
مجھ سے کچھ درد دل اظہار ہوا کچھ نہ ہوا
سارے ہی ہستی کے بکھیڑے ہیں وگرنہ دم مرگ
کچھ سرانجام بھی درکار ہوا کچھ نہ ہوا
کاش کے عشق جتاتا میں نہ اس کو حسرت
میری صورت سے وہ بیزار ہوا کچھ نہ ہوا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا
بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

روتے ہی اسکو گذرے ہے ہجر میں تیرے رات دن
حال میں کیا بیاں کروں حسرت بیقرار کا

یک سے یک اس زمانے میں ہو اس سے خوب تر　　کوئی خوش آتا نہیں میری نظر کو کیا ہوا

آشیاں چھوڑ چلے اپنے ہیں آ راہم تو　　تو ہی لے جائیو سر مد یہ گلستاں اٹھا

کیا مجال اس کی کہاں تو اور کہاں میرا غبار　　لگ چلا دامن سے تیرے مہربانی کے سبب

ہاتھ گل کروں میں گریباں کو بپا کتنا تک　　آتا ہے میرے دل میں یہی بار بار جوش

کل کب تھے ہم سے خوش کہ نہیں ہو تم آج خوش　　ہم نے تو یک دن بھی نہ پایا مزاج خوش

سخت بیدردی ہے بیدردوں سے کہنا درد دل　　منت مرہم نہ کیجے کھینچیے اپنا داغ

کسے منظور تھا یوں تلخ کیجے زندگانی کو　　ولے کیا کیجے حسرت بہت تھی شادمانی کو
بصد خون جگر یک قطرہ مژگاں تک پہنچا ہے　　نہ دے برباد یوں اے چشم اشک ارغوانی کو

نقشوں نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا　　کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کو

ہوئے ہیں اس قدر آفت رسیدہ ہم تو کہ اب ہم یہاں　　نہ کیجیے بہت سے منت کی [illegible]

اُس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے　　وہ ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کروگے

مثالِ نقشِ قدم یاں سے اُٹھ نہیں سکتے　　تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی　　چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

گر کہے تو رات تو دن کو کہوں میں رات ہے　　کفر کچھ اس میں نہیں یہ دل ملے کی بات ہو

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے　　کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سو جگا گئے

اب تو یہ دل اک بتِ نا آشنا کے ہاتھ ہے　　اس کے ہاتھوں چھوٹنا اسکا خدا کے ہاتھ ہے

شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ

از آغازِ شباب بہ مقتضائے موزونیِ طبع مصروفِ تحصیلِ علم بود، چنانچہ بہ فیضِ صحبتِ بزرگاں اوّل تکمیلِ نظم و نثرِ فارسی و تحقیقِ محاورہ و اصطلاحاتِ آں فراغت حاصل کردہ مقتضائے رواجِ زمانہ خود را مصروفِ ریختہ گوئی داشتہ، برائے آنکہ رواجِ فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ فی زماننا بہ پایہ اعلائے فارسی رسیدہ بلکہ از وے ہم گذشتہ چنداں مصروفِ فارسی نماندہ است۔ (اھ تذکرہ مصحفی)

غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص، شیخ ولی محمد کے بیٹے اور امروہہ کے رہنے والے تھے عنفوانِ شباب

میں دلی آئے اور مولوی مستقیم گوپاموی سے عربی صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ طبیعت میں موزونیت خداداد تھی، شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے اور بزرگان دلی کی صحبتوں میں شریک ہونے لگے چند دنوں میں مشق بڑھ گئی تو اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا اور جب تک دلی میں رہے۔ ان کے گھر مشاعرے برابر ہوتے رہے،

مزاج میں عزلت مسکینی اور ادب کی پابندی تھی، اسی وجہ سے دلی کے سب شاعر اور معزز اشخاص اُن کے ساتھ لطف و مروت سے پیش آتے۔ یہ بھی دلی کو اپنا وطن سمجھتے تھے، شاید اُس زمانے میں فارغ البالی بھی تھی۔ نواب نجف خاں کا زمانہ تھا، یہ کبھی اُن کے سلام کو نہیں گئے اور نہ نوکری کی جستجو کی۔ جب تک دلی میں رہے، اسی شاعری کی دھن میں لگے رہے، مگر ایک سا زمانہ ہمیشہ نہیں رہتا، دلی تباہ ہوئی، اہل کمال کا وہ مجمع منتشر ہوا، یہ بھی ناچار دلی سے نکلے مگر مرتے مرتے دلی کی یاد دل سے نہیں نکالی۔ ایک موقع پر کہتے ہیں،

دلی کہیں ہیں جس کو زمانہ میں مصحفی   میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

دلی سے نکل کر یہ پہلے ٹیکھرآئے، شیخ قیام الدین قائم، نواب محمد یار خاں کی سرکار میں ملازم تھے، انھوں نے ان کا قصیدہ پیش کر کے تنخواہ مقرر کرادی، چند روز ٹانڈہ میں نہایت خوشی اور فارغ البالی کے ساتھ رہے، تذکرۂ شعرا میں وہاں رہنے کا حال کئی جگہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس خوشی سے چند روز وہاں بسر ہوئے ہیں، اب تک اس کی یاد تازہ ہے،

نواب محمد یار خاں کا جب کھیل بگڑا تو لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں تھوڑے دنوں رہ کر پھر دلی چلے گئے، اور چاہا کہ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں، مگر کچھ دنوں کے بعد آب و دانہ کی کشش پھر ان کو لکھنؤ کھینچ لائی، اس مرتبہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے، محنت و کاوش کے ساتھ مشق سخن جاری رہی، چند روز میں ان کی اُستادی کو خاص و عام نے تسلیم کر لیا،

ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان کے کلام میں کہیں میر کا
سا بہتر، کہیں سودا کا انداز، کہیں سوز کی سادگی، اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور استادی اپنے پیش رو
اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیئے جا سکتے ہیں
مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میر و مرزا کے بعد کوئی استاد ان کے مقابلہ میں نہیں
جچتا، اور یہ اپنے ہمعصروں میں سب سے برتر اور سب سے فائق نظر آتے ہیں، آزاد نے بھی آبحیات
میں اسکو تسلیم کیا ہے کہ "یہ اصول فن سے بال برابر بھی سرکتے نہ تھے، کلام پر قدرت کامل پائی
تھی، الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس درو بست سے شعر میں کھپاتے تھے،
کہ جو حق استادی کا ہے ادا ہو جاتا تھا، ساتھ اس کے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے
تھے، ایسے موقع پر کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے، جہاں سادگی ہے، وہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز
کے انداز پر چلتے ہیں"

مگر باوجود اس کے افسوس ہے کہ آزاد نے انشا کو جابجا مصحفی پر ترجیح دینے کی کوشش کی
ہے، انشا کی ذہانت اور طباعی میں کچھ شک نہیں، مگر سخن سنجی اور مشاقی کے لحاظ سے انشا کو
مصحفی کے مقابلہ میں لانا ہی مصحفی کی سخت توہین کرنا ہے،

بذلہ سنجی اور ظرافت کے زور سے شاہ وزیر کے دربار میں رسوخ حاصل کر لینا یا زبان
آوری اور طباعی کی مدد سے مجلسوں کو گرما دینا اور چیز ہے اور اصول فن کو لئے ہوئے اصناف سخن
میں سے ہر صنف پر قدرت کامل رکھنا اور سخن سنجی کا حق پورا پورا ادا کرنا اور بات ہے،
یہی وجہ ہے کہ انشا کی گرم بازاری انہی کے ساتھ ختم ہو گئی اور مصحفی کے کمال کا سکہ
اب تک رائج ہے،

اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استادان کے شاگرد ان

اور عقیدت مندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے، اور سچ پوچھو تو شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ گو کوئی استاد نہ رکھتے ہوں مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی بواسطہ یا بلا واسطہ انہی کے مائدۂ سخن کے ریزہ چیں تھے۔ خواجہ حیدر علی آتش، میر حسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر وغیرہ اس پایہ کے لوگ ہیں جن کے دامن تربیت میں پرورش پا کر سیکڑوں استاد بن گئے۔ سب کو جانے دو میر خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور میر ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر کو لو جنھوں نے ہندوستان میں سخنوری کے ڈنکے بجائے ہیں اور اردو شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔

... ثبوت ان کی شاعری اور استادی کا مجموعہ ان کا کلام ہے جو آٹھ دیوانوں میں مشکل سے سمایا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے تو جتنا موجود ہے اسکا سوایا اور رہا ہوگا۔ پھر اگر ان کے سارے دیوانوں میں سے صرف وہی اشعار چھانٹے جائیں جو بہت سے بلند رتبہ ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انشا کے مجموعۂ ہزل و غزل کے برابر ایک مجموعہ ان کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے۔

اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مصحفی جیسے باکمال شاعر کی جتنی قدر ہونی چاہیے تھی لکھنؤ میں نہیں ہوئی۔ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے ان کو صرف پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے جب میر انشاء اللہ خاں کو باریابی ہوئی اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے تو ان پچیس روپیہ میں بھی تخفیف ہو گئی۔ جیسا کہ خود مصحفی نے بھی اس کی شکایت کی ہے۔

ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لائق ... [illegible] ... پانچ ہیں اپنے

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اب تم غور کر سکتے ہو کہ اس حالت میں اس غریب پر کیا گذرتی ہوگی۔ وہ اگر غزلیں

بیٹ بھر کر پیٹ نہ پالتے تو کیا کرتے، مرد اشاعری کے اُن کے پاس دھرا کیا تھا جس کو ذریعۂ معاش قرار دیتے،

اس مرد مضطر کا دل گردہ تھا کہ وہ اس تنگ حالی اور دل شکستگی کی حالت میں بھی وقتاً فوقتاً دربار والوں میں جاتے، اور مشاعروں میں غزلیں پڑھتے، اور حریف کی نوک جھونک برداشت کرتے تھے،

لکھنؤ میں خدا بخشے یہ بُری عادت تھی کہ وہ اپنی گرمیِ بازار کے لئے ایک نہ ایک ہنگامہ برپا کرتے رہتے تھے، دلّی میں اپنی ذکاوت اور طباعی کے زور پر مرزا عظیم بیگ کی مٹی خراب کی گئی تھی، کتنی ہی مٹ گئی ہو، پھر بھی ایسے لوگ وہاں موجود تھے، جنھوں نے اسکو رفع دفع کر دیا،

یہاں آکر انھوں نے مصحفی کو آگے دھر لیا، پہلے تو اس غریب کے پچیس سے پانچ رہ گئے، پھر روز کی چھیڑ چھاڑ، ایک دن مشاعرہ میں مصحفی نے حسب معمول غزل پڑھی اور چلے آئے اس غزل کا مقطع تھا، ؎

تھا مصحفی بہ مائلِ گریہ کہ بس از مرگ   تھی اُس کی دھری چشم یہ تابوت میں انگلی

ان کے چلے آنے پر یاروں نے اُن کی لے دے شروع کی، اور غزل اُلٹ کر بڈھے بیچارے کے کلام کو خوب خراب کیا، جس کا مقطع یہ ہے،

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو بس از مرگ   رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اس غزل کی خبر مصحفی کو پہنچی، وہ پرانے مشاق لکھنؤ بھر کے استاد کوئی معمولی آدمی نہ تھے بگڑ گئے، اور یہ غزل لکھی جس میں متانت کی پابندی کو ہاتھ سے نہیں دیا، مگر افسوس ہی کہ آزاد اسکو بڑھاپے کی سستی یا طبیعت کے امردہے پن سے تعبیر کرتے ہیں، ؎

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو — برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

مجھتا نہیں ہے بزمِ امیرانِ دہر میں — شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری

اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے — سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

ہے شاعروں کی اگلے زمانے کی یہ معاش — پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری

لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اُسے — خفت اُٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

اے مصحفی زگوشۂ خلوت بروں خرام — خالی است از برائے تو خود جائے شاعری

ہر سفلہ را زبان و بیانِ تو کے رسد — آری توئی فغانی و بابائے شاعری

مجنوں منم چہ او گرست رنج می برد — در جبہۂ من آمدہ لیلائے شاعری

پھر کیا تھا سید انشا آئیں تو جائیں کہاں، وہ خاکہ اڑا کہ بقول آزاد شائستگی نے کبھی نہ سنیں نہ اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں، جب نوبت حد سے گذر گئی تو مصحفی کے شاگرد میں منتظر اور گرم اٹھ کھڑے ہوئے، ایک دن شہدوں کا سوانگ بھر کر ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے انشاء اللہ خاں کی طرف چلے، اُن کو بھی خبر ہو گئی، یہ اپنے یارانِ صحبت کو ہمراہ لے کر استقبال کو نکلے، اور اپنے مکان پر لائے، سب کو بٹھایا، اور وہ اشعار دوبارہ پڑھوا کر سنے، پھر خاطر تواضع کر کے سب کو رخصت کیا،

لیکن اس کا جواب سید انشا نے جو دیا وہ قیامت کا تھا، ایک انبوہ کثیر بارات کے سامان سے ترتیب دیا، اور عجیب وغریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں، کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے تھے، اور اشعار پڑھتے جاتے تھے، جس کا ایک شعر یہ ہے،

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن ‏ ‏ لڑتے ہوئے آتے ہیں مصحفی و مصحفن

آزاد کہتے ہیں کہ ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا اور حریف کے سوانگ کو قوال سے کہہ کر ایک دفعہ رکوا دیا، اس بات سے مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا، چنانچہ اکثر غزلوں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے، ان میں سے ایک غزل کا مقطع ہے،

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا ‏ ‏ سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ان سب پر تازیانہ غضب یہ ہوا کہ سید انشا کے سمجھانے سے یا خود بخود مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ مصحفی نے اپنی ہجووں میں ہم پر بھی چوٹ کی ہے، اسکے عذر میں مصحفی نے ایک قصیدہ بطور معذرت کے پیش کیا ہے جس سے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی بیچارہ کی طرف سے سوانگ نکالنے کی ابتدا نہیں ہوئی، اس قصیدہ کو اس نظر سے نقل کرتا ہوں کہ ناظرین اس بات کا اندازہ کریں کہ مصحفی کو شعر و سخن پر کتنی قدرت حاصل تھی،

قسم بذات خدا کے کہ ہے وہ صانع تقدیر ‏ ‏ کہ مجھ سے معذرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر
سوائے اس کے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا میں عرض ‏ ‏ سو وہ بطور شکایت تھی اندکے تقریر
گر اس سے خاطر اقدس پہ کچھ ملال آیا ‏ ‏ اور اس گذشتہ ہوا بندہ واجب التعزیر
عوض دعاؤں کے ملیں مجکو گالیاں لاکھوں ‏ ‏ عوض دو شالہ کے خلعت بہ شکل نقش حصیر
سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب ‏ ‏ جو ہے تو شاہ سلیمان شکوہ عرش سریر
مزاج میں یہ صفائی کہ گر کیا باور ‏ ‏ کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو ‏ ‏ تو اس کے دفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
وگر کہیں تو پھر ایسی کہ نائرہ طیش و غضب ‏ ‏ مزاج شاہ میں ہو مشتعل بصد تشویر

سو تابِ ذرہ کہاں نورِ آفتاب کہاں
کہاں وہ سطوتِ شاہی، کہاں یہ عبدِ فقیر

مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے
کہاں دبیقی و دیبا، کہاں پلاسِ حقیر

میں اک فقیرِ غریب الوطن مسافر نام
رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر

مراد اس سے یہ کہ مدحتِ حضورِ اقدس کو
اٹھا کے پھیر بحرفِ ذمیمہ دوں تعبیر

یہ افترا ہے بنایا ہوا سب اعدا کا
کہ بزم و رزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر

مزاجِ شاہ جو یوں منحرف ہو مجھ سے بھی
یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیشِ وزیر

اگر وزیر بھی ہو سکے نہ کچھ مددگاری
تو جاؤں پیشِ محمدؐ کہ ہے بشیرؐ و نذیرؐ

شفیعؐ روزِ جزا بادشاہؐ و والیؐ
نگر وہ جرم پہ جس نے نہیں لکھی تعزیر

کہوں یہ اُس سے کہ اے جرم بخشِ پُرگنہاں
تری غلامی میں آیا ہے دادخواہ فقیر

خطا ہو میری جو ثابت تو کر اسیر مجھے
وگر عدو کی ہے تو اس کو طوق اور زنجیر

اگرچہ بار ہے نشاۃ سے بے حمیت کو
رہا خموش سمجھ کر میں بازیِ تقدیر

وسے غضب ہے کہ بڑا یہ کہ اب وہ چاہے ہے
خیال میں بھی نہ کھینچوں میں ہجو کی تصویر

سو میں ملک نہیں ایسا بشر ہوں تا کے وہ چند
کہے ہے اُس کے کروں گا نہ ماجرا تحریر

کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا
پھریگا مجھ سے کوئی کرم و منتظر کا ضمیر

زوران یہ بھی جو کیا میں نے تازیانۂ تیغ
تو ہو سکے ہے کوئی ان کی دفع کی تدبیر

ہزار شہد ولے ہیں جمیں ہزار جا پہ ملیں
پھریں ہمیشہ لئے جمع ساتھ اپنے کثیر

نہ مانیں تیغِ سیاست نہ قہرِ سلطانی
نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر

مزاج ان کا کھٹول اس قدر پڑا ہے کہ وہ
ہنسی سمجھتے ہیں اس بات کو نہ جرمِ کبیر

پھر اس پہ یہ بھی ہے یعنی کہ اس مقام کے بیچ
جو ہووے منشی تو کچھ نثر میں کرے تسطیر

فکیفت جن کو خدا نے کیا ہو موزوں طبع ۔۔۔ اور اپنے فضل سے بخشی ہو شعر میں توقیر
یہ کونی بات ہے سومن کے وہ خموش رہیں ۔۔۔ ہوا ہے مصلحۃً گو کہ تصفیہ یہ اخیر
مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا بانی ۔۔۔ اگر میں ہوں تو مجھے دیجئے بد تریں تعزیر
میں آپ فاقہ کش اتنا مجھے کہاں مقدور ۔۔۔ کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آتش شعیر
مرے حواس پریشاں بہ ایں پریشانی ۔۔۔ ہو جیسے لشکر شکستہ کی خراب بہیر
مگر اس پہ صلح کی ٹھہری رہے تو صلح سہی ۔۔۔ اگر ہو پھیر شرارت بشر ہوں میں بھی شریر
جواب ایک کے یاں دس ہیں اور دس کے سو ۔۔۔ نگاہ کرتے تھے اول بایں قلیل و کثیر
حصول یہ ہے کہ جب کوتواں تک قضیہ ۔۔۔ گیا ہو ازپئے تہدید شاعران شریر
تو کوتوال ہی بس اُن سے اب سمجھ لیگا ۔۔۔ یہ دمبدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر
یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح سارے شہر کے بیچ ۔۔۔ بلند قامتی اپنے سے متہم ہو بعیر
سو متہم مجھے ناداں نے ہجو شہ سے کیا ۔۔۔ قباحت اس کے جو سمجھے تو اسکو دے تعزیر
ولے مزاج مقدس جو لاابالی ہے ۔۔۔ نہیں خیال میں آتا خیال حرف حقیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ آہ ۔۔۔ زیادہ کرنہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا پہ چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے ۔۔۔ کرے جو چاہے جو چاہا کیا بہ حکم قدیر

مصحفی کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ آٹھ دیوان انھوں نے ریختہ کے ترتیب دیئے، ایک دیوان فارسی میں لکھا، دو تذکرے لکھے، ایک تذکرہ فارسی کے شعراء کا، ایک تذکرہ اردو شعرا کا جو پیش نظر ہے اور اس کا مسودہ ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہے،

دیوانوں میں تمام اصناف سخن ہیں۔ قصائد، قطعات، غزلیں، تاریخیں، مستزاد، مخمس، رباعیاں وغیرہ، سنگلاخ زمینوں میں قصائد اور غزلیں کاوش فکر کا بہترین نمونہ ہیں،

مگر سب دیوان ان کے ملتے نہیں۔ کئی دیوان نواب کلب علی خاں مرحوم کے کتب خانہ
میں تھے، نواب کے حکم سے اسیر و امیر نے اُن کی تصحیح کی، اور سب کا خلاصہ کرکے ایک دیوان
تیار کیا جس کو نواب نے چھپوا دیا ہے، مصحفی نے چہتر برس کی عمر پاکر ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا اور
لکھنؤ میں مدفون ہوے،

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہوئیگا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہوویگا

ان اداؤں کا کوئی مارا جئے کس طرح ہائے
یا ہے اب یہ گرمجوشی یا کہ وہ پرہیز تھا

مرضِ عشق سے گر اب کی سنبھل جاؤنگا
تو میں دو چار برس کے لئے ٹل جاؤنگا

تھا اگر روزِ قیامت تو بھی ہم شاداں رہے
وہ جو اک دن اس کے ملنے کا مقرر ہوگیا

شوخی تو دیکھو تیر کو سینہ سے کھینچ کر
کہتا ہے، میرے تیر کا پیکان رہ گیا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
پر تیرے دل میں بہت کام رفو کا نکلا

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ یاں
رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

ترے کوچہ میں اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا　　کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے　　دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ　　ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط　　یہ بھی قسمت سے [illegible] ہوتا

فرہادگانِ وادیٔ غربت کی گذشت　　کرتا ہے خوبیاں سب نامۂ نقش پا

گلی کو یار کی سمجھے ہے اپنا وہ کعبہ　　یہ مصحفی سے نہ پوچھو کہ سمت ہے کدھر درست

اے مصحفی اس کوچہ میں دل بسکہ لگا ہے　　جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزم سفر تو

چھیڑ مت ہر دم نہ آئینہ دکھا　　اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم

آنے دو اسے جس کے لئے چاک کیا ہے　　ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

ہر دم کو سمجھتے ہیں دمِ باز پسیں ہم　　غافل تو ہوا ہم سے ذرا بھی تو نہیں ہم

وہی وحشت اور وہی گریباں چاک
جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں

ہائے وہ دل کہ جسے میں نے بغل میں پالا
اب اسے یوں ہدفِ ناوکِ مژگاں دیکھوں

فلک گر پیستا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

کھانے نہیں دیتے ہیں مجھے خونِ جگر بھی
نالے تو مرے ہونٹوں کے دربان ہوئے ہیں

اس چشمِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلفِ سیہ لے گئی دل کو

وعدۂ قتل سے رکھتا ہوں دل اپنے کو میں شاد
کہ اسی وعدہ پہ اک وعدۂ دیدار بھی ہے

یار کا صبح تک ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جیتے رہیے

غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے عزیزو کہ طبیعت نہیں بھرتی

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو
میں نہ سمجھوں گا سمجھا لے کوئی لاکھ مجھے

کنجِ قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصلِ بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

تو آکے بیٹھے دمِ نزع جس کی بالیں پر　　　وہ مر بھی جائے تو آنکھیں کبھی نہ بند کرے

زمانے دھڑکوں کا یہ عالم ہو کہ بے منتِ دست　　　پھر نے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

حسرت پہ اس مسافرِ بیکس کے روئیے　　　جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے　　　پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

راہ میں کشتے پڑے ہیں کئی ارمان بھرے　　　نکلے جلوہ نہ ترا خون سے دامان بھرے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی　　　کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

شیخ غلام علی راسخ

شیخ غلام علی راسخ عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے ہیں، میر تقی میر سے مشقِ سخن کی ہے، ان کے حالات پرانے تذکروں میں جو اس وقت پیشِ نظر ہیں نہیں ملتے گلشنِ بیخار میں کچھ معمولی سا ان کا ذکر ہے، اور چند اشعار ان کے درج ہیں، باوجودیکہ ان کا کلیات اچھی خاصی ضخامت رکھتا ہے،

کلیات میں بہت سے قصیدے ہیں، غزلوں کا دیوان اور چھوٹی بڑی چودہ مثنویاں ہیں، زبان بہت پاکیزہ اور طرزِ بیان نہایت صاف و سادہ ہے، کلام میں رطب یابس

نہ ہونے کے برابر ہے، تصوف کا مذاق بہت اُبھرا ہوا نظر آتا ہے جس کو بہت سادہ طریقے سے ادا کرتے ہیں، تشبیہ اور استعاروں کی چاشنی کم ہے جس سے کسی قدر پھیکا پن ظاہر ہوتا ہے تاہم رنگین شعروں کی کمی بھی نہیں ہے، سینکڑوں شعر ایسے انتخاب کئے جاسکتے ہیں جو دلنشیں ہونے کے قابل ہیں،

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں ان کا قیام زیادہ رہا ہے، چند قصیدے نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں بھی ہیں، مگر غازی الدین کی تعریف کا قصیدہ اُس زمانہ کا ہے جب وہ نواب وزیر تھے، بعض غزلیں ناسخ و آتش کی طرحی زمین میں ہیں، مگر وہ بھی اپنے رنگ کی ہیں،

مقطعوں میں میر کی شاگردی کا اکثر ذکر کرتے ہیں، اور کہیں کہیں شفائی اور نظیری کی ہمسری کا بھی دعویٰ ہے، میرے نزدیک اُن کے معاصرین میں سے کسی کا بھی کلام زبان کی پاکیزگی اور بیان کی خوش ادائی میں ان کا جیسا صاف اور ستھرا نہیں ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو چار دیوانوں سے چھانٹ کر یہ دیوان تیار کیا گیا ہے، اور بڑی بڑی غزلوں میں سے دس دس پانچ پانچ شعر انتخاب کرکے جمع کر دیئے ہیں، مگر اس کو کیا کہیے کہ جو زبان غزلوں کی ہے، وہی قصیدوں اور مثنویوں کی بھی ہے،

اس قدر لکھ لینے کے بعد خمخانۂ جاوید نظر سے گذرا، اُس میں فوائے وطن سے ان کا کسی قدر تفصیلی حال نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ راسخ ۱۱۶۲؁ھ میں پیدا ہوئے، کوئی کہتا ہے کہ پٹنہ میں، کسی کا بیان ہے کہ موضع سائیں میں جو پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے ان کی ولادت ہوئی، ۱۲۲۱؁ھ تک کلکتہ، غازی پور، لکھنؤ، اور دلی کی سیاحت میں مصروف رہے ۱۲۲۲؁ھ میں اپنے وطن مالوف کو واپس آئے، اُس زمانہ میں پٹنہ مرجع ارباب کمال تھا اور شاعری

کا گھر غرق ہو چکا تھا، ان کی عمر کا بقیہ حصہ یہیں گذرا، مشاعروں میں شریک ہوتے تو دو زانو بیٹھے رہتے، اور جب شعرا غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوما کرتے تھے، اپنی غزلیں پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا،

چھہتر برس کی عمر میں ۲۲ جمادی الاخری ۱۲۳۵ھ کو وفات پائی، گلشن بیخار میں ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں واصل بحق ہوئے، مگر قرینہ یہ ہے کہ خمخانۂ جاوید میں نوشاے وطن سے جو سنہ وفات نقل کیا گیا ہے، وہی صحیح ہوگا،

تمھارے آشنا کب خلق سے رکھتے ہیں آمیزش   انھیں تو آپ سے بھی ہم نے بیگانہ سدا پایا
دلِ بلبل نہ تنہا چاک ہے اس عشق کے ہاتھوں   یہ وہ ہے جس سے گل کے بھی گریباں کو قبا پایا

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہو جائیگی   آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہو جائے گا

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہو کہ آہ   کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

شہادت گاہ خوں ریزِ محبت میں خدا رکھی   کہ جو مقتول تھا یاں خنجرِ قاتل کا تشنہ تھا

جوانی [illegible]   جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا

[illegible]   [illegible] یاد نہ آیا

کیا بیاں ہو صاحبانِ ظرف کی تاثیرِ قرب
آب کا قطرہ صدف تک آن کر گوہر ہوا

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل
[illegible] مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

انتہائے عاشقی ہے شانِ معشوقی کہ ہم
صید جس صیاد کے تھے وہ شکار اپنا ہوا

دور میں اُس کی مست آنکھوں کے
محتسب بھی شراب خوار ہوا

بگڑی جب مست سے تب کچھ [illegible]
اسلوب بنا موافقت کا
دل نے کھویا ہمیں کہ تھا آہ
دیوانہ شریکِ مشورت کا

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر
قاصد نے اُن کے آنے کی دل سے بنائی بات

اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہو
بے اختیار [illegible] بیان ہو

ضبطِ گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے
[illegible] ہیں دو چار ہنوز
شیخ اس [illegible] نہ ہو [illegible]
[illegible] ہنوز

بازارِ جہاں میں کوئی خواہاں نہیں ترا
[illegible] سمجھا ہے جنسِ فاہم

گھر سے کھو کر در پہ اپنے بیٹھنے دیتے نہیں
تم جو کہتے ہو کہ جا یاں سے میں اب جاؤں کہاں

معکوس ہے نگیں کی طرح میری سرنوشت
یاد آنے سے مقید نام و نشاں ہوں میں

اس کا ہر برگ آئینہ روئے چمن آرا کا ہے
دیدنی ہے یہ چمن گر ہم نظر پیدا کریں

غم تمھارے درپئے تخریب چشم و دل ہے آہ
ہے قریب اب سے دریا اسے صحرا کریں

باوجود دل نظر آؤ نہ تم حیرت ہے یہ
آئینہ پاس اور ہم دیدار کو ترسا کریں

کچھ بھی کیفیت گراں میں ہو تو یہ سب خرقہ پوش
سبحہ و سجادہ رہن ساغر و صہبا کریں

ہوئے مغلوب شوق کار فرما آخر آخر ہم
ہمیں تھا اختیار آگے پر اب بے اختیاری ہے

اٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم
ہوئے ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے

اگر باب اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی
تو جی میں تھا کہ خواہان دل بے مدعا ہوتے

میر غلام حسن حسنؔ

از اوائل عمرش طبیعتش موزون بود اکثر خود را معروف و مشغول این شغل خطیر می داشت، شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیا که در آن ایام از مشهوران زمانه درین دیار بود می گذرانید بعد ازانکه دور دوره مرزا رفیع السودا شد و زبان ریختہ چنانکہ بود زیادہ درین دیار رواج یافت بحکم قوت ممیزه قدم بر جادہ مستقیم اساتذه مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع السودا و میر محمد تقی میر

و میاں محمد قائم گذاشتہ از زبان خود بہ مرتبۂ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ، دیوان ضخیم و مثنوی ہا متعدد در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی اخیر نہ کہ سحر البیان نام دارد ید بیضا نمودہ (از تذکرۂ مصحفی)

میر غلام حسن نام حسن تخلص، میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے، بارہ برس کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد آئے، کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ میں آئے۔ شعر و سخن کا ذوق موروثی تھا، اور طبیعت اس کے مناسب پائی تھی،

اودھ میں آکر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے، مگر اُن کی روش پر چل نہ سکے، خواجہ میر درد مرزا رفیع اور میر تقی میر کے کلام کا تتبع کیا، ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا، ایک دیوان اور گیارہ مثنویاں تصنیف کیں، جس میں سحر البیان کی سی قبولیت اردو میں کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی،

آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ جب تک دلی میں رہے، اپنے والد اور خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے، اودھ میں جا کر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی، اسی بنا پر آزاد نے ان کو جا بجا خواجہ میر درد اور مرزا رفیع کا شاگرد بیان کیا ہے، مگر خود میر حسن نے تذکرہ میں اپنے آپ کو میر ضیاء کا شاگرد لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے، بارہ برس کے سن میں انھوں نے دلی چھوڑی، خواجہ میر درد مرحوم سے اصلاح لینے کا کون سا موقع تھا، گر سودا کو غزل دکھائی ہوتی تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے، دیکھو تذکرہ

"اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز او شاں از من کما حقہ سرانجام نیافت بر قدم دیگر بزرگان مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر تقی پیروی نمودم"

۱۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی مصحفی نے "شاعر شیریں بیان" سے تاریخ وفات نکال کر حق آشنائی ادا کیا ہے، تذکرۂ شعرا اور ان کی دوسری مثنوی گلزار ارم کا قلمی نسخہ نہایت خوشخط

ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

گلزارِ ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف جی کھول کر کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے اس مثنوی کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

میر حسن قصیدے کے مرد میدان نہیں تھے۔ البتہ غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور مثنوی میں تو یکتائے زمانہ تھے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ بے نظیر و بدر منیر کے قصہ میں جو سحر بیانی کی ہے، اس کا آج تک جواب نہیں ہو سکا۔

اس کی زبان کی صفائی، محاورہ کا لطف، مضمون کی شوخی، طرزِ ادا کی نزاکت، سوال و جواب کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے۔ باوجود اس کے کہ سحر البیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو برس ہونے کو آئے ہیں، لیکن اسکی زبان قریب وہی ہے جو آجکل بولی جاتی ہے یہی ایک اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ میر حسن کا مذاق سخن کتنا لطیف و پاکیزہ تھا،

سر دیوے گا جس دن تو حسن تیغ کو اس کے | سر اد کھلے گا جبھی اس سرِ پنہاں کا

وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا | اب تو قفس میں بھولے نقشہ بھی گلستاں کا

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو | حسن تجکو کیا رات غم تھا کسی کا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا | جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جانے سے تیرے | برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھکر

آرزوِ دل کی بر آئی نہ حسن وصل میں اور — لذتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

دل کو کھویا ہے کل جہاں جاکر — جی میں ہے آج جی بھی کھو آؤں

ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں — وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

ترے بن باغ میں جس وقت غنچے گل کے کھلتے ہیں — خراشِ ناخنِ غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں

سماں تھا کل عجب ہونے سے تیری شوخ محفل میں — کہ نو نو آرزوئیں مضطرب سی تھیں ہر دل میں

وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت — ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں

پہنچے نہ حسن منزلِ مقصود کو ہم اور — آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

مزے نہ دیکھے کبھی ہم نے زندگانی کے — یونہی گذر گئے افسوس دن جوانی کے

حسن دیتا ہے تو کیوں جی بتوں کو　　ملا دیں گے تجھے یہ کیا خدا سے

اُس بُت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسن　　یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا　　بس اے زندگی ایسی ہستی سے گذرے

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں　　ہاں مگر ایک ترے ملنے کا ارمان تو ہے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے　　دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

نغمۂ عشق سے ہیں سینۂ و زنّار ملے　　ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

عیش و وصال و صحبتِ یاران، فراغِ دل　　اس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہیئے

آغازِ محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا　　کیا جانئے کیا ہوگا انجام مرے دل کا

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گذرا　　کچھ آپ ہی آپ اپنے جی پر ملال گذرا

جس عالمِ ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ　　آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں — لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائیگا

ظہارِ خموشی میں ہو سو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہو کہ میں کچھ نہیں کہتا

سحر البیان کا نمونہ

بے نظیر فلک سیر گھوڑے پر سوار ہو کر بدر منیر کے باغ میں پہنچتا ہے اور ایک دوسرے کو دیکھکر فریفتہ ہوتے ہیں

ہوا نا گہاں اس کا اک جا گذر — سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا — وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ — اترا پنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے گذر

تھے اک طرف گنجان باہم درخت — کہ لیٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں — عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طرفہ محل — چلا دیکھتے ہی دل اس کا نکل

لب نہر پر صاف جو غور کی — تو پٹڑی تھی وہ ایک بلور کی
پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے — ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے

کھڑا ایک نگیرۂ زرنگار — کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
مغرق بچھی مسند اک جگمگی — کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ بھولے سماتے تھے تکیے دھرے — کہ تھے وہ فقط حسن ہی سے بھرے

وہ مسند جو تھی موج دریائے حسن — وہاں دیکھی اک مسند آرائے حسن
برس پندرہ ایک کا سن و سال — نہایت حسین اور صاحب جمال
دیئے کہنی تکیے پہ اک ناز سے — سر نہر بیٹھی تھی انداز سے
خواصیں کھڑی ادھر اودھر تمام — ستاروں کا جوں ماہ پر ازدحام
وہ بیٹھی تھی سج دھج بنائے ہوئے — دل اس چاندنی پر لگائے ہوئے
اُدھر آسماں پر وہ رخشندہ مہ — ادھر یہ زمیں پر مہ چاردہ
پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں — لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں
نظر آئے اتنے جو اک بار چاند — زمانے کے منھ کو لگے چار چاند

وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے — وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہیئے ٹھیک نکسک سے رنگ — نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن — غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن

وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حسن — جھکی شاخِ نخلِ گلستانِ حسن
نگہ آفت و چشم عینِ بلا — مژہ دیں صفوں کو الٹ برملا

وہ بینی کہ جس کی نہیں کچھ نظیر — ہے انگشتِ قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رخسار نازک کہ ہو جائے لال — اگر اس پہ بوسے کا گذرے خیال

وہ صافی بلوریں وہ انداز پا — پھرے ہر سحر چشم دل میں سدا
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے خیال — کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال
درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں — کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں
جو دیکھیں تو ہے اک جوانِ حسین — درختوں کی ہے اوٹ ماہِ مبین

کسی نے کہا کچھ نہ پوچھو ہے بلا — کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن — کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
کسی نے کہا دیکھیو لے لو! — کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا
یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں — اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
گئی بات یہ شاہزادی کے گوش — یہ سنتے ہی جاتا رہا اس کا ہوش
کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اٹھی — گیا سنسنا جی تو وہ گر پڑی

خواصوں کے کاندھے پہ دھر اپنا ہاتھ — عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
کئی بد میر تھیں جو کچھ کچھ پڑھیں — دعائیں وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑھیں
جو دیکھیں تو ہے اک جوانِ حسین — کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — مرادوں کی راتیں جوانی کے دن
نئی پشتِ لب سے مسی کی نمود — جسے دیکھ نیلا ہو چرخِ کبود

عیاں چستی و چالاکی گات سے — نمود جوانی ہر اک بات سے
بدن آئینہ سا دمکتا ہوا — گلِ باغِ خوبی لہکتا ہوا
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل — جوانی کی شب کا سماں بر محل
قیافے سے ظاہر سراپا شعور — جبیں پر برستا شجاعت کا نور

گئی اس جگہ جب یہ بدرِ منیر — اور اس نے جو دیکھا اسے بے نظیر
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل
غرض بے نظیر اور بدرِ منیر — گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر
رہی کچھ نہ تن من کی سدھ بدھ اُسے — نہ کچھ اپنے تن کی رہی سدھ اُسے
تھی ہمراہ اک اس کے دختِ وزیر — نہایت حسین اور قیامت شریر
زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا — اسے لوگ کہتے تھے نجم النسا
شتابی سے اس نے چھڑک کا گلاب — تب آئی تنوں میں ذرا ان کے تاب
وہ شہزادۂ دل شدہ تو ٹھٹھک — وہ رہ گیا نقشِ پا سا بھچک

کہ وہ نازنیں کچھ جھجک منہ چھپا　　کمر اور جوانی کا عالم دکھا
چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر　　وہیں نیم بسمل اسے چھوڑ کر

ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی　　چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی
غضب منہ پہ ظاہر تھے دل میں چاہ　　نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں　　میں اب چھوڑ کر گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں　　چھپی جا کے وہ اپنے دالان میں

کہ اتنے میں آئی وہ دخت وزیر　　لگی ہنس کے کہنے کہ بدر منیر
مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں　　ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے　　تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو　　مزہ دیکھ اپنی جوانی کا تو
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش　　عفور است ایزد تو ساغر بنوش
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ سن سن کے وہ نازنیں مسکرا　　لگی کہنے اچھا [illegible]
میں سمجھی ترا دل گیا ہے ادھر　　بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش　　ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو خوش
تمہیں نے تو چھڑکا تھا مجھ پر گلاب　　بھلا میری خاطر [illegible]

یہ آپس میں رمزوں کی باتیں ہوئیں / اشاروں کی باہم جو گھاتیں ہوئیں
بلا لائی جا اس جواں کے تئیں / کیا میزباں میہماں کے تئیں

غرض اُس کو لا کر بٹھایا جو واں / نہ پوچھو اُس گھڑی کی ادا کا بیاں
وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے / بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے / لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن / کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہِ آفتاب / رہے شرم سے پاسے بندِ حجاب

جب آپس میں چلنے لگے جامِ مل / منہ سے غنچہ ساں دل کھلے مثلِ گل
کھلا بند جس دم درِ گفتگو / جواں نے حقیقت کہی مو بہ مو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا / چھپے راز سے اُسکو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے / زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
یہ سن دل ہی دل بیچ کھا پیچ و تاب / دیا شاہزادی نے اُس کو جواب
مرو تم پری پر وہ تم پر مرے / بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں / یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے کیوں دل لگائے کوئی / بھلے چنگے دل کو جلائے کوئی

یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر / کہا کیا کروں آہ بدرِ منیر
کوئی لاکھ جی سے ہو مجھ پر فدا / میں تجھ پر فدا ہوں مجھے اس سے کیا

کہا چل سر اپنا قدم پر نہ دھر — کسی کے مجھے دل سے ہے کیا خبر
یہ رمز و کنایے جو ہونے لگے — تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے
رہی دل ہی دل میں غرض دل کی بات — پہر بھر گئی اتنے عرصے میں رات
خبر رات کی سن اٹھا بے نظیر — کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا — تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا

جس پری نے بے نظیر کو اڑایا تھا، اور صرف سیر کرنے کو فلک سیر گھوڑا دیا تھا، اس کو خبر ہو گئی کہ یہ کسی اور پر دیوانے ہو گئے ہیں۔ اس نے چاہ زنداں میں قید کر دیا۔ ان کے نہ آنے سے بدر منیر کی بیقراری ملاحظہ ہو؛

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر — پڑی بے قراری میں بدر منیر
بہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ — تو ہوتی ہے دل کے تئیں دل سے راہ
قلق واں جو گذرا تو یاں غم ہوا — رکا جی وہاں یاں خفا دم ہوا
کئی دن جو آیا نہ وہ رشک ماہ — نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ

گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی — بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی
دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی — وہ اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ — اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا   نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے   محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو   تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی   یہ دن کی جو پوچھو، کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے   کہا خیر بہتر ہے منگوائیے
جو پانی پلایا تو پینا اسے   غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش   بھرا دل میں اس کے محبت کا جوش
چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر   وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
غزل یا رباعی و یا کوئی فرد   اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں   نہیں کچھ تو اس کی بھی خواہش نہیں
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل   کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

زباں پر تو باتیں مگر دل اداس   پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منھ کی خبر اور تن کی خبر   نہ تن کی خبر نے بدن کی خبر
جو مسی ہے دو دن کی تو ہے وہی   جو کنگھی نہیں ہے تو یوں ہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام   نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سبھاؤ   کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناؤ
نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی   جو بیٹھی ہے بگڑی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہے یاں کی ادا   بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا

شیخ قلندر بخش جرأت

اگرچہ پارۂ در علم موسیقی و ستار نوازی نیز دستے بہم رسانیدہ، لیکن آنچہ گویند دیوانۂ فن شعر است کہ گاہے بے فکری نماند، بسیار دردمند و گداز است (۱؎ تذکرہ میر حسن)

از اصول و قوانین ایں فن بہرہ نداشتہ نغمہائے خارج از آہنگ می سرود، معہذا بعضی ابیاتش بہ نہایت خوش و دلربا آمدہ (۲؎ گلشن بے خار)

قلندر بخش جرأت اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے، باپ کا نام حافظ امان تھا، ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے، اور لوگوں کی طرح ان کا کنبہ بھی فیض آباد آ بسا تھا، چنانچہ جرأت کا نشو و نما فیض آباد میں ہوا، ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آنکھوں سے معذور ہو گئے،

طبیعت چلبلی تھی، موسیقی اور ستار نوازی کی طرف مائل ہوئی، اور شعر و سخن کا چسکا پڑا، جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی، شعر و سخن کے ساتھ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی نام پیدا کیا، اول اول نواب محبت خاں کی سرکار میں[۱] نوکر ہوئے، اس کے بعد مرزا سلیمان شکوہ کے دربار تک رسائی ہو گئی، میر انشاء اللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں

۱؎ نواب محبت خاں حافظ رحمت خاں کے بیٹے تھے، حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد چند روز شجاع الدولہ نے ان کے سب بیٹوں کو الہ آباد میں نظر بند کر رکھا، آصف الدولہ کے وقت میں رہائی ہوئی اور انھوں نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی، نواب نے انکا وظیفہ مقرر کر دیا، خوش رو و خوش خو جوان تھے، میر حسن دہلوی، مصحفی وغیرہ انکی مروت، اہلیت اور خوش اخلاقی کے مداح و ثنا خواں ہیں، انکو شعر و سخن سے بے حد ذوق تھا، فارسی اور اردو میں فکر کرتے تھے، اور جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی تھی، مسٹر جانسن کی فرمائش سے سسی پنو کا قصہ نظم کر کے اسکا

دیوان ان کا چھپ گیا ہے، اس میں ہر طرح کی غزلیں، رباعیاں مخمس، مستزاد، واسوخت
ہجویں اور تاریخیں ہیں، دیوان میں رطب و یابس بہت نہیں ہے،
آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ جو استادوں کے طریقے پائے ہیں انھیں سلیقے سے کام میں لائے ہیں
اس پر کثرت مشق نے صفائی کا رنگ دیا ہے کہ سب کو تاہیوں کا پردہ ہو گیا، اور انکو خود صاحب طرز مشہور کیا
آخر عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے، ناسخ نے تاریخ کہی، ع
ہائے ہندوستان کا شاعر موا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۱)
نام اسرار محبت رکھا تھا، دیوان ان کا تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے،

دیر سے مجکو نہ کچھ کام نہ کعبہ سے غرض | کیوں گلہ کرتے ہوئے گبر و مسلماں میرا

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا | بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

بیکسوں کی خاک پر جو شش سے آتا ہے جو ابر | اے فلک آنسو دے وہ بھی آن کر رو جائے

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہے | یا الٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں
عاشقی کا تو تری نام ہر اک لیتا ہے | پر محبت سا کوئی عشق میں بدنام نہیں

الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو ہو | اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

جو چاہے ہوش تو بیہوش ہو جام محبت سے | یہ بیہوشی ہے ایسی جس سے ہشیاری نہیں جاتی

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا　　چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی　　اور جو بولے بھی ہے کچھ منھ سے تو شرمایا ہوا

میرے اور اس کے جو پوچھو ربط کیا کیا کچھ نہ تھا　　پر دل اس کا پھر گیا ایسا کہ گویا کچھ نہ تھا

آئے جو مرے پاس تو منھ پھیر کے بیٹھے　　یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

تجکو ہم اسلئے کہتے تھے کوئی دم مت جا　　چل بسے ہم نہ ترے چلتے ہی چلتے دیکھا
اس کا بیمار نہ نکلا کبھی گھر سے جرأت　　گھر سے تابوت ہی آخر کو نکلتے دیکھا

جستجو میں دل کے بہلانے کی جی کھونا پڑا　　جو ہنسی کی بات تھی اس کا ہمیں رونا پڑا

تشبیہ کس مزے سے میں لذت کو اسکی دوں　　کچھ دل ہی جانتا ہے مزا دل کی چاہ کا

فصل گل گرچہ ہزار آئی پر اپنا جرأت　　دل پژمردہ نہ جوں غنچۂ تصویر کھلا

اور تو کیا مشغلے ہیں ہجر میں تیرے مگر　　دل کی بیتابی سے سو سو بار اٹھنا بیٹھنا

ہم اسیران قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں　　راہ لگ اپنی چل اے باد صبا تجکو کیا

نزع میں بھی تری صورت کو نہ دیکھا افسوس — مرتے مرتے بھی نہ ارمان نظر کا نکلا

خدا جانے کریگا چاک کس کس کے گریباں کو — ادا سے اُن کا چلنے میں اُٹھا لینا یہ داماں کا

بیٹھیں کیا ہو خانۂ ہستی میں خاک — جو یہاں آیا کدر رہی گیسا

سر دیجئے راہِ عشق میں پر منہ نہ موڑیئے — پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہکن کی بات

گیا وہ دل ہی پہلو سے کہ جس کو — کبھی روتے تھے چھاتی سے لگا کر

دل ہی اس کافر کا پتھر ہو تو کوئی کیا کرے — ورنہ ایسی آہ سوزاں بے اثر ہرگز نہیں

قیس و فرہاد کی تھی ایک ہی منزل لیکن — وہ بیاباں کی گیا اور وہ کہسار کی راہ

تو نے اس باغ میں دم بھرنے کی مہلت پائی — اے صبا ہم نے تو اتنی بھی نہ مہلت پائی

جلسے میں دن بھی میں کانپتا اُٹھتا ہوں بیٹھے بیٹھے — یاد آتے ہیں وہ [illegible]

نہ ساماں اُن کے رہنے کا نہ کچھ امید یاں رہنے کی — [illegible]

…سے گل ہم نے اُس کے آستاں کو دیکھکر رو دیا کن حسرتوں سے آسماں کو دیکھکر

…اسیروں کو مِلا ہے تنگ باں قفس زیر گردوں تک زمیں پر تلملا سکتے نہیں

…دیکھا مضطرب مجکو تو محفل میں کسی نے وہ یہ کہتا تھا کہ ہے لطفِ محبت رازداروں میں

…ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

…ب وحشی کو خواہش ہے تمھارے در پہ آنے کی دوانہ ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

…سج میں اور ہم میں ہیں طرفہ صحبتیں ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ کچھ کہے جائے ہے

…چھ یہاں تلک کہ ہوا تنگ نامہ بر لذت ملی جو یار کے دشنام سے سنے

…یا کہوں جرأت میں اُس صیاد قاتل کا گلہ دام سے چھوڑا تو چھوڑا توڑ کر بازو مجھے

…تش گل چاکِ قفس سے دمبدم دیکھا کئے سب نے لوٹی ہیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

مستزاد کا رنگ ملاحظہ ہو،

…دو ہے نگہ چھپ کے غضب قہر ہے کھڑا، اور قد ہے قیامت،

غارت گرِ دیں وہ بت کافر ہے سراپا ۔ اللہ کی قدرت
آنکھیں ہیں بے رفتار، حسن گفتار کی کیا بات ۔ ہر بات جگت ہے

اور رنگ رخِ یار ہے گویا کہ بھبھوکا ۔ بھرپور ملاحت
ہیں بال یہ بکھرے ہوئے بکھرے یہ دھواں دھار ۔ جوں دودِ شعلہ

حسن بت کافر ہے خدائی کا جھگڑا ۔ ٹک دیکھیو صورت
ابرو تو خونریزی میں اسکے ہیں غضب طاق ۔ شمشیر برہنہ

آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے نہ دیکھا ۔ افسوں ہی اشارت
کان ایسے کہ کانوں سے سنے ویسے نہ اب تک ، نہ اپنی آنکھوں سے دیکھے

اسکے تصور میں مجھے گھیرے ہے گویا ۔ اک حلقۂ حیرت
بینی یہ خوش اسلوب کہ نتھنوں کی پھڑک دیکھ ، تڑپے ہے دو عالم

ہے اس کو لب یار سے بوسہ کی تمنا ۔ ارمان ہی حسرت
دانتوں کی صفا کیا کہوں موتی کی لڑی ہے ۔ لب لعل کے ٹکڑے

مستی ہے بلا تس پہ رکھے پان کا بیڑا ۔ سو شوخی کی رنگت
دل خون کرے وہ دستِ حنابستہ پھر اس میں ۔ سمرن کی پھبن ہائے

ہے وضع تو سادی سی پہ کیا کیا نہیں پیدا ۔ شوخی و شرارت
اس ابھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھ ۔ سب ہاتھ ملیں ہیں

اور ہائے وہ ہر بات میں گردن کا وہ ڈورا ۔ ہے دامِ محبت
ہے عشوہ و انداز و ادا ناز و کرشمہ ۔ اور گرمی و شوخی

ہر عضو ہے اک ٹھسکے وہ کافر ہے سراپا ۔ اک موہنی مورت

میر انشاء اللہ خاں انشا

میر انشاء اللہ خاں خلف میر ماشاء اللہ خاں نجفی الاصل مرشد آبادی المولد لکھنوی بلند فن دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریقۂ راسخہ شعرانہ گفتہ اما در شوخیِ طبع و جودت ذہن او یکی نیست (از گلشن بے خار)

غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاورہ کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں، دیکھنے کے قابل ہیں مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں ابھی کچھ ہیں جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہوگئے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں، اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں (از آب حیات)

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو آزاد نے سمجھا ہے، پھر معلوم ں کہ ایک دوسری جگہ یہ کیا لکھ دیا ہے کہ "نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن بیخار جب دیکھا ں تو خار نہیں کھٹکا زخم دل پر لگتا ہے، سید موصوف کے حال میں "ہیچ صنف را ریقۂ راسخہ شعرا نگفتہ"

میر انشاء اللہ خاں کی ولادت مرشد آباد میں ہوئی، ان کے والد میر ماشاء اللہ خاں بھی فضیلت علمی کے ساتھ شاعر بھی تھے، انھوں نے بیٹے کی تعلیم میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی، یہ بھی بلا کے ذہین و ذکی تھے، تھوڑے دنوں میں فارسی۔ اس کے بعد عربی میں صی استعداد پیدا کر لی، طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی۔ شاعری کی طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے، عربی فارسی، اور ریختہ تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، بہاء الدین آملی کی نان و حلوا کے جواب میں شیر و برنج تیار کی جو حقیقت

میں بہت مزیدار ہے، نواب سعادت علی خاں کے شکار کا حال ایک مثنوی میں لکھا ہے، وہ بھی اچھی ہے،

مگر زیادہ توجہ ریختہ کی طرف رہی اور اخیر اخیر میں اسی کو اپنے فضل و کمال کا جولانگاہ قرار دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں تباہی کا سیلاب ہر طرف سے آیا ہوا تھا، مرشد آباد سے دلی آئے، بقول آزاد، اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ[5] تھے، شاہ عالم نے شفقت کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا، یہ دربار میں داخل ہوئے اور چند روز دلی میں ہنسی خوشی رہے،

[5] شاہ عالم کا نام عالی گوہر تھا، والد عزیز الدین عالمگیر ثانی عماد الملک وزیر کے ہاتھوں شاہ شطرنج بنے ہوئے بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، عالی گوہر سے باپ کی مجبوری اور اپنی تباہی دیکھی نہ گئی کسی بہانے سے نکل کھڑے ہوئے کچھ دنوں نواب نجیب الدولہ سے ساز باز کرنے میں لگے رہے، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ کے مشورہ سے نواب محمد قلی خاں صوبیدار الہ آباد کو بلایا اور ان کے جھنڈے تلے فوجیں فراہم کرکے عظیم آباد پر چڑھائی کی مگر وہاں راجہ رام نراین ناظم بنگالہ کی حیثیت سے صوبہ بہار کا حاکم تھا، اس نے قلعہ میں محصور ہو کر یہ مشہور کیا کہ نواب جعفر علی خاں کرنل کلفٹ کو لئے ہوئے مدد کو آرہے ہیں، محمد قلی خاں عظیم آباد تک پہونچ چکے تھے اور مورچے قائم کر لئے تھے، مگر اس خبر سے انکی ہمت جاتی رہی، عالی گوہر کا دائرہ دولت کرم ناسہ ندی کو عبور کرکے صوبہ بہار میں داخل ہوا ہی تھا کہ باپ کے قتل کئے جانے کی خبر آئی، وہیں سنہ ۱۱۷۳ھ میں شاہ عالم کا لقب اختیار کرکے بادشاہ ہو گئے، نواب شجاع الدولہ کو قلمدان وزارت، نواب نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کا خلعت روانہ کیا، نواب منیر الدولہ کو سفارت کے عہدہ پر نامزد کرکے احمد شاہ درانی کے دربار میں بھیجا، اور خود بدولت ایک مدت تک صوبہ بہار کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہے، کبھی فتح اور کبھی شکست ہوتی رہی، اور نواب شجاع الدولہ دور سے بیٹھے گھاتیں بتاتے رہے،

(بقیہ صفحہ ۲۵۹ پر)

نوجوانی میں جو امنگیں انسان کو ہوا کرتی ہیں وہ ان کو بھی تھیں مگر اس وقت دلّی میں کیا دھرا تھا، جی اچاٹ ہوا تو لکھنؤ پہونچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی پیدا کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۸) جب نواب قاسم علی خاں عالیجاہ کی انگریزوں سے بگڑی اور وہ شکست کھا کر شجاع الدولہ کے پاس چلے آئے، تو شجاع الدولہ نے ان کے زر وجواہر پر قبضہ کیا، اس کے بعد شاہ عالم کو لیکر انگریزوں سے لڑنے کو نکلے جس کا انجام یہ ہوا کہ بکسر کے مقام پر ان کو شکست فاش ہوئی شجاع الدولہ بھاگ کر روہیلکھنڈ آئے اور انگریزوں نے شاہ عالم سے دیوانی سہ صوبہ بنگال کی سند حاصل کر کے چھبیس لاکھ روپیہ نقد اور صوبہ الہ آباد و چکلہ کوڑا پر بادشاہ سے فیصلہ کرلیا،

شاہ عالم وہاں سے الہ آباد آئے اور سات برس یہاں رہے، اسکے بعد نواب منیر الدولہ کو یہاں کا انتظام سپرد کر کے ۱۱۸۵ھ میں دلی تشریف لے گئے، وہاں پہونچ کر مرہٹوں کی مدد سے نواب ضابطہ خاں خلف نواب نجیب الدولہ پر فوجکشی کر دی اور مرہٹوں نے اس کا سارا ملک دبالیا، ضابطہ خاں نے بھاگ کر شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی اور چند دنوں کے بعد تکوجی راو ہولکر کی سفارش سے دربار شاہی میں بحالی حاصل کی صوبہ الہ آباد کا یہ انجام ہوا کہ نواب منیر الدولہ کے مرنے کے بعد شجاع الدولہ نے اس پر قبضہ کرلیا اور چند سال تک وہاں کی آمدنی بادشاہ کو بھیجتے رہے، اس کے بعد یہ بھی بند کر دی،

ضابطہ خاں کا بیٹا غلام قادر بادشاہ سے دلی عناد رکھتا تھا، اس نے ۱۲۰۲ھ میں ایک دن موقع پا کر بادشاہ کو تخت سے کھینچ کر پچھاڑ دیا، اور پیش قبض سے ان کی دونوں آنکھیں نکال لیں، اور بیدار بخت بن احمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا، شاہ عالم سلطنت کے ساتھ نور بصارت سے بھی محروم ہوگئے، مہاراجہ سندھیا کو خبر ہوئی تو انھوں نے فوج بھیجی جس نے قلعہ پر قبضہ کر کے شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا، اور غلام قادر کو بھاگتے ہوئے پکڑ کر ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر بڑے عذاب سے مارا، مگر اس سے کیا ہوتا جو ہونا تھا ہو چکا تھا شاہ عالم نے خود اس واقعہ کو ایک قطعہ میں نظم کیا ہے، جو نہایت دردانگیز ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۰ پر)

وہ شاہ عالم بادشاہ [illegible] انھوں نے [illegible] ناز سمجھ کر اور پھر ان کی بذلہ سنجی
اور خلیفہ گوئی کی وجہ سے ان کی سرپرستی کی اور اپنی غزلیں اصلاح کے لئے انکو دینے لگے تہے
[illegible] بھی لگے رہے، آخرکار تفضل حسین خاں علامہ کی سفارش سے نواب سعادت علیخاں
کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی، اور ان کا ستارہ اقبال چمکا، پھر تو ایسے شیر و شکر ہوئے کہ نواب
کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا،

صرصرِ حادثہ برخاست پے خواریِ ما | داد بر باد سر و برگ جہانداریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم | بر ودر شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک تیرہ شد | تا نہ بینیم کہ کس غیر جہانداریِ ما
داد افغان بچۂ شوکتِ شاہی برباد | کیست جز ذات خدا کہ کند یاریِ ما

اس واقعہ کے بعد بڑی بے لطفی سے شاہ عالم نے زندگی بسر کی، برائے نام وہ تخت پر تھے ورنہ درحقیقت میں
مرہٹوں کا راج تھا، چاروں طرف لوٹ مار جاری تھی، کوئی متنفس ایک گھڑی بھی چین سے سانس لینے
کی قدرت نہیں رکھتا تھا، بادشاہ شعر و سخن سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے یہانتک کہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں
اس مخمصہ سے انکو نجات ملی، اردو کا کلام ان کا ملاحظہ ہو،

کیجئے ہمدم بھلا کیونکر نہ شکوہ یار کا | ہم تو بندے اس کے ہوں وہ یار ہو اغیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اس نے آہ | ہو جیو یارب برا اس چشم آتشبار کا
دیکھکر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب | کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے | شب دلِ آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے | اب تو آرام سے گذرتی ہے

مگر نواب کا مزاج قدرتی طور پر متین اور سنجیدہ واقع ہوا تھا، پھر ملکی و مالی کا سرانجام وہ اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے، اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو حصۂ ملک انھوں نے شوقِ حکمرانی کی گھبراہٹ میں اپنے ہاتھ سے کھو دیا تھا اس کا کانٹا ہر وقت ان کے دل میں چبھتا رہتا تھا، میر انشاؔ اعتدال سے بڑھ کر منسوخ تھے، اور ضرورت سے زیادہ ان میں تمسخر تھا، اس وجہ سے نواب کے ساتھ زیادہ دنوں تک نبھ نہ سکی، ۱۲۲۵ھ میں اقبال نے منھ موڑا، یہ دربار سے نکالے گئے،

آزاد کہتے ہیں کہ ایک دن نواب سعادت علیخاں نے انھیں بلا بھیجا، گھر پر نہیں ملے خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی کے یہاں نہ جایا کرو، اس قیدِ بے زنجیر نے انھیں بہت دق کیا تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی اللہ خاں جوان بیٹا مر گیا، اس صدمہ سے حواس میں فرق آگیا، یہانتک کہ ایک دن سعادت علی خاں ان کے مکان کی طرف سے نکلے، کچھ غم و غصہ کچھ دل کے بے قابو ہو جانے سے سرِ راہ کھڑے ہو کر سخت سست کہا، نواب نے جا کر تنخواہ بند کر دی

اس کے بعد مرزا سعادت یار خاں رنگین سے نقل کیا ہے کہ لکھنؤ میں انشا کے وہ دو رنگ دیکھے جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے، ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ نواب کی ناک کے بال تھے، اور دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے ہجوم سے راستہ نہ ملتا تھا، دوسری وہ حالت کہ ظاہر درست تھا، مگر درختِ اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی، نواب کا حکم تھا کہ سوا دربار کے گھر سے نہ نکلیں، تیسری بار گیا تو انکو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے سر پہ ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں سکو کا تو بڑا ڈالے ایک گگر کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا، تو بڑے میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک کر چلے

لے آزاد نے انشا کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کیلئے نہایت موزوں ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲ پر)

چوتھی بار جو گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا، ڈیوڑھی پر دستک دی، اندر سے کسی ابلانے پوچھا کون بت بیوی نے نام بتایا وہ ہٹ گئی میں اندر گیا، دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں، تن برہنہ ہی، دونوں زانوں پر سر دھرا ہے، آگے راکھ کے ڈھیر ہیں، ایک ٹوٹا ساحقہ پاس رکھا ہی، یہ دیکھکر بے اختیار دل بھر آیا میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا، اور دیر تک رویا جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا سید انشا! سید انشا! سر اٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھیں آنسو بھریں میں نے کہا کیا حال ہی، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ہی پھر اسی طرح سر گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا،

آزاد نے انشا کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہی کہ اسکو انہی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہی، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے حیاتِ دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشا اللہ خاں کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنوں ہوے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہی کہ نواب سعادت علیخاں نے حکم دیدیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں، اور دربار میں بھی اس وقت حاضر ہوں جب انکو بلایا جائے، انشا نے اسی حبسِ بیجا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہی،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۱ اور اس کا ایک شعر یہ ہے

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشا کی اس زمانے کی تصنیف نہیں ہی، جو ان کے جنون اور بیچارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہی، میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرہ مصحفی میں پڑھے ہیں، جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہی جس وقت انشا لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے، مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہی کہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعراے دلی سے معرکے درپیش تھے، (ا ص)

بدون حکم وزیرالممالک آصف آنجا   چساں کنم حرکت نوکری است یا بازی

تذکرہ خازن الشعراء مصنفہ سید میر نجان الہ آبادی کے چند اقتباس اردوئے معلی کی تیرھویں جلد میں شائع ہوئے ہیں، اُن میں سید انشا کا بھی تذکرہ نظر سے گذرا، اور ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ جس زمانہ میں انشا اور مصحفی میں جھگڑا ہوا، اور ہجو تک نوبت پہونچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دیدیا تھا، وہ حیدرآباد گئے، اور اثنائے راہ سے ایک عریضہ شاہ محمد اجمل الہ آبادی کی خدمت میں بھیجا، ان کی درخواست پر شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اعمال ان کو لکھ بھیجے، چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے ان کو پھر لکھنؤ بلوا لیا، یہاں پہنچ کر شاہ صاحب کی خدمت میں انشاء نے شکریہ کا خط بھیجا جو سید میر نجان کو لکھتے وقت دستیاب نہیں ہوا،

"ہنگامے کہ فیمابین میر و میاں مصحفی مناقشہ واقع شد و نوبت بہجو کشید گرکشید وزیرالملک میر را از لکھنؤ رخصت انصراف داد و ایشاں بحیدرآباد رفتند از اثنائے راہ عریضہ بخدمت جد امجد علیہ الرحمہ ارسال نمودند و دراں یک بیت ہم بود ؎

یوں ہی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہے   ایک قاتل سے ہر آن میں مل رہتا ہے

حضرت مرحوم بجوابش تحریر فرمودند، ؎

خوش باش دلت چرا خراشد

انشاء اللہ خیر باشد و چیزے از ادعیہ و اعمال مجرب بحسب طلب میر نیز ارسال فرمودند، بعد عرصہ قلیلے نواب وزیر میر را بہ لکھنؤ طلب فرمود، میر بہ لکھنؤ رسیدہ خط شکرگذاری بحضرت جد مرحوم نوشت، ہنگام جمع ایں ترجمہ آں خط باوجود تلاش بدست نیامد"

بہرحال اس میں شبہہ نہیں کہ آخر میں نواب وزیر انشا سے ناخوش ہوگئے تھے، تنخواہ جاری رہی، مگر آزادی سے محروم ہو کر سنہ ۱۲۳۳ھ میں دنیا کے مخمصوں سے نجات پائی،

کلیات ان کا چھپ گیا ہے، اس میں ایک دیوان فارسی کا ہے، ایک اردو کا، جسمیں قصیدے، غزلیں، قطعے، خطوط منظوم، رباعیاں، پہیلیاں، چیستانیں، ہجویں اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، فارسی اردو کے سوا ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کچھ کچھ کہا ہے بقول آزاد ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں، ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، ابھی برج بھاشی ہیں، ابھی مرہٹے، ابھی افغان، ابھی کشمیری، چند ساعت بھی اپنے رفیق مسخرے سے جدا نہیں ہوتے،

آزاد نے بطور معذرت کے میاں بیتاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا، اور شاعری کو سعادت علیخاں کی مصاحبت نے ڈبویا" مگر میں اسکو تسلیم نہیں کرتا، وہ یہ کہتے کہ ان کی شاعری کو مسخرے نے ڈبویا تو یہ بات ماننے کے قابل ہوتی میر انشا کو نواب تک رسائی نہیں ہوئی تھی، جب بھی تو یہی میر انشا تھے جو مرزا سلیمان شکوہ کے مکان کے پاس لب دریا ایک پنڈت دھرم مورت بنکر جا بیٹھے، اور خوب دستور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دیئے، جو لوگ اشنان کیلئے آتے وہ القریہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھکر انہی کی طرف جھکتے، تھوڑی دیر میں اناج، آٹا، پیسے کوڑیوں کے ڈھیر لگ گئے وہ بھی اس قدر اور سب سے زیادہ (دیکھو آب حیات صہ ۲۹۲)

اصل بات وہی ہے، جس کو آزاد نے کتاب میں نہیں حاشئے میں بیان کیا ہے کہ ان کے بزرگوں کو سرکار سے شہدوں کو تقسیم وظائف کی خدمت سپرد تھی، ان کے بھائی جب دلی میں آئے تو وہ بھی ایک مالا کا کنٹھا گلے میں پہنے تھے، چنانچہ میر انشاء اللہ خاں نے آزادوں کے انداز میں مستزاد کہہ کر داد زباندانی کی دی ہے" سید انشاء کی ذکاوت اور جودت ذہن میں کچھ شبہہ نہیں، بچپن میں انسان کی طبیعت اخاذ ہوتی ہے" شہدوں کی باتیں بچپن سے ان کے کانوں میں پڑی ہونگی، ان کی ہنسانے والی باتوں نے غیر محسوس طریقہ پر ان کی طبیعت پر

قابو پایا، اور انہی باتوں کا جلوہ ان کی زندگی کے تمام کارناموں میں نمایاں ہے۔ نواب سعادت علیخاں جیسے خشک مزاج کو اس میں مطلق دخل نہیں۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ سید انشا جیسا ذکی و ذہین آدمی اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا تو سعادت علیخاں کے مزاج میں درخور ہو جانے پر وہ کوئی اور چیز بن جاتا، اور اس کا دیوان لطائف و ظرائف سے مالامال ہونے کی جگہ ملک کے سامنے آج ایک نیا نمونہ پیش کرتا۔

وہ قصیدہ دیکھو جو جارج سوم کے جشن تہنیت میں کہا ہے، اس کو نواب سعادت علیخاں کی مصاحبت کا ثمرہ کہو تو بجا ہے، اسی کے ساتھ اسکا بھی افسوس کرنا چاہیئے کہ ایسا قادر الکلام اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو ملک کے لئے کس قدر مفید ثابت ہوتا۔

کلیاں پھولوں کی تیار کرلے ہوے سمن ۔۔۔ کہ ہو کھانے کو نکلیں گے جوانان چمن
عالم طفلی نباتات پہ ہوگا کچھ اور ۔۔۔ گوٹے کانے سبھی پہنیں گے نئے پیرہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر ۔۔۔ کرسی ناز پہ جلوہ کے دکھاویگا پھبن
شاخ نازک سے کوئی ہاتھ میں پکڑا کے بینت ۔۔۔ ہو الگ سب سے نکالے گا نرالا چلن
سوسن بھی نئی صورت کا دکھاویگا رنگ ۔۔۔ کوچ پر ناز کے جب پاؤں رکھیگا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفہ بھی کریں گے حاضر ۔۔۔ لگے جب غنچۂ گل کھولنے بوتل کے دہن
اپنے نظارہ کی آنکھوں میں نظر آویں گے ۔۔۔ باغ میں نرگس شہلا کے ہوئے حیران
اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے ۔۔۔ اودی بانات کی کرتی ہے شکوہ سوسن
پتے مل مل کے سجاویں گے فرنگی طنبورہ ۔۔۔ لالہ لادیگا، سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تار رگ ابر بہاری سے کوئی ۔۔۔ خود نسیم سحر انگلی سے بجا لی ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلاویں گے ۔۔۔ آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سوسن کی نظر

نوار تک پیلے گھونگرا کرتی منقار [illegible] اب تو یہ بلبل بھی جو ہے اسکا فن
ڈی کے جو گرا مدیل ہیں ہونگے سب جمع — آن گرا ہیگا بگل پھونکے گا جب سکھدرشن
آئینہ ہر کو شیشہ کی گھڑی لیکے حباب — یا سمیں پتوں کی پیتیں میں چلے گی بن ٹھن
نکہت آوے گی نکل پھول کلی کا کمر — ساتھ ہو لیگی نزاکت بھی جو اُنکی ہے بہن
منتظر صنعت فرنگی سے مشابہ ہونگے — اُسمیں ہوویں گے پریزاد بھی سب عکس فگن

ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں:

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ رات اُسکا — حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹفن

غزلوں کے منتخب اشعار

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا — جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

یہ عجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو — ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی — بھول جاتا ہوں ولے تیری مدارات کے وقت

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر — غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہمصحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہے نہاں لطف و کرم چینِ جبیں کی تہ میں
ہاں چھپی صاف ہے اک اُن کی نہیں کی تہ میں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

جی میں کیا آگیا انشاؔ کے یہ بیٹھے بیٹھے
کہ پسند اُس نے کیا عالمِ تنہائی کو

چند مدت سے فراقِ صنمِ دیر تو ہے
چلو پھر کعبہ ہی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

رونے سے اپنے دل کی تپش گرد ہو گئی
دو چار بوندیوں میں ہوا سرد ہو گئی

عجب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُسکی ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

مرزا سعادت یار خاں رنگین

درستی الفاظ و چسپیدگی کلمات و درستی عبارت و ایراد و الفاظ مقابلہ و صحت محاورہ چناں بود کہ ہرچہ کلام ہم عہدش از ایراد بعض الفاظ رکیکہ ہندی و تنگی نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلہ قدما رجائز نمیداشتند و در شعر خود ہا درج کردند آں ہم از اشعار خود برانداخت [illegible]

سعادت یار خاں نام رنگین تخلص تھا۔ ان کے والد مرزا طہماسپ بیگ خاں تورانی تھے [illegible] لاہور میں نواب حسین الملک میر منو خاں کی سرکار میں ملازم رہے۔ اس کے بعد دلی میں نواب ضابطہ خاں اور نواب نجف خاں وغیرہ امرائے دربار کے ساتھ نوبت بہ نوبت آسودگی سے زندگی بسر کی،

رنگین کی ولادت سرہند میں ہوئی، مگر نشو و نما دلی میں پایا، سپاہی کے بیٹے تھے شہسواری اور تیر اندازی میں خوب کمال پیدا کیا، گھوڑوں کے پہچاننے اور ان کے معالجہ میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے،

ان کی عمر کا بیشتر حصہ شاہزادوں کی مصاحبت میں بسر ہوا، کبھی کبھی تجارت کا مشغلہ بھی کر لیتے تھے، اسی تقریب سے لکھنؤ کئی بار آئے اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ؎ کی سرکار میں

؎ مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی بڑے علم دوست اور ہنر پرور شاہزادے تھے۔ باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی، جس وقت شاہ عالم سلطنت کے ساتھ غلام قادر کی نمک حرامی سے نور بصارت بھی کھو بیٹھے اس وقت یہ دن کسی بہانہ سے قلعہ معلی سے نہایت بے سر و سامانی کیساتھ نکل کھڑے ہوئے، رامپور میں نواب فیض اللہ خاں نے اپنی حیثیت کے موافق پیشکش نذر گذرانی، جس سے کچھ سامان درست کیا، اور ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچکر تین کوس پر خیمہ کیا، ان سے پہلے مرزا جواں بخت آچکے تھے، اور نواب آصف الدولہ نے انکی بڑی آؤ بھگت کی تھی

احترام سے عرصہ تک رہے، آخر عمر میں تجارت اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، اور وہیں ۱۲۵۱ھ میں ۸۰ برس کی عمر پاکر وفات پائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۸) مگر صحبت برابر نہ ہونے سے انکو بنارس جانے کی تکلیف دی گئی۔ اسی بنا پر اس مرتبہ نواب وزیر نے معذرت کی اور نواب گورنر جنرل بہادر، تین مہینے تک مرزا سلیمان شکوہ پانچ ہزار سوار، پیدل و شاگرد پیشہ کی جماعت سے لکھنؤ سے تین کوس پر ڈیرے ڈالے ہوئے پڑے رہے، تین مہینے کے بعد لارڈ کارنوالس کی تحریک سے نواب وزیر استقبال کو نکلے اور شہزادہ کو ہاتھی پر سوار کر کے خود خواصی میں [illegible] بیٹھے۔ [illegible] تجمل [illegible] شہر میں لائے اور چھ ہزار روپیہ ماہوار ان کے جیب خرچ کیلئے مقرر کر دیئے۔ کچھ دنوں شہزادے نے [illegible] ریذیڈنسی کے قریب مرزا جلیل [illegible] مکان میں قیام کیا، اس کے بعد جنرل مارٹن کی ڈیوڑھی کوٹھی خرید کر کے اسمیں مستقل سکونت اختیار کی اور عرصہ دراز تک لکھنؤ میں عزت و احترام سے رہے۔ نواب وزیر عہد سے ان سے فدویانہ سلوک کرتے رہتے تھے خود نواب آصف الدولہ باوجود تنعم و نازپروری پانچوں ہتھیار لگائے ایک ہاتھ ہاتھی کی گدی کی نوازش [illegible] دولت گاہ جا کر بار بار آداب بجا لاتے تھے۔ جب نواب غازی الدین حیدر نے لارڈ ماڑا کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کے اشارہ سے خطاب بادشاہی قبول کیا تو انکو خواہش ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ مساویانہ حیثیت سے ملاقات کریں۔ مسٹر [illegible] ریذیڈنٹ لکھنؤ نے شاہزادہ سے کہلا بھیجا کہ اب تک نواب وزیر تھے وہ بآداب زیارت حاضر ہو کر نذر دیا کرتے تھے۔ خلعت پہننے سے [illegible] اب بادشاہ ہوئے ہیں، لہذا ان سے حضور مساویانہ حیثیت سے ملیں۔ شاہزادے نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے [illegible] ملاقات کرینگا تو اسی طرح سے کرونگا، پھر ریذیڈنٹ نے کہلا بھیجا کہ کل بادشاہ اور فدوی ملنے کو آئیں گے ملاقات کے وقت [illegible] کا لحاظ رکھا جائے، شاہزادے کو ناگوار ہوا مگر مجبور، دوسرے روز بادشاہ اور ریذیڈنٹ مع امرا [illegible] شاہزادے کے جلوخانہ میں تشریف لائے، نقیب [illegible] نے چلمن اٹھائی، حسب دستور آواز دی [illegible] دربار خبردار ہو جاؤ، حضور برآمد ہوتے ہیں، شاہ اودھ نے [illegible] اپنی عادت کے ذرا خم ہو کر سلام کیا۔ [illegible] چوبدار نے آواز دی جہاں پناہ عالم و عالمیان پناہ سلامت، شاہزادے نے سلام کا جواب بطریق سلام دیا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰ پر)

شعر و سخن کا شوق عنفوانِ شباب سے تھا، شاہ حاتم سے مشقِ سخن کی اور چند دنوں کی محنت [illegible] بہت سے ہمعصروں سے آگے نکل گئے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۹) فقط یہ کیا کہ دہنے ہاتھ میں شاہ اودھ کا ہاتھ، بائیں میں رزیڈنٹ کا ہاتھ لیکر دیوان خاص میں آئے [illegible] اپنے پاس شاہ اودھ کو بٹھا لیا، رزیڈنٹ سامنے کرسی پر بیٹھے، فرمایا کہ سرکار کمپنی کی خوشی ہوگئی، مختار ہیں، [illegible] اگر ہم اسکو سکرات میں چھوڑ آیا ہوں، اسوقت فرصت نہیں ہے، پھر ملاقات یہ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے تسلیمات آئیں، شاہ اودھ نے ایک شالی رومال اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا اور اسی طرح مکان خاص تک رخصت کیا، مگر دل میں بہت کبیدہ ہوئے، اُس دن سے پھر نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات نہیں ہوئی، بادشاہ کو یہ دھن تھی کہ میں بادشاہ ہوا ہوں تو میرے بیٹے کی شادی تیموریہ خاندان میں ہونی چاہئے جوڑ توڑ لگا کر روپے دلا کر شاہزادے کے مصاحبوں کو ہموار کر کے نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان کی بیٹی سے [illegible] پہلے سے تھے ایک ہزار روپیہ ماہوار شادی کے وقت، پانچ ہزار مساویانہ ملاقات کے وقت جملہ بارہ ہزار ماہانہ پنشن مقرر ہو گیا، جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور انھوں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو ایک لڑکی کٹنی ڈومنی [illegible] جسکو شہزادی نے [illegible] پرورش کیا تھا، اور اسکا نام قمر چہرہ تھا، پہلے تو گفت و شنید رہی اسکے بعد کٹنی کو بھیج محل سے اڑوا لیا، شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا، رزیڈنٹ تک بات پہونچی، اُس نے بادشاہ کو سمجھا کر قمر چہرہ کو واپس کرا دیا مگر شاہزادے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کرنل کارن ہیس کاسگنج کو بلوا بھیجا، اُسکی پوتی شاہزادے کے بیٹے سے منسوب تھی، انہی کے ساتھ کاسگنج چلے گئے، پانچ ہزار روپیہ جو غازی الدین حیدر نے بوقت ملاقات مساویانہ مقرر کئے تھے وہ بند ہو کر سات ہزار [illegible] سے ایک ہزار خزانہ شاہی سے اور چھ ہزار بتوسط رزیڈنٹ شاہزادہ کو ملتے رہے، وہاں یہ گل کھلا کہ کرنل صاحب کے بیٹے قمر چہرہ کو لے اڑے اور الور جا کر عیش کرنے لگے، اس سے شاہزادہ وہاں سے بھی دل برداشتہ ہو گئے، اور اکبرآباد جا کر بود و باش اختیار کی، آخر کار ذیقعدہ سنہ ۱۲۵۳ھ میں مر کر سکندرہ مقبرہ اکبر شاہ تیموری میں مدفون ہوئے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۱)

شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ رنگین کی طبیعت ایجاد پسند واقع ہوئی تھی، اسی بنیاد پر ریختہ سے ریختی جس کو ان کے لنگوٹیے یار میر انشاء اللہ خاں نے چمکایا، اور لکھنؤ میں یہ رنگ خوب مقبول ہوا،

رنگین ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے، ہر رنگ میں انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں جو ان کے مجموعۂ تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے،

رنگین کے مجموعۂ تصانیف کا نام نورتن ہے جسمیں چار دیوان اردو کے ہیں، ریختہ، بیختہ، آمیختہ، انگیختہ، ان میں سے تیسرا دیوان ہزلیات کا ہے، جسمیں ایک قصیدہ شیطان کی مدح میں بھی ہے، چوتھا دیوان ریختی کا ہے،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰) شاہزادہ کو شعر و سخن کا بہت ذوق تھا، جب تک دلی میں رہے شاہ حاتم کو کلام دکھاتے تھے لکھنؤ میں ولی اللہ محب شاگرد مرزا رفیع سودا پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی، پھر انشاء اللہ خاں کو سرفراز فرمایا،

رہ گئے ہوش و حواس و خرد و طاقت سب — یوں ترے کوچہ سے میں بے سر و ساماں نکلا
تیرے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب — جو گیا اس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا

جان دی راہِ محبت میں الٰہی صد شکر — بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس — ایک برچھی ہے کہ پہلو میں چبھو دیتے ہو

جیسے سائی کا نشاں جائے جبیں سے کیونکر — کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں
تاج و تخت اپنے سلیماں کو یا شاہ نجف — آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

علاوہ دیوان کے ان کی پانچ کتابیں اور بھی ہیں، ایجاد رنگین، فرس نامہ، بیدن نامہ، جوہر لطیف

مثنوی تسنیم ... جو زبان کی صفائی و پاکیزگی میں سحر البیان کے بعد اس زمانہ کی بہترین تصنیف

ہیں شوق سے پڑھنے کے قابل ہے،

وہ آیا بھی یہاں تو حضرت دل جھوں شب کو | جو تم اس وقت پہلو سے نہ چلاتے تو کیا ہوتا

وہاں اپنی ہی بیتی کہتے گو اے ہمدمو جاکر | کوئی مطلب کی میری بات فرماتے تو کیا ہوتا

نصیحت رات دن ناصح کیا کرتے ہو ناحق تم | اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

کھینچ لائی ہے اسے اے کشش دل یہاں تک | بارے صد شکر کہ تجھکو بھی یہ مقدور ہوا

جو نالہ رات کو لب تک نہ پہنچ گیا ہوتا | تو ناوک آہ کے سینہ [illegible] گیا ہوتا

آج آنا ہے نہیں آتا تو دے مجھکو جواب | بھیج کر پیغام جھوٹے روز مت حیران کر

دل بغل سے لے گئی رنگیں وہ دزدیدہ نگاہ | ورنہ دل دیتا ہے کوئی اپنا کسی کو جان کر

دل تھا جو بساط اپنی سو گذران چکے ہیں | جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

نرگس کو وہ چمن میں کیا بھر نگاہ دیکھے | وہ انکھڑیاں نشیلی جسکو خوش آئیاں ہوں

نبھے گی صحبت اس سے کس طرح کچھ کہہ نہیں سکتے | وہ ہرجائی ہے اور بے شغل تم بھی رہ نہیں سکتے

مجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے — مجکو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے
جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

جو کوچے میں اُس نازنیں کے نہ ٹھہرے — تو پھر یہ کہو ہم کہیں کے نہ ٹھہرے

وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگیں — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

دمبدم بس کہ ترا حسن فزوں ہے ظالم — روز جی میں ہے کہ کھنچوائیے تصویر نئی

حکیم ثناء اللہ خاں فراق

جوان حلیم و سلیم و خوش فکر و شیریں گفتار، استفادہ شعر از خواجہ میر درد کرد بلکہ فیض ذات شر را ہمیشہ از کاملین قیاس می کرد، آخر پیش بہ چشم فقیر تحصیل علم طب کردہ نام بطبابت بر آورد دیوان ریختہ اش شستہ و رفتہ است، فقیر در شاہجہان آباد بود، رابطۂ دوستی او روز بروز ترقی داشت (تذکرۂ مصحفی)

ثناء اللہ خاں نام، فراق تخلص، حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت کے بھتیجے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں حضرت خواجہ میر درد اور ان کے شاگردوں اور مریدوں کی دامنِ تربیت میں نشو و نما پائی حکیم قدرت اللہ خاں قاسم[۵] (متوفی ۱۲۴۶ھ) سے طب کی درسی کتابیں پڑھ کر

---

[۵] حکیم قدرت اللہ خاں عباسی قاسم تخلص، دلی کے نامور عالموں اور طبیبوں میں شمار کئے جاتے تھے، مولانا فخرالدین علیہ الرحمہ سے بیعت تھی، شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، شعرائے اردو کا ایک بسیط تذکرہ لکھا ہے (بقیہ حاشیہ ص۲۷۴ پر)

تھی، کے سبب میں نسخہ نویسی کی اور اس فن میں ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ چند روز کے بعد انکا شمار دلی کے مشہور اور نامور طبیبوں میں ہونے لگا، اور دلی جیسے شہر میں یہ مرجع اور مقصد بن گئے۔

شعر و سخن سے اُن کو خداداد مناسبت تھی، حضرت خواجہ میر درد کے فیض صحبت سے اسمیں ترقی ہوئی، اور چند روز کی مشق میں انھوں نے قدرت کاملہ بہم پہنچائی،

خبر دیتا تھا کسی کے وصل سے شوقِ ہم آغوشی ۔۔۔ کہ میرا ہاتھ مجھ کو خود بخود بازو پھڑکتا تھا

جوں ریگِ رواں خانہ نشیں ہوں میں ازل سے ۔۔۔ نہ قصدِ وطن کا نہ ارادہ ہے سفر کا

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ ۔۔۔ ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

ہم داغِ دل کو کیا اور داغِ جگر کو دھویا ۔۔۔ کام کیا کیا نہ مرے دیدۂ تر سے نکلا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۳) جو میری نظر سے نہیں گذرا[1]، دیوان بھی دیکھنے میں نہیں آیا، گلشن بیخار میں جو شعر نواب مصطفیٰ خاں نے نقل کئے ہیں، اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

ہمیں بھی رخصتِ سیرِ چمن ہو ٹک صیاد ۔۔۔ کہ اب کی شور ہے ظالم بہار آنے کا

وہ آئے بغل میں کہیں یا جی ہی نکل جائے ۔۔۔ مٹ جائے کسو طرح تو یاں خلشِ دل

جان جاوے یا رہے دامِ تم یہ دیکھیں گے اسے ۔۔۔ ہے ارادہ یہ مصمم دیکھیے کیسی بنے

[1] اب لاہور میں چھپ گیا ہے۔ (م۔س)

بعد مرنے کے بھی اک گردش رہی ہمکو مدام | مشت خاک اپنی رہی تھی کچھ سو پیمانہ بنا
انگلیاں گھس گئیں ہاں ہاتھوں کو ملتے ملتے | لیکن افسوس نوشتہ نہ مٹا قسمت کا

حسرت نہ ابھی دل کی نکلی ہزار حیف | نکلا ادھر وہ گھر سے ادھر جی نکل گیا

سمجھے تھے دام زلف سیہ ہی بلائے جاں | یہ کیا کروں کہ لے گئی تقدیر کھینچ کر

خوش آتی ہیں پاؤں کی تری ٹھوکریں ظالم | سر کو کبھو قدموں سے اٹھانے کے نہیں ہم

کس زلف کا شیدا ہے مرا دل نہیں معلوم | کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل نہیں معلوم
ہر غنچہ میں بو ہے تری ہر گل میں ترا رنگ | جس پہ جا تری شکل و شمائل نہیں معلوم
سمجھائے کسی کے بھی سمجھتے ہیں دوانے | کیوں پاؤں میں پڑتی ہیں سلاسل نہیں معلوم
مجنوں کے سوا دیکھئے اب دشت جنوں میں | ہو کون فراق اپنے مقابل نہیں معلوم

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں | بھولے سے اس نے یاد کیا ہو عجب نہیں

آنکھ اس شوخ ستمگر سے لڑا بیٹھے ہیں | بس چلے یا نہ چلے جی تو جلا بیٹھے ہیں

تم گالیاں جو دو تو میں چٹکی بھی کیا نہ لوں | پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

دورِ سوم

از طبقۂ متوسطین

شاہ نصیرالدین نصیر

پیرزادہ میر صدر جہان است، جوان خوش گو فقیر در ایامے کہ در شاہجہان آباد بود اکثر در مشاعرہ می آمد، در ہمہ عالم توتقی در طبیعش روانی بود، حالا می گویند کہ قوت شاعری بیام پیدا کردہ (از تذکرۂ مصحفی)

از مدت شصت سال بر سر عشق ریختہ است باکثر معمورہائے مشہور مثل لکھنؤ و حیدر آباد مکرر رفتہ و بشعرائے شہر سر دار برخوردہ و مطارحۂ مشاعرہ کردہ و بہ استادی نام بر آوردہ (از گلشن بیخار)

شاہ نصیرالدین دلی کے رہنے والے تھے، ان کے والد شاہ غریب نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی، مگر ان کی قسمت میں شاعری کے سوا اور کچھ نہ تھا طبیعت کا رجحان ادھر پاکر شاہ محمدی مائل[1] کے شاگرد ہوگئے۔

---

[1] شاہ محمدی مائل بھی دلی کے رہنے والے تھے فقر و تصوف کی طرف مزاج مائل تھا، آزاد لکھتے ہیں کہ مشق سخن قیام الدین قائم سے کی تھی، مگر میر حسن فرماتے ہیں کہ شاہ قدرت اللہ کو کلام دکھلاتے ہیں، گلشن بیخار میں بھی انکو قدرت کا شاگرد لکھا ہے، دلی کی تباہی کے وقت مرشد آباد چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کرلی تھی، کیا عجب ہے کہ ابتدا میں شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لی ہو اور جب مرشد آباد میں رہنے لگے تو شاہ قدرت اللہ کے شاگرد ہوگئے ہوں کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷ پر)

چند روز کی مشق میں اچھا کہنے لگے۔ شاہ عالم بادشاہ کا زمانہ تھا، وہ خود شاعر تھے اس وجہ سے بآسانی دربار تک رسائی ہو گئی۔ شعرائے دربار کے ساتھ یہ بھی طبع آزمائی کرتے رہے، دربار شاہی سے ان کے بزرگوں کے نام چند گاؤں آل تمغا معاف تھے، خاندانی خدمات کے ساتھ اہل کمال کو عیدوں اور جشنوں میں انعام بھی ملتا رہتا تھا۔ اس گزر ہوتی تھی، مگر ان کی بلند پروازی کی آنکھیں لکھنؤ اور حیدر آباد کو ڈھونڈتی تھیں، جہاں روپے اور چاندی کی گنگا جمنا بہ رہی تھیں،

دو بار لکھنؤ آئے، پہلی مرتبہ مصحفی اور انشاؔ کا زمانہ تھا، مشاعروں میں غزلیں پڑھیں اور داد سخن پائی، دوسری بار آئے تو زمانہ پلٹا ہوا پایا، شیخ امام بخش ناسخ نے عہد قدیم کو منسوخ کر دیا تھا اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لوگوں کو گرما رکھا تھا، اس لئے ان کی جیسی قدر ہونی چاہئے تھی، اس مرتبہ نہ ہوئی؛

حیدر آباد میں راجہ چندو لال دیوان[1] تھے جنکی سخاوت کا گھر گھر چرچا تھا، یہ وہاں پہونچے:

حال کہنے کی نہ دی گریہ نے فرصت رات کو ... آج پھر کیسو اُسے سائل وہ کیا افسانہ تھا

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دل زار کی ہوس ... مشہور ہے جہان میں بیمار کی ہوس

کہتا نہ تھا کہ یار آہ ہر دم کی اس ہنسی سے ... آخر گیا نہ ظالم تک بے گناہ جی سے

[1] راجہ چندو لال کا خطاب راجہ راجایان مہاراجہ بہادر خطاب تھا، قوم کا کھتری تھا، اس کا پردادا مولچند نواب آصفجاہ اول کے ساتھ حیدر آباد گیا تھا۔ آصفجاہ نے اسکو گردآوری کے محکمہ کا افسر اعلیٰ مقرر فرمایا، اس کے بعد اس کا بیٹا بھیمی رام، پھر اس کا بیٹا نانک رام اسی خدمت پر سرفراز ہوا،

نانک رام چندو لال کا چچا تھا، اس نے چندو لال کو باپ کے مرنے کے بعد پرورش کیا اور عمدہ تعلیم دلائی، جب نانک رام مرا تو اس کا بیٹا ... (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۸ پر)

تو ان کے جواہرات نے خاطر خواہ قیمت پائی، مگر دلی کا چٹخارہ ایسا نہ تھا کہ انسان بھول جائے
اس لئے امرا و حکام سے مالا مال ہو کر واپس آئے، اور تین بار پھر گئے،
چوتھی بار جانے کو تھے کہ راجہ چندو لال نے سات ہزار روپیہ بھیج کر بلا بھیجا، وہاں پہونچے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷) وہ دو ہی برس کے اندر مر گیا، اسکی جگہ چندو لال کو ملی، یہ تعلیم یافتہ، ذہین و فہیم نہایت محنتی و جفاکش، سرکاری کام میں چست و چالاک تھا اور ہر ایک کام کو بذات خود انجام دیتا تھا، اس نے اپنی ہوشیاری سے دربار آصفجاہی میں رسائی پیدا کی اور سنہ ۱۲۱۲ھ میں کڑپہ وغیرہ ممالک مفتوحہ کا انتظام اور خطاب "راجہ بہادر" اس کو عنایت ہوا، اور سنہ ۱۲۱۹ھ میں پیشکاری کے عہدۂ جلیلہ پر ترقی کی،

اس زمانہ میں نواب منیر الملک وزیر تھے، ان کی ناقابلیت کی وجہ سے سارا انتظام ملکی و مالی اسکے ہاتھ میں آگیا، سنہ ۱۲۳۵ھ میں "مہاراجہ بہادر" کا خطاب، ہفت ہزاری منصب، نوبت، گھڑیال، جواہر گراں بہا اور جاگیر سے سرفرازی پائی، سنہ ۱۲۴۵ھ میں راجہ راجایان کا خطاب ملا اور باوجودیکہ عہدہ وہی رہا مگر وزارت اور دیوانی کے اختیارات اسکے قبضۂ اقتدار میں آگئے، نواب منیر الملک صرف خطاب و جاگیر کے مالک تھے،

لکھنؤ میں آغا میر کو جو دسترس و اقتدار حاصل تھا، وہ اس کو حیدرآباد میں ہوا، اور لطف یہ کہ دونوں ہمعصر اور سخاوت و فیاضی میں ایک دوسرے کی نظیر تھے، فرق اتنا تھا کہ آغا میر کی گرم بازاری جوڑ توڑ اور سازش کی بدولت تھی اور یہ اپنی قابلیت کے زور سے کام نکالتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آغا میر کا ستارۂ اقبال گیارہ برس چمک کر ماند پڑگیا، اور اس نے پچاس برس تک والاجاہی کی،

اس سخاوت و فیاضی کے کارنامے اتنے زبان زد ہیں کہ ان کے لکھنے کی حاجت نہیں، ہمارے بچپن تک کوئی حیدرآباد سے آتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ فلاں شخص چندو لال کے حیدرآباد سے آیا ہے، اگر جاتا دیکھتے کہ چندو لال کے حیدرآباد جاتا ہے، گویا حیدرآباد کی نسبت چندو لال کی طرف ہوگئی تھی، اس سے اسکی نیکنامی و شہرت کا اندازہ کرنا چاہیے

اس کا معمول تھا کہ صبح سے بارہ بجے رات تک مہمات سلطنت میں مشغول رہتا تھا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹ پر)

تو پچیس روپیہ یومیہ ان کا مقرر ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ اس مرتبہ ان کو دلی آنا نصیب نہیں ہوا، وہیں سنہ ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی،

شاہ صاحب نے خود اپنا دیوان مرتب نہیں کیا، ان کے مرنے کے کچھ دنوں بعد میر حسین تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمن نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ان کے کلام کا جمع کیا، جس کو نواب رامپور نے خرید لیا، مگر حیدرآباد میں ان کی غزلوں کا مکمل دیوان ان کے کسی شاگرد کے پاس تھا، وہ چھپ گیا ہے، اس میں صرف غزلیں ہیں، قصائد، قطعات، رباعیاں اور مخمس وغیرہ کچھ بھی نہیں ہیں،

کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں، زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں، جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں، زبان سید انشا اور جرأت کی ہے، کچھ الفاظ ان کے ہاں متروک ہیں، مگر اتنے نہیں ہیں کہ ناسخ و آتش کے ساتھ ان کو جگہ دی جائے

(بقیہ حاشیہ صـ۲۶۸) اس کے بعد شعرا و علما حاضر ہوتے اور مشاعرہ و مذاکرہ رہتا، اس میں ڈھائی بج جاتے اس کے بعد خوابگاہ میں جا کر استراحت کرتا تھا،

کم و بیش پچاس برس تک پیشکاری کی خدمت انجام دینے کے بعد سنہ ۱۲۶۰ھ میں مستعفی ہوا، اور سنہ ۱۲۶۱ھ میں بیاسی ۸۲ عمر میں جی کر زندگی سے استعفا دیدیا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتا تھا، اور شاداں تخلص تھا،

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا
کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

شاداں وہاں بھی کیا ہے حسینوں کی انجمن
جاتے ہیں لوگ کیوں عدم آباد کی طرف

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقت صبح صادق کو
اثر رکھتی ہے اگر ہو دعا سے صبح صادق ہو

افسوس کہ نرگس کی طرح باغ جہاں میں | کچھ ہم نے بجز حسرت دیدار نہ پایا

کمان و تیر نمط مجکو ربط تھا اُس سے | جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

آہ کچھ ہم کو نہ تھی فرصت یکدم کی خبر | اے حباب لب جو تو نے یہ عقدہ کھولا

نصیر اُس شوخ کی یہ کج ادائی کونی جاتی ہے | مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

چشم وہ کیا ہے کہ جس میں ایک آنسو ہی نہیں | آبرو تب ہی صدف کی جب کہ ہو گوہر سمیت

کس کی نگہ نے جلوہ برق اب دکھا دیا | آنکھیں جو اپنی ہو گئیں بے اختیار بند

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر | گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جہاں سے گو بت مغرور اُٹھ گیا انصاف | خدا کے روبرو ہوگا مرا ترا انصاف

عاشق سوا ہی کس کو ہوئے شکست رنگ | دل کی شکستگی ہے بنائے شکست رنگ

بلبل ہزار حیف نہ ہو ہمکنار گل | اور مفت میں نسیم تو لوٹے بہار گل

برقع کو اُلٹ منہ سے جو کرتا ہی تو باتیں | اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

برباد رفتگانِ محبت کی خاک ہے | اے قیس دشت میں یہ بگولا نہیں اٹھا

حباب وار غنیمت ہے فرصت اک دم کی | ہوا پہ زندگی مستعار رکھتا ہوں

سر مژگاں سے وقت نالہ آنسو کو ترستے ہیں | یہ سچ ہی جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی | سچ کہو جی میں ہو کیا کس سے لڑا چاہتے ہو

وا شد نہیں ہے غنچۂ تصویر کی طرح | کیا جانے کیا ہوا دلِ آفت رسیدہ کو

دل یہ کہتا ہے کہ مت یادِ بتاں دلواؤ | چھیڑنے کا مرے تب آپ مزا دیکھیں گے

دیکھ لیتی جو اٹھا کر ترے کیا ٹوٹتے ہاتھ | لیلی اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

وحشت سے مجھے ہاتھ اٹھانے نہیں دیتے | پڑتے ہیں مرے پاؤں سلاسل [illegible] دن سے

قطعہ

یہ مجنوں ہے نہیں آہو سے لیلیٰ | پہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے

جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار   لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

میر نظام الدین ممنونؔ

جوانانِ سعادت مند و ذی شعور ست، در حین حیات پدر بزرگوار بعد تحصیل کتب فارسی بمقتضائے موزونی طبع خود را مصروف گفتن شعر ہندی و فارسی میداشت تا آنکہ در عرصۂ قلیل قوت شاعرانہ، اچنانچہ باید پیدا کرد، کلام خود را بمرتبۂ کلام پدر رسانیدہ اکثرے از موزونانِ شہر استفادۂ شعر از وی می کنند، (از تذکرہ مصحفی)

گفتارش خیلے دلچسپ و دلنشین است ملاحت کلامش نہایت عذب و شیریں و در بستن مضامین بیگانہ یگانہ است فکر صحیح صائبش از غلطش نشانہ قوت نظم اکثر اصناف سخن دارد (از گلشن بیخار)

میر نظام الدین نام، ممنونؔ تخلص، میر قمر الدین منتؔ [۱] کے بیٹے تھے، سونی پت وطن تھا مگر مولانا شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے ان کے والد دلی آ رہے تھے

---

[۱] میر قمر الدین منتؔ سونی پت کے رہنے والے، امام ناصر الدین مشہدی کی اولاد میں تھے، شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے دلی میں ان کا نشو و نما ہوا، علوم و فنون کی تمام درسی کتابیں شاہ صاحب موصوف سے پڑھیں اور مدت تک اُن کی صحبت میں رہے،

فارسی زبان کی تحقیق اور مشق سخن میر شمس الدین فقیرؔ سے کی اور اردو کی شیخ قیام الدین قائمؔ سے دونوں زبانوں میں شعر اچھا کہتے تھے چنانچہ ٹی ہیں رہے سنی مذہب کے پابند سے طریقۂ چشتیہ میں مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ سے بیعت تھی، لکھنؤ تشریف لائے تو مذہب شیعہ اختیار کیا، مدت تک لکھنؤ میں رہے اور نواب وزیر سے قصائد کے صلے خاطر خواہ حاصل کئے،

لکھنؤ سے کلکتہ تشریف لے گئے، عماد الدولہ لارڈ ہیسٹنگز کی تعریف میں قصیدے لکھکر (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۳)

وہیں ممنون پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی،

درسی کتابیں والد ہی سے پڑھیں، اور مشقِ سخن بھی انہی سے کی، چند روز کی فکر و کاوش میں دلّی جیسے شہر میں اُن کی شاعری کا سکہ رائج ہو گیا، اکبر بادشاہ نے فخر الشعراء کا خطاب عنایت کیا، اور کثرت سے لوگ اُن کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے، لوگ کہتے ہیں کہ مفتی صدرالدین خاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲) پیش کئے اور ملک الشعراء کا خطاب پایا، سنہ ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے آصف جاہ ثانی کی خدمت میں ایک خاص سفارت پر انکو حیدرآباد روانہ کیا، وہاں پہونچکر نواب مذکور کی مدح میں قصیدہ پیش کیا، جس کے صلہ میں سہ ہزار روپیہ نقد اور دو سو روپیہ ماہوار کا منصب پایا،

حیدرآباد سے فائز المراد ہو کر پھر لکھنؤ تشریف لائے، مہاراجہ ٹکیت رائے کی مصاحبت میں چند دن رہ کر کلکتہ تشریف لے گئے، وہاں پہنچے ہی تھے کہ ۱۲۰۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، ضخیم دیوان اور متعدد مثنویاں یادگار چھوڑیں، نثر میں بھی ایک کتاب گلستان سعدی شیرازی علیہ الرحمہ کے جواب میں لکھی ہے، اسکا نام شکرستان ہے، ان کا شمار پرگو شاعروں میں تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

در یک عمر دہ مثنوی گفتہ ام — با پختن طرز نو گوہر سفتہ ام

چو اشعار من در عدد می رسد — شمار قصائد بصد می رسد

بود شعر من در غزل سی ہزار — ز پایان رباعی گر ختم شمار

اردو اشعار کا نمونہ

علاج دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے سے — یہاں کیا ہو گیا وہ معجزہ حضرت سلامت کا

ترے آنے کا کچھ ہے لطف پیارے — ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

قدم رکھ گیا کون سینے پہ اپنے — گل داغ میں آج مہندی کی بو ہے

آرزو نے بھی ان سے اصلاح لی ہے،

بہرحال ان کی شاعری نے ترقی کی، اسی زمانہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے، اور سرکار اودھ کی طرف سے خاطر خواہ قدردانی ہوئی، مگر بڑی قدردانی گورنمنٹ انگریزی نے کی جس نے ان کو اجمیر میں صدرالصدور کر دیا

ایک مدت تک اس جلیل القدر عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے، جب کبر سنی سے پیری آ گئی تو دلی جا کر خانہ نشین ہو گئے اور ۱۲۶۰ھ میں ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑ کر دنیا سے چل بسے

زبان ان کی صاف اور شیریں ہے، اس میں جا بجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزیدار ہو جاتا ہے، پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہو جاتی ہے،

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہوویں گے ۔۔۔ نہ واں خو یاد آنے کی، نہ یاں شیوہ تقاضا کا

اے آہ بے ادب نہ اسے پھونکیو کہ ہے ۔۔۔ دل جلوہ گاہ پردہ نشینانِ راز کا

دعا میں زیر لب آہستہ آہستہ لیے دوں ہوں ۔۔۔ جو یاد آتا ہے لب تک آکے رک جانا وہ گالی کا

ممنون قضا نے ہم کو دیا کیا بغیر دل ۔۔۔ سو وہ بھی نذر کاہش و تشویش ہو گیا

کل ترے بیمار نے غش سے ذرا کھولی تھی آنکھ ۔۔۔ تو نہ تھا سو دیکھ بالیں کو وہ بیدل رہ گیا

ے بادِ آہ جنبش اتنی بھی تھی نہ لازم — اک ایک پارۂ دل آخر اٹھا کے چھوڑا

ل میں کیا کیا ہوسِ عرضِ تمنّا تھی لیے — تیری چتون کا وہ ڈھب مانعِ تقریر ہوا

س کی آنکھوں سے ستاروں کی نظر تیری جگہ — جس جگہ تک جبیں کا نقطہ دیدۂ بیخواب رہا

س بے ادب کو عرضِ ہوس ہر نگہ میں تھی — آنکھ اس نے بزم میں نہ اٹھائی تمام شب

ند سے تیری ہم پہ جو ہونی تھی سو ہوئی — اب وعدۂ حشر پہ دھرے قیامت

کشتیٔ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش — مژدہ نومیدی کہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائیگا — ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

دت سے آپ ہو کے بہا چشمِ تر کی راہ — ممنون کیا بیاں کروں میں ماجرائے دل

تپشِ دل نے نہ چھوڑا کہ کبھی ہم اک بار — لائیں تسکین کے لئے لب پہ ترا نام تمام

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیثِ لبِ شیریں — گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزا ہم

شبِ وعدہ چشم ہے راہ پر جو ذرا بھی کھٹکے کسی کا در　　　　تو صدائے پا تری جان کر کہوں اب تلک کہ کہاں کدھر

[illegible] مبادا آئے کوئی ہجر ناگہاں　　　　ناکامیوں سے وصل ہی میں آؤ خو کریں

اٹھو مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دمِ نزع　　　　گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھئے کیا ہو

کون آتا ہے کہ سینہ میں بیدار ہو گئیں　　　　صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

دل گرمیاں وہ ہم سے کہاں اب کہ آجکل　　　　ہنگامہ محبتِ اغیار گرم ہے

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت　　　　صبح پیچھے بس لڑائی ہو چکی

[illegible]　　　　[illegible]

نگاہِ ناز [illegible]　　　　وہاں سے [illegible] ہو گئے

بھری آتی ہے چھاتی یاد میں یاران رفتہ کی　　　　[illegible]

شیخ محمد ابراہیم ذوق

از مدت سی۳۰ سال بمشق سخن می پردازد و در سرکار مرشد زادہ آفاق مرزا ولیعہد بہادر علم امتیاز می افرازد، قوت مشقی کہ او راست دیگرے را دیدہ نشد و لہذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویان است در کلامش کمتر و بر جمیع اصنافِ سخن قدرت تمام دارد (اعظم گلشن بیخار)

صاحبِ قوتِ فکر خداداد دست بر جمیع اصنافِ سخن قدرتی کہ او راست در ریختہ سرایان کم یافت، گفتارش در پاکی زبان و بلندیِ معانی و شوخیِ اشارت و کرسی نشینی ترکیب و بست قافیہ و نشست ردیف طراز یکتائی دارد (اعظم طور کلیم)

محمد ابراہیم، ذوق تخلص، دلی کے رہنے والے اور شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے، ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے، حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی، وہ شاعر بھی تھے، شوق تخلص تھا، انہی کی صحبت میں ان کو بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا، کچھ کچھ کہنے لگے، جب سن تمیز کو پہونچے تو شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے اور بحکم ضرورت فارسی اور عربی کی کچھ درسی کتابیں بھی موقع پا کر کسی سے پڑھ لیں،

طبیعت مناسب تھی، چند روز میں مشق سخن بڑھ گئی، مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے رفتہ رفتہ مرزا ابوظفر کے دربار میں رسائی ہو گئی، جو اُس زمانہ میں ولیعہد تھے، چند دنوں سے وہ اپنا کلام اصلاح کے لئے اُن کو دینے لگے،

اُسی زمانہ میں اُنھوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک پرزور قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں ان کو "خاقانیِ ہند" کا خطاب عنایت ہوا، ان کا سن اُس وقت انیس سال کا تھا جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے، تو سو روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ کر دی، اور آخر میں ایک گاؤں بھی

جاگیر میں دیا، مگر اس سے زیادہ متمتع نہیں ہو سکے، ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ میں غدر سے دو برس پہلے وفات پائی،

غدر میں ان کا سارا کلام تلف ہو گیا، حافظ غلام رسول ویران نے جو ان کے شاگرد رشید تھے کچھ اپنی یاد سے اور کچھ احباب کی مدد سے ایک مختصر دیوان مرتب کرکے شائع کیا، جس میں اکثر غزلیں تمام، اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں،

بہت دنوں کے بعد مولوی محمد حسین آزاد نے کوشش کی اور ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا جس سے کچھ ناتمام غزلیں پوری ہو گئیں، کچھ قصیدوں اور غزلوں کا اضافہ ہو گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے فانی الشعر آدمی کی یہ ساری کمائی نہیں ہو سکتی، اگر کلام ضائع نہ جاتا تو تین چار ضخیم جلدیں بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتیں، کلام کے باب میں جو رائے آزاد نے دی ہے اس پر کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا، انھوں نے ٹھیک کہا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے، مگر رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا، ابتدا میں مرزا رفیع سودا کا انداز تھا، جب نواب الٰہی بخش خاں معروف[1] کی صحبت

---

[1] نواب الٰہی بخش خاں معروف تخلص، نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کے خسر، نہایت بامذاق، زندہ دل اور درویش مزاج امیر تھے، بزرگانِ دین کی صحبت میں ترک و تجرید کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، مگر شعر و سخن کا شوق عنفوانِ شباب سے مرتے دم تک قائم رہا، مشقِ سخن شاہ نصیر سے کی تھی، آزاد نے آبِ حیات میں جس طرح سے ظفر مرحوم کی [illegible] ذکر پر پانی پھیرا ہے، انھیں بھی تابع فکر اپنے شاگرد ذوق کے دامنِ کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس [illegible] وقت [illegible] شہرت [illegible] تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے [illegible] میں اس کا [illegible] رہا،

مصحفی نے تذکرہ شعرا ۱۲۰۹ھ میں تالیف کیا ہے، اس میں ذوق کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے (بقیہ صفحہ ۲۸۹ پر)

میں پہونچے جو خواجہ میر درد کے انداز کو پسند کرتے تھے، اُن کی غزلیں خواجہ صاحب کے انداز میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸) کیونکہ ذوق کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ دس برس کی رہی ہوگی مگر نواب الٰہی بخش خاں معروف کا تذکرہ ہی لکھتے ہیں کہ "شاگردی میاں نصیر نازش دارد، و فکر شعر نیز بر پریشانی اوقات میکند در بیت و مشاعرہ صاحب عالم شریک غزل طرحی نیز بعد دو ماہ مشہور کرد" یہ اُن کا قصہ ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف سیر و تفریح کے لئے لکھنؤ آئے اور دو مہینہ رہ کر دلی واپس گئے ہیں اب اس کے بعد آزاد کے ان فقروں کو پڑھو: جو دیوان معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال انہی کا (یعنی ذوق کا) اصلاح کیا ہوا ہے نواب خود اکثر ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کرکے مضمون کو لفظوں میں نہیں بٹھا سکتے تھے آزاد کے حقائق و دقائق کیا پہنچے تو رو بحق نواب کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہیں اور کوئی شعر سبزی کے مضمون سے خالی نہیں اس کا نام تسبیح زمرد ہے، آزاد کہتے ہیں کہ یہ تسبیح بھی استاد ہی کے ... جو مرنے پر دلی گئی۔

نواب نے سنہ ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی، اشعار ملاحظہ ہوں۔

معروف اب تو دیکھتے ہو تم ہمیں غریب
ٹک منہ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھئے

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ولے
مر کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لیجائے

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل
کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جاتے ہو

گریہ و آہ و فغاں سے ایک دم فرصت نہیں
ہم سمجھتے تھے محبت کام بیکاروں کا ہے

درد سر میں ہے کسے صندل لگانے کا دماغ
اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے

بنانے لگے، مرزا ابوظفر نوجوان تھے، وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے، اُن کی غزلیں جرأت کے انداز میں بناتے تھے، نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ خود اُن کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہاے رنگارنگ کا ہوتی تھی، دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے

(دیکھو آبحیات)

وُہ عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں ہم ——— کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا
کہیں تجکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا ——— پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا
گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹے سرِ سوزن ——— مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

سب کو دیکھا اُس سے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ ——— وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اُس میں ربط ہی گویا برنگِ بوئے گل ——— وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

موت اُسکو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور ——— یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا ——— لکھدیا تھا کوہکن بھی نام اک مزدور کا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا ——— کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

سکے ہے خنجرِ قاتل سے یوں گلو میرا ——— کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر — یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا
ذوق بیمار محبت سے خدا دور کرے — نہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جانبر نہ ہوا

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا — تم وقت پہ آ پہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اس سے تو اور آج وہ بے درد ہو گیا — جب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا
سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر — نشتر کا نام سنتے ہی منھ زرد ہو گیا

نکالی زلف کو شانہ نے جب الجھی پکارا دل — یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی اے بے ادب آیا
ترے در سے نہ آیا پاس کوئی نیچا ہو کے — مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

سن کے مجنوں نے مرے شور جنوں کو یوں کہا — واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈھ کر — دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب — اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

مصری سی ہے اس کے آستانے کی یاں گالیاں — [illegible]

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں

نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

مچھوڑا تار وحشت نے ہماری جیب و داماں میں مگر تارِ نفس سینہ میں الجھا یا گریباں میں

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

جو مانگوں موت دردِ ہجر سے مجکو نہیں دیا کہ نامِ عشق لوں اور اس قدر راحت طلب ہوں میں

سینہ و دل پہ مرے زخم و جگر ہنستے ہیں ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے میں

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں کیا جانے لکھدیا اُسے کیا اضطراب میں

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط ہو جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اُس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

ہم متبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

عبث تم پیار کا وٹ سے منہ بناتے ہو
وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

دیکھا دمِ نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوق دمِ شام کو

نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیر جاناں کو
نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو

لبیک و اذان، ناقوس و جرس یا خندۂ قلقل، نالۂ نے
دل کھینچنے میں ہاں کوئی ہو، یہ ایک نوائے دلکش ہو

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اف ری بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

ترے کوچہ کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

نگہ کیا بہ ادا کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا اور اس کو ہم تیرِ قضا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

ہر اک گردش میں سو انداز ناز و فتنہ سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سرمہ سا سمجھے

نہ دی رخصت نظر کو میری جانب کیوں تغافل سے
اسے بھی آپ کیا میرا ہی بختِ نارسا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حساب و شمار دردِ دل اگر وہ دربا سمجھے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

نہیں جز شمع تو اور مری بالینِ سر زار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے دو ہی تو ہیں عیادت والے

ہے تیرے کان تک جو معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بات ہماری لگی ہوئی

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی

کرتی ہے زیرِ برقعِ فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

[illegible]
[illegible]

[illegible]
مگر [illegible] دل [illegible] کرتے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے　　تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
سراغ عمر گذشتہ کا کیجئے گر ذوق　　تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں بکتا　　تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے
وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن　　لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

قسمت برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر　　سو بھی آ کر تا سر مژگاں حیا سے پھر گئی

زخمی میں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے　　جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　چلی تھی برچھی کسی پہ کسی کے آن لگی

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشم فتاں سے　　گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اسکی مژگاں سے

دل صاف ہو تو چاہئے معنی پرست ہو　　آئینہ خاک صاف ہو صورت پرست ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب　　ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

ساقیا عید ہے لا ساغر و مینا بھر کے　　بادہ آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر کے

نہیں مژگاں پہ خوں ناب غم بھی دل نشیں نکلے ۔۔۔ جنوں یہ نیشتر کیسے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

بار بار دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل ۔۔۔ سو بار آبلے اُسے آنکھیں دکھا چکے

کوئی کم کو تر می ہوا اگر کم تر تو سے کہے ۔۔۔ کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے ۔۔۔ مری توبہ پہ توبہ توبہ استغفار کرتی ہے

اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے ۔۔۔ لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

جو کہوگے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی ۔۔۔ آپ کی گر یوں خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

بہادر شاہ ظفر

باکثر صفات موصوف و بمحامد و مکارم معروف در اکثر خطوط دستگاہے شایستہ دارد و باین فن لسانیہ مالوف ہست، شیخ ابراہیم ذوق از مادحان نعمتش زلہ ربا و وظیفہ خوار است، (از گلشن بیخار)

در خطاطی دست بلند داشت و در سخن پایہ ارجمند گفتارش اگرچہ سادہ و پرکار ہست اما پسند خاطر شگار ہست محاورہ گوئی زبان او ہست معاملہ نویسی زیر فرمان او، (از بزم سخن)

ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ، اکبر ثانی کے بیٹے تھے، اور شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے، ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے

برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، اور ان کی حکومت دہلی میں قلعۂ معلی کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی،

لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی داد اسے ترکہ میں ملی تھی، اور اردوئے معلی اُس کے زیر نگیں تھا افسوس ہے کہ اس کو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخشدیا

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا — بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا

آبحیات میں استاد ذوق کے حالات پڑھو، ظفر سے یہ کہا جاتا ہے۔ کوئی شعر پورا کوئی ڈیڑھ مصرع کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف و قافیہ باقی تھا، استاد ذوق ان ہڈیوں پر گوشت و پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے، پہلا دیوان نصف سے زیادہ باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم (استاد ذوق) کے ہیں،

لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے، وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہو چکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو، پھر اپنی فطرت سلیم سے فتوی لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوق پھر بھی ذوق ہیں، ظفر کے استاد، انکے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے ہیں، جو سامان نظر آئیگا، وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا، اور ہونا بھی چاہئے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی، مگر جوش و خروش کی جگہ [illegible] الفاظ بنکر آنسوؤں کی میاسی اور درد و غم سے قلم سے نکلے ہوئے [illegible] ہیں ظفر کا سمجھ یا ذوق کا،

۱۲۷۱ھ میں جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا تو مرزا نوشہ غالب کے متعلق،

خدمت ہوگئی تھی، مولانا حالی نے یادگار غالب میں جہاں اس کا ذکر کیا ہے، وہاں انھوں نے بھی بجائے ذوق کے غالب کے متعلق ناظر حسین مرزا کی زبانی آزاد کے اسی مضمون کو دہرایا ہے مگر مقدمہ دیوان حالی میں ایک موقع پر ذوق و ظفر کے کلام میں قریب قریب اسی طرح کا فرق بیان کیا ہے، جو میں نے لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "ذوق کی غزلوں میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے، مگر وہ جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے، لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے"

اس بحث کے بعد میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے استاد کی کاوش فکر مسلم، مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر استاد ذوق کو ان کے دیوانوں کا مالک بنا دیا جائے،

اس بدنصیب بادشاہ کی ساری زندگی روتی جھینکتی گذری اور عمر بھر ان کے ارمان دل ہی میں رہے، سلطنت کا خواب جو دیکھا تھا اس کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قلعہ معلی سے بھی نکال کر رنگون پھینک دیئے گئے،

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

جوان جوان بیٹے اور پوتے ان کی آنکھوں کے سامنے انگریز کے گولی مار دیئے گئے طوق و سلاسل اور خدا جانے کیا کیا، جو کچھ بھی اس منحوس شاعری کی بدولت انکو ہی ہوئی ہوگی وہ سب نکل گئی، اور جتنے دنوں کی زندگی تھی رنگون کے بالاخانہ میں بے کسی و بے بسی کے ساتھ پوری کر کے ۱۲۷۹ھ میں پیوند زمین ہو گئے، اور اس قدر بھی نصیب نہ ہوا کہ انکو گور و کفن ملا بھی یا نہیں، تسلیم،

نہ شامیانہ نہ شمع تربت، نہ موج سبزہ نہ چادر گل — بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہی بیکسی کی

ظفر مرحوم کا کلام ملاحظہ ہو،

ہم اپنے کنج غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں — ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

سر تلک دست ستم جوں ہی ترا قاتل اٹھا — خون جسم ناتواں کی مثل شمع تا سر چڑھا

تم لاکھ کرو حضرتِ دل نالہ و فریاد — چاہو کہ بجز اس کو اثر ہو نہیں سکتا

کیا کان بھر دیئے ہیں خدا جانے غیر نے — غصہ میں جو پھرے ہے وہ کافر پھرا پھرا

ظالم ترے چپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا — کیا جانے کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا

دنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا — ہم نے یہی پایا کہ برا نام نہ پایا

ضبط فریاد کروں، گریہ کو روکوں لیکن — دل بے تاب کو تھاموں یہ نہیں ہو سکتا

وہ کھا گئے سوگند مرے آگے قسم جھوٹ — اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

ہوں جو ٹیڑھے ترچھے دکھلا انکو اپنا بانکپن — ہم ہیں سیدھے سادھے ہم سے بات کر سیدھی طرح

صد آرزوے وصال و حیات نیم نفس — نفس شماری و اندوہ بے شمار دریغ

یہ رنجشیں تو شکایات و عنایات میں فرق — لیکن ایسا نہ ہو جائے ملاقات میں فرق

رہا ہی کیا وہ مجھ سے چھین کر بیٹھے تو کیا لیتے — دل و دیں لے چکے تھے اب اگر لیتے تو کیا لیتے

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد — اب تو اس کوچے میں لے باد سحر خاک نہیں

دل دے کے انکو ایسی اذیت ہوئی ہمیں — اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں

ہو گیا اور زیادہ وہ کشیدہ ہم سے — دوستو کیا کشش دل کا اثر پوچھتے ہو

نہیں معلوم ظفر اس سے ہوئیں کیا باتیں — چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبہ کا — کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں [illegible] — دل گم گشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے

خدا بچائے ظفر دوستی سے اس دل کی — جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

نہ پہنچا کوئی اپنے پاس پہنچا جب کہ وقت اپنا
اجل کو تو نہیں ہر وقت پر پہنچی تو یہ پہنچی

وقت پر جو کام آئے دوست اسکو جانئے
ورنہ رہتا ہے ظفر یاں کام کس کا بند ہے

جنون میں کیا کہیں ہم پاؤں پیراہن سے نکلے
کہ اک تار بھی چھوڑا ہے تو [illegible]

اسی کو دوست سمجھتے ہیں وہ جو کچھ نہ کہے
کرے جو ان سے سوال و جواب دشمن ہے

یہ کیا ستم ہے کہ ہم کہیں رو رو کے اپنا حال
سنا کیا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

میں جو کہتا ہوں بے وفا ہے رقیب
وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو کیسا ہے

حکیم محمد مومن خاں مومن

برعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ، در ہر جنس آنجناں مکانتی دارد کہ کسی را در یک صنعت ہم میسر نیامدہ، اگر حظے از فہم خداداد داری، بیا دیوانش نظر کن وبتصدیق و تکذیب من زبان بگشا، (از گلشن بیخار)

محمد مومن خاں نام، مومن تخلص، حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں جب صلاحیت درست ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انہی کی [illegible]

نسخہ نویسی کی،

اُسی زمانہ میں نجوم کا شوق پیدا ہوا، اسکو بھی اہل کمال سے حاصل کیا اور نہایت [illegible] بہم پہنچائی، شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی، عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا، ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا، پھر خداداد کے اطمینان پر اصلاح لینی چھوڑ دی، اور مشق سخن کی،

[illegible] طبع رنگین [illegible] خوش [illegible] عاشق مزاج [illegible] درد ناک اور زیادہ دلپسند [illegible] ساتھ پڑھتے تھے [illegible] پیدا ہوا [illegible] خالی نہ تھے، جوانی میں حضرت سید احمد شہید سعیدؒ کے مرید ہوئے اور [illegible] عقائد میں انہی کے پیرو و متبع رہے، کلیات میں ایک مثنوی جہادیہ ہے، جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحب سکھوں سے جہاد کر رہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ اُن کی امامت کے ہیں جن میں سے ایک کے دو چار شعر یہ ہیں،

گلاب نامہ سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ | کہ فکر مدحت سبط نسیم کو تر ہے
وہ کون امام جہان و جہانیان احمدؒ | کہ مخفی مقتدی سنت پیمبرؐ ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعوی نور | کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اُسے سوائے جہاد | جو کوئی اُس سے مقابل ہو سو وہ کافر ہے
وہ بادشاہ ملائک سپاہ کو کب دین | کہ نور شمس و قمر جس کی گرد لشکر ہے
وہ برق خرمن ارباب شرک و اہل ضلال | کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ شاہ مملکت ایمان کہ جس کا سال خروج | امام برحق مہدی نشان عسکر ہے

تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ و تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے، مگر ان کے ذہن و ذکاوت طبع کی

تعریف نہیں ہو سکتی کہ ان کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا ہے مولانا شاہ عبد العزیز کی وفات کی تاریخ کہتے ہیں،

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے — فقہ و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
۱۲۳۵ھ

اپنے والد کے تاریخ وفات میں کہتے ہیں،

بہ الہام گشت سالِ وفات — کہ غلام نبی بحق پیوست
۱۲۴۱ھ

صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات،

خاک بر فرقِ دولتِ دنیا — من فشاندم خزانہ بر سرِ خاک
۱۲۴۳ھ

بیٹی کی تاریخ ولادت،

نام لینے کے ساتھ ہاتف نے — [illegible] دختر مومن
۱۲۵۹ھ

کلیات میں قصیدے بھی ہیں جو اپنے درجہ میں عالی رتبہ رکھتے ہیں، لیکن [illegible] کی امید پر اہلِ دنیا کی مدح میں کبھی قصیدہ نہیں کہا۔ راجہ اجیت سنگھ [illegible] میں جو قصیدہ ہے، اس کا ایک خاص سبب ہے، ایک دن راجہ اپنے مصاحبوں کو لیے [illegible] دلی میں سرِ راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے، خاں صاحب کا ادھر سے گزر ہوا، لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں، راجہ نے آدمی بھیجکر بلوایا، عزت و تعظیم سے بٹھایا [illegible] ہتھنی کس لاؤ، ہتھنی آئی تو خانصاحب کو عنایت کی، یہ قصیدہ اسی کا شکریہ ہے۔

نواب وزیر الدولہ بہادر فرمانروائے ٹونک کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے،

یاد ایامِ عشرت [illegible]

مگر یہ قصیدہ بھی صلہ کی امید پر نہیں لکھا [illegible]

قدس سرہٗ سے بیعت بھی، بیعت ہی نہیں تھی عشق تھا، اس لحاظ سے مومن خاں اُن کے روحانی بھائی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مومن ٹونک آئیں، اور نواب کے ساتھ رہیں، مگر خاں صاحب سے دلّی کی گلیاں کب چھٹ سکتی تھیں، علاوہ اس کے ایسے رنگین مزاج کا نواب جیسے مقدس اور متشرع سے ساتھ گذر کیسے ہو سکتا تھا، (؟)

میں ہوں [illegible] تو ہے مقدس [illegible] تیرا میل نہیں

پھر بھی یہ تحفہ معذرت کا قصیدہ لکھ کر بھیج دیا۔

ان دونوں قصیدوں کے سوا ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ہے، ایک نعت میں، ایک ایک خلفائے راشدینؓ اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی منقبت میں، کلیات میں آٹھ مثنویاں ہیں جن میں سے ایک دو ناتمام ہیں، اور ان کا انداز وہی ہے جو غزلوں کا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ بہت گری ہوئی ہیں، دیوان میں مخمس، مسدس، ترجیع بند، مرثیہ وغیرہ بھی کچھ ہے، اور خاں صاحب کا انداز ہر جگہ قائم ہے۔ اس کلیات کو پہلے ان کے شاگرد رشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جمع کیا تھا پھر میر عبدالرحمٰن خلف میر حسن تسکین (خاں صاحب کے فرزند نسبتی) نے از سر نو مرتب کیا، جو کئی بار چھپ چکا ہے،

علاوہ اس کے ان کا دیوان فارسی بھی چھپ گیا ہے، وہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے، اور جو خوبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ اس میں بھی ہیں (ملاحظہ ہو ذیل)[1]

---

[1] ایک [illegible] دیوان فارسی [illegible] حکیم احسن اللہ مرحوم نے مرتب کی [illegible] مطبع سلطانی میں ۱۲۵۵ھ سے قبل چھپی۔

آزاد نے آبحیات میں مومن کے کلام کی نسبت جو رائے ظاہر کی ہے، اُس کو سن لو پھر جو بات
...رے گی اُس کو میں بیان کرونگا،

"اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں، استعارہ اور تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہونچایا ہے، ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں، اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے، وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفتِ خاص کے لحاظ سے ذاتِ شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف و لطیف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں، اکثر عمدہ ترکیبیں نادر تراشیں فارسی کی اور استعارے و اضافتیں اردو میں استعمال کرکے کلام کو نمکین کرتے ہیں"

...بات یہ ہے کہ جو جذبات و خیالات غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں وہ سب قدما کے
...میں آگئے، اور جتنے لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان کے ہو سکتے ہیں، وہ سب ختم ہو گئے
...تھا کہ متاخرین اُس دائرہ سے نکل کر ہر قسم کے خیالات پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم
...دیتے تو ان کو زیادہ وسیع اور فراخ میدان مل جاتا، مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا،
...محدود دائرے میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں،

مومن خاں کے ہمعصروں میں مرزا غالب نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے، مگر جیسا کہ
...مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ مومن خاں، جو ہر اس خصوصیت
...مرزا سے بھی سبقت لے گئے، حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان
...نزاکت و لطافت پیدا کردی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانیٔ طبیعت کا تماشا گاہ
...قصیدوں میں، غزلوں میں، مثنویوں میں، ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں
...افسوس ہے کہ ان کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوشِ فکر کے نتائج کو لوگوں میں نمایاں کرتا

ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے، کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں، مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے، کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزاء چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اُس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی کبھی بے عتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور اس کے سمجھنے میں کاوش فکر کی ضرورت پڑتی ہے،

افسوس ہے کہ اس جامع کمالات ہستی نے بہار زندگی کے صرف باون سال مزے لیکر ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی اور مہدیپورہ میں دلی دروازہ کے باہر حضرت شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ کے مقبرہ کے پاس سپرد خاک کیے گئے،

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضائی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

نہ جاؤنگا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا
اگر نہ ہوے گا نقشا تمھارے گھر کا سا

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق میں
بالیں سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہنچا

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل — تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

نہ مانوں گو نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں — کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں — نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا — میں الزام اُنکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

تیز دستیٔ کشش سے تھے مجھ سے تجھے دنیا کا غم نہ تھا — جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا
بد کام کا مآل برا ہے جزا کے دن — حالِ سپہرِ تفرقہ انداز دیکھنا

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے — تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا

ہجرِ بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاشِ زہر — غم پر حرام خورِ توکل نہ ہو سکا

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اس پہ بھی — کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملا دیا

چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا — جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہوا

اس ضعف میں تو آتا ہے سینہ سے لب تلک — کہتے ہیں اپنے نالہ کو ہم نارسا عبث

مر جائیں کہیں کہ تو غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے — کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
اس کوچہ میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق — آج اور زور کرتے ہیں ناطاقتی سے ہم

خنجر کو نہ توڑ سخت جانی — پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

گر ہے دلِ غیر نقشِ تحریر — تو تیرے لئے جلائیں گے ہم

اے تپِ ہجر دیکھ مومن یاں — ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

نہ میں اپنا، نہ دل اپنا، نہ تم میرے نہ جاں میری — اثر کس کس کو ہو ہونے بھی گر فریادِ بیکس ہیں

وہ سمجھو تو جانِ من وصالِ غیر پہ ہر دم — مری جان کون ہے کس کی جھوٹی کھاتے ہو قسمیں

یار تھے یا دشمنِ جاں تھے الٰہی چارہ گر — لے چلے مرتے ہی زنداں سے سوئے صحرا ہمیں

شیریں پہ طعنِ تلخیِ فرہاد کس لئے — مجکو بھی کچھ مزا نہ ملا تیری چاہ میں
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ

بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں
ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیر کی بات — ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں
غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ — آرزو ہائے دلِ درد آشنا کہنے کو ہیں

زچا ہوں روز جہاد اور یہ ستم دیکھو — کب آزماتے ہیں جب وقت امتحاں نہیں

ہیں غیر در سے نکلنے سے خوش — گویا کہ میں اُن کا مدعا ہوں

کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جلتے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
جز نہ سپہر ہیں مرے دشمن تو اور بھی — لیکن بڑے ستم یہی دو تین چار ہیں
کیسے گلے رقیب کے، کیا طعن اقربا — اپنا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا ولے — مجھ سے بیاں نہ کیجے عدو کے پیام کو

کچھ شور محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو — ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکیں یہ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

توبہ گنہ عشق سے فرماتے ہیں واعظ — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے — اوس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات سے
چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو — کہ شبِ غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے
بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں — تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

عذابِ ایزدی بجا کہ ہم مانا بس اب مومن — خدا کے واسطے ذکرِ ستم ہائے بتاں کیجے

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے — نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے
جفائے یار پہ سونپا معاملہ دل کا — اب آگے ہو نہ ہو امیدِ انفصال تو ہے

کیونکر نہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

تسلی دمِ واپسیں ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

مرزا اسد اللہ خاں غالب

"در اوائل حال بتقاضائے طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبد القادر بیدل سخن می گفت و وقت آفرینیہا میکرد، آخر الامر از آں طریقہ اندازے مطبوع ابداع نمودہ بعد ترتیب و تکمیل دیگر نگرفیۂ فراواں ابیات از آں حذف و ساقط کردہ قدر قلیلے انتخاب زدہ۔"
(۔ گلشن بیخار)

اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا، پہلے اسد تخلص کرتے تھے، پھر بمناسبت اسد اللہ غالب کے غالب اختیار کیا، والد کا نام عبداللہ بیگ تھا، جب پانچ برس کی عمر ہوئی اس وقت باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مرزا نصر اللہ بیگ حقیقی چچا نا؟ ڈیک کے لشکر میں چارسو سواروں کے رسالدار تھے، ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے نواح آگرہ میں سرکار سے مقرر تھے، انھوں نے بھتیجے کی پرورش کی، چچا کے مرنے کے بعد ان کے وارثوں کی پنشن سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست میں مقرر کرا دی جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی غدر تک ملتا رہا، پچاس روپیہ ہوا، خلعت و خطاب کے ساتھ تاریخ خاندان تیموریہ کے لکھنے کے معاوضہ میں ابو ظفر بہادر شاہ نے مقرر کر دیئے تھے،

غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہو گئی، اور بہادر شاہ سے تعلقات رکھنے کی پاداش میں پنشن بھی جاتی رہی دو برس انھوں نے جس مصیبت سے کاٹے وہ انھی کا کام تھا اس کے بعد یہ رامپور

بعدہ رامپور چلے گئے، اور نواب یوسف علی خان[1] ناظم رامپور نے ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی اور اگر رامپور مین رہین تو سو روپیہ مہینہ دعوت کا، مگر دلی چھوڑ کر رام پور کیونکر رہ سکتے. واپس آئے اور تین سال کی جد وجہد مین پنشن بھی جاری ہو گئی، علاوہ اس کے قصیدون کے صلے فتوح غیبی کے طور پر کبھی کبھی مل جاتے تھے، اس مین جس طرح سے بن پڑا زندگی بسر

[1] نواب یوسف علی خان خلف نواب محمد سعید خان والی رامپور علم دوست اور ہنر پرور رئیس تھے مولانا فضل حق خیرآبادی، مرزا نوشہ غالب، میر حسین تسکین، مظفر علی خان اسیر، منشی امیر احمد اور بہت سے علما و شعرا انکے دامنِ دولت سے وابستہ تھے، ابتدا مین حکیم محمد مومن خان مرحوم سے مشق سخن کی، ان کے بعد مرزا نوشہ غالب کے شاگرد ہوئے، پھر منشی مظفر علی اسیر کو کلام دکھلانے لگے.

غدر ۱۸۵۷ء مین گورنمنٹ انگریزی کی مدد دینے کے صلہ مین کچھ علاقہ بھی ان کو ملا، اور علاوہ دیگر خطابات کے فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ کا خطاب عنایت ہوا، ۱۲۸۱ھ مین وفات پائی، صاحب دیوان مین، صرف ایک غزل ان کی یہان نقل کرتا ہون،

مین نے کہا کہ دعوی الفت مگر غلط	کہنے لگے کہ ہان غلط اور کس قدر غلط
تاثیر آہ و زاریِ شبہائے تار جھوٹ	آوازۂ قبول دعائے سحر غلط
سوزِ جگر سے ہونٹ پہ تبخالہ افزا	شور فغان سے جنبشِ دیوار و در غلط
ہان سینہ سے نمایشِ داغِ درون دروغ	ہان آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط
آ جائے کوئی دم مین تو کیا کچھ نہ کیجئے	عشقِ مجاز چشمِ حقیقت نگر غلط
بوس و کنار کے لئے یہ سب فریب ہین	اظہار پاکبازی و ذوقِ نظر غلط
تو صاحب آفتاب کہان اور ہم کہان	احمق نہین ہم اس کو نہ سمجھین اگر غلط
مٹھی مین کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی	جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط

کردی، نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی سے تیرہ برس کے سن میں شادی ہوئی تھی۔ اس تقریب سے دلی آرہے تھے، مگر زندگی بھر گھر نہیں بنایا، دوستوں کے گھر میں مستعار رہے، یا کرایہ کے مکان میں عمر کاٹ دی، بیٹے بیٹیاں بہت سی ہوئیں مگر بچپنے میں مر گئیں، آخر میں بیوی کے بھانجے نواب زین العابدین خان عارف کے دو یتیم بچوں کو لیکر پرورش کیا۔ اور انہی کو بیٹا بیٹی سمجھتے رہے،

مرزا شگفتہ مزاج تھے، ذہن و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی لاجواب رکھتے تھے، شوخی اور ظرافت ان کے دم قدم کیساتھ تھی، تحریر ہو یا تقریر کوئی بات ان کی لطافت و ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی، میرزایانہ تمکنت مزاج کے ساتھ مروت و دوستی کا نباہ، وضعداری کا پاس و لحاظ حد سے زیادہ تھا،

شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، حسن اتفاق سے ہرمزد نام ایک پارسی نے جو ژند و پاژند کا عالم تھا اسلام قبول کیا، اور اسکا اسلامی نام ملا عبد الصمد رکھا گیا، وہ ایام سیاحت میں ہندوستان آنکلا، اس وقت مرزا کی عمر چودہ برس کی تھی، مگر ذہن مناسبت ازلی طبیعت میں تھی، اس کو دو برس تک گھر میں مہمان رکھکر اکتساب کمال کیا، اور فارسی میں انکی طبیعت کے وہ جوہر دکھائے کہ باید و شاید،

عربی میں صرف و نحو کے سوا اُستاد سے اور کچھ نہیں پڑھا تھا، گرچونکہ علم سے فطری مناسبت تھی، ان کی اردو فارسی کی نظم و نثر دیکھکر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص عربیت سے ناواقف ہے، عربی الفاظ کو ہر جگہ اسی سلیقہ سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل سے اس کی توقع ہو سکتی ہے،

ملا عبد الصمد کی صحبت میں فارسیت کا رنگ ان کی قوت تخیلہ پر خوب چڑھ گیا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۳)

وہ پوچھتے پھر میں کہ غالب کدھر گیا — مرنے کی اپنی روز اڑی تھی خبر غلط

یہ کچھ نہ تھا جواب میں ناحق ستم کیا — کیوں یہ کہا کہ دعوی الفت مگر غلط

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مرزا عبدالقادر بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، اسی وجہ سے جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی، مرزا نے اردو میں اسی پر چلنا شروع کر دیا،

مولانا حالی نے یادگار غالب میں کچھ اشعار اس زمانہ کے نقل کیے ہیں[1] مگر اب بھی اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار موجود ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق مشکل ہو سکتا ہے، مثلاً :-

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل　　کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا　　تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا　　جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ　　اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

---

[1] جو اشعار مرزا نے دیوان سے نکال ڈالے ہیں ان میں سے سات شعر مولانا حالی نے یادگار غالب میں نقل کیے ہیں بطور نمونہ کے دو چار شعر نقل کرتا ہوں ؎

بحسرت گاہ ناز کشتہ جان بخشی خوباں　　خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا
پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبہ بالش　　خیال شوخی خوباں کو راحت آفریں پایا

یک غفلت دور افتادہ ذوق فنا نہ　　اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا　　گویا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

کرے گر فکر تعمیر خرابیہائے دل گردوں　　نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں ز قالب سا

سنا گیا ہے کہ مرزا کے اس ناپسندیدہ انداز سے مفتی صدر الدین خان بہت آزردہ تھے اور ہر موقع پر ان کی اس بے راہ روی کی مذمت فرماتے تھے، دلی کے بعض ظرفا مشاعروں میں غزلیں لکھ کر لیجاتے، جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔[1]

[1] آزاد نے آبِ حیات میں حکیم آغا جان عیش اور ... شعرا کے تذکرہ کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ حکیم صاحب کے اشارے پر بعض طالبانِ سخن کو شوکمین بھی مانتا تھا، چنانچہ بعض غزلیں سرِ مشاعرہ پڑھا تھا جس کے الفاظ نہایت شستہ اور رنگین لیکن شعر بالکل بے معنی اور کہدیا تھا کہ یہ غالب کے انداز میں غزل لکھی ہے ایک مطلع یاد ہے

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شبہۂ مضراب نہیں

ایک مرتبہ مشاعرہ میں مرزا بھی تھے اور حکیم آغا جان عیش بھی، انھوں نے طرحی غزل میں یہ قطعہ پڑھا،

گر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ایک دفعہ مولوی عبد القادر رامپوری نے جو نہایت ظریف اور خوش مذاق فاضل تھے، مرزا سے کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے، ؎

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے میں ڈال

مرزا سنکر حیران ہوئے کہا کہ یہ میرا شعر نہیں ہے، انھوں نے اصرار کیا، آخر کو مرزا سمجھ گئے کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور جتاتے ہیں کہ تمھارے اسی قسم کے اشعار ہوتے ہیں،

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی میں جابجا اشارہ کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں: ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے،

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

حسن تعلق رکھو مولانا فضل حق خیرآبادی دلی میں سررشتہ دار کمشنری تھے، بزرگوں کے وطن کے لحاظ سے، ان کو خیرآبادی کہہ لو مگر حقیقت میں ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا سب دلی میں گذرا تھا، یہ اور مفتی صدرالدین خاں ہمسن و ہم سبق اور دوستی کے لحاظ سے یکجان و دو قالب تھے، مرزا نوشہ دلی میں رہے تو ان سے بھی رسم پیدا ہوئی، اور رفتہ رفتہ بڑھ گئی، یہانتک کہ مرزا ان کو اپنا مخلص بے ریا سمجھنے لگے، مفتی صاحب کی طعن و تعریض کو تو شاید کسی اور بات پر بھی محمول کرتے ہوں، مگر جب مولانا فضل حق نے روک ٹوک شروع کی، تو ان کے کان کھڑے ہوئے، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث سے قریب اشعار نکال ڈالے، اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا،

مرزا کی خصوصیات شاعری پر حالی نے بہت استیعاب کے ساتھ بحث کی ہے، موقع اسکی تفصیل کا نہیں ہے، تاہم جہانتک ممکن ہی اختصار کے ساتھ کچھ کچھ بیان کرونگا، حالی کی رائے ہے کہ میر و مرزا سے لیکر ذوق تک جتنے شعرا گذرے ہیں، اُن کا ایک محدود دائرہ ہے، جس سے وہ کم نکلتے ہیں، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہی کہ جو مضمون پہلے کسی طور پر بندھ چکا ہی، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب سے بیان کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے، برخلاف ان کے مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے اچھوتے مضامین پر رکھی ہی جن کو اور شعرا کی فکر نے مس نہیں کیا تھا، اور معمولی مضمون ایسے طریقے سے ادا کئے ہیں جو سب سے نرالا ہے،

میری رائے ناقص میں یہ عقیدہ اس حد تک صحیح اور قابل تسلیم ہی کہ مرزا نے اپنے تغزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہی جن کو اور شعرا کی فکر نے مس تک نہیں کیا وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے

یہ ضرور نہیں کہ ہر ایک مضمون انکا نیا ہی ہو،

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ان سے جہاں تک ہو سکتا ہے بچتے ہیں، اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدۂ وصال سے، استخواں کو خشت سے، بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی بہت سی تشبیہیں اُن کے ابتدائی ریختہ میں موجود ہیں،

ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوند کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں، سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے بڑھکر ہیں، مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں، تو متانت ان کے ہاں سے رخصت ہو جاتی ہے،

ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو مومن کے سوا اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے اُن کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اُن سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جسکی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے،

مرزا کا معمول تھا کہ وہ نظم ہو یا نثر نہایت کاوش سے لکھا کرتے تھے، مگر باوجود اس عادت کے اپنی ذکاوت اور جودت طبیعت سے بدیہہ گوئی کی بھی مشق پیدا کر لی تھی،

لطیفہ | کلکتہ میں مولوی کرم حسین مرزا کے ایک دوست نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مرزا سے کہا کہ اسکی کچھ تشبیہات نظم کیجئے، مرزا نے وہیں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا، اور ان کے صلہ میں وہ ڈلی ان سے

لی، کچھ سات شعر اس کے ملاحظہ ہوں،

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی | زیب دیتا ہے اُسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے | ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجیے | خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجیے فرض | نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز | میکدہ میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
مسیِ آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے | سرِ پستانِ پریزادسے مانا کہیے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجیے فرض | اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

اردو میں اٹھارہ سو شعر کا ایک انتخابی دیوان چھپ گیا ہے، اُس میں اکثر تمام کچھ ناتمام غزلیں ہیں، کچھ متفرق اشعار، دو قصیدے، کچھ رباعیاں اور قطعے،

عود ہندی ایک مجموعہ ہے جس میں اردو کی کچھ تقریظیں، کچھ خطوط ہیں، اردوے معلی ایک دوسرا مجموعہ ہے جس میں شاگردوں نے جس قدر اردو کے خطوط انکے ہاتھ آئے جمع کردیئے ہیں، ان خطوط کی عبارت ایسی ہے، گویا وہ آپ کے سامنے بیٹھے گل افشانی کررہے ہیں، بقول آزاد ان کے خطوط کی طرزِ عبارت ایک خاص قسم کی ہے، کچھ ظرافت، کچھ چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہوسکتی ہیں، یہ انھی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لیا اوروں کو لطف دے گئے،

علاوہ ان تصنیفات کے لطائفِ غیبی، تیغِ تیز، ساطعِ برہان وغیرہ اردو میں دوسروں کے نام سے ہیں، فارسی میں کلیات ہے جو درحقیقت ان کی جولانیٔ طبیعت کا تماشا گاہ ہے، ایک کتاب پنج آہنگ ہے، فارسی انشاپردازوں کے واسطے لکھی ہے جو ان کے انداز پر لکھنا چاہتے

قاطع برہان یا درفش کاویانی ایک رسالہ ہے جس میں برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں، نامۂ غالب اس کا جواب الجواب ہے، مہر نیم روز تاریخ کی کتاب ہے، دری زبان میں امیر تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال ابو ظفر بہادر شاہ کے حکم سے لکھا تھا، اسی سلسلہ میں دربار شاہی سے خطاب عنایت ہوا تھا، اس کا دوسرا حصہ ماہ نیم ماہ کے نام سے لکھنا چاہتے تھے، جس میں اکبر شاہ سے لیکر بہادر شاہ تک کا حال لکھنا مقصود تھا، مگر غدر ہو جانے سے یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی، دستنبو بھی تاریخی کتاب ہے، دری زبان میں غدر کی قیامت خیز تباہی کا حال لکھا ہے، غدر کی تاریخ بھی مرزا نے رستخیز بیجا سے نکالی ہے، اور کتنا لطیف تخرجہ ہے،

سبد چین ایک مختصر مجموعہ ہے، جسمیں چند قصائد، چند قطعے چند خطوط فارسی میں جو کلیات کی ترتیب اشاعت کے بعد لکھی تھی،

مرزا کو آخر عمر میں، بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا تھا، کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا، نقش تصویر کی طرح بیٹھے رہتے تھے، انجام کار تہتر برس کا سن پاکر ۱۲۸۵ھ میں زندگی کے دن پورے کئے، "آہ غالب بمرد" تاریخ وفات ہے،

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد | سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہ و درد کی | دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں | وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

اسدؔ بسمل ہے کس انداز پر قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھکر

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے — دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا — رکھ لیجو میرے دعویٔ وارستگی کی شرم

زہر ملتا ہی نہیں مجکو ستمگر ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

یوں دامِ بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

زخم سلوانے سے میرے چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

ترے سرو قامت سے اک قد آدم　　قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے　　دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
شوریدگی کے حال سے سر ہے وبالِ دوش　　صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی　　سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں　　ہے تقاضاے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت کدۂ خسرو کیا خوب　　ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

نظر لگے نہ کہیں اُنکے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام　　دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ہے ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

دے مجکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجکو مزا بھی مرے آزار میں آئے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھوں ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

غالب اس تلخ نوائی میں مجھے رکھیو معاف   آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میر حسین تسکین

صاحبِ فکر بلند و اسلوب گفتارش دل پسند از حضرت مومن خاں بدرستی اشعار

پرداختہ از احباب راقم است۔ (صو گلشن بیخار)

میر حسین تسکین دلی کے رہنے والے میر حیدر کی اولاد میں تھے جنھوں نے حسین علیخاں کو اثنائے سفر میں محمد شاہ بادشاہ کی رضاجوئی کے خیال سے قتل کر دیا تھا، والد کا نام میر حسن تھا، مگر میرن صاحب کے لقب سے مشہور تھے،

دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں، شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، کچھ دنوں شاہ نصیر سے مشق سخن کی، اس کے بعد حکیم مومن خاں کے شاگرد ہو گئے،

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ خاں صاحب کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے، استاد کی طرز ادا معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر ہمرنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے

ام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا،

جب دلی میں گذر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو رامپور چلے آئے نواب یوسف علیخان
ظم تخلص نے قدردانی فرمائی، چند روز رامپور میں آرام سے بسر کر کے پچاس برس کے
ن میں ، ار شوال ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی،

میر عبد الرحمٰن آسیؔ ان کے سعادت مند بیٹے تھے، جنھوں نے شاہ نصیر کا دیوان مرتب
یا تھا، وہ نواب کلب علی خاں کے زمانے تک رامپور میں رہے، حکیم مومن خاں مرحوم
یہ بھی شاگرد تھے، اور ان کے دیوان کی تکمیل انہی کے ہاتھوں سے ہوئی ہے،

ہ نمک کچھ مشک کچھ الماس ہولے چارہ گر — پھر خدا چاہے بھرے دو دن میں منہ ناسور کا

س وقت نظر پڑتی ہے اس شوخ پہ تسکینؔ — کیا کہیئے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

سکین کروں کیا دل مضطر کا علاج اب — کمبخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

ر روز وہ ڈھونڈھے ہے کوئی تازہ خریدار — صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

کوچۂ یار میں میں نے تسکینؔ — پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

بروں کو اشارہ ہے مرے قتل پہ ناحق — جنبش ابرو ہے تو سر کاٹنے کو ہوگا،

زندگی ہووے گی کس طرح سے یارب اپنی   دم میں سو بار اگر یوں وہ خفا ہووے گا

خوبصورت نہ کوئی ہو تو نہ ہو بدنامی   سچ تو یہ ہے کہ برا ہوتا ہے اچھا ہونا

اس گلی میں اژدحام اغیار کا یاد آگیا   دل میں جوش حسرت یاس و تمنا دیکھ کر
دیکھنا شوخی یہ کہتے ہیں مرے دشمن سے وہ   کیا ہنسی آئی مجھے تسکیں کو روتا دیکھ کر

گر مر کے چھٹے دل کی تپش سے تو عزیزو   تا حشر نہ نکلیں گے کبھی گور سے باہر

اے چشم سرمگیں تری گردش نے کیا کیا   راحت پذیر تھے ستم آسماں سے ہم

یاں انتظار ہی میں کٹی میری ساری رات   واں وعدہ کیا کیا تھا انھیں یاد ہی نہیں

چھیڑوں ہزار طرح سے تم کو خفا کروں   قابو میں میرے دل ہو تو کیا جانے کیا کروں

تسکین نے لے کر نام ترا وقت مرگ آہ   کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں

باتوں ہی کے مشفق ہیں مرے حضرت ناصح   دو دن تو رہیں پاس مرے رنج و محن میں

یہ تو سچ ہے کہ جو تم چاہو گے کر گذرو گے　　پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

آتے ہی اُن کے جان گئی واہ رے نصیب　　نکلی جو آرزو تو دم واپسیں کے ساتھ

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی　　بات تو کرنے دے اے دل بیتاب مجھے

یہ کہہ کے شب ہجر میں کرتا ہوں تسلی　　جو رنج و مصیبت ہے سو انسان کیلئے ہے

تیغ نگاہ یار جو چلنے لگی تھی پار　　برسوں گذر گئے مجھے آزار کھینچتے

اے دل یہ تیرا خاک میں ملنا ہے بے اثر　　وہ کر جو اس کے طبع مکدر میں گھر کرے

نہ اُٹھا گیا دل کے ہاتھوں سے تسکیں　　کہا اس نے جو سب [illegible] بیٹھے بیٹھے

فتنہ محشر کا تماشا کوئی کیا　　تجھکو سمجھایا تری رفتار نے [illegible]

ابھی اس ادا سے کوئی گیا ہو　　کہ دیکھے [illegible] نقش پا کی

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب مصطفیٰ خاں فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر از اوان

صبا بہ مشق سخن مصروف بود و عمرے در شغل بسر بردہ در مراتب نظم و نثر اداے خاص

دارد و بہر دو زبان ریختہ و فارسی سحرے می طرازد ۱۲ (طور کلیم)

نواب مصطفیٰ خاں کے دادا ولی داد خاں کوہاٹ سے دلی آئے، نواب مرتضیٰ خاں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کئے، اس کے صلہ میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں ملا، جہانگیر آباد کا علاقہ انھوں نے خود خرید کیا تھا، جو اب تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے،

نواب مصطفیٰ خاں کی ولادت ۱۲۲۱ھ ۱۸۰۶ء کو دلی میں ہوئی تعلیم و تربیت کے جو بہترین سامان ہو سکتے ہیں، وہ ان کو میسر ہوئے، مولوی محمد نور، مولانا کرم اللہ محدث اور دوسرے نامور علماء سے تعلیم پائی۔ اور سفر حج میں شیخ محمد عابد سندھی مشہور محدث سے سند حاصل کی،

شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، حکیم مومن خاں سے مشق سخن کی، دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی، بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمن خاں احسان، میر حسین تسکین، اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا، جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہونگے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا،

مفتی صدر الدین خاںؒ اور خود نواب کے ہاں ہر ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا، اہلِ کمال اُس میں جمع ہو کر لطفِ سخن اُٹھاتے رہتے۔

لہ مفتی صدر الدین خاں بہادر عالیجاہ خاندان والا دودمان، سرمایۂ نازشِ ہندوستان فضل و کمال اور فنون ادبیہ کی بے نظیر قابلیت میں اپنا آپ جواب تھے۔ سرزمینِ ہند میں جامعیت کے وہی حد شخص ہوں گے اس کے ساتھ مزاج دیکھو تو خلق مجسم اور لطف مصور۔

علم و کمال میں بقول شیفتہ، در فنون ادبیہ ثانی اعشی و جریر ہست و در مراتب حکمیہ ثالث باقر و نصیر، عقل صواب اندیشی میں جنرل اکٹرلونی کے نفس ناطقہ جبر آسانی سے، چھوٹا نہ کی پیچیدگیوں کو حل کر کے سرکار انگریزی سے معاہدے کرائے ہیں، وہ انہی کا کام تھا

علما کی مجلس ہو تو اُس میں صدر نشین، مشاعرہ ہو تو اُس میں میر مجلس، حکام کے جلسوں میں موقر و معتبر، بے کسوں اور محتاجوں کے ملجا و ماویٰ، سرسید آثار الصنادید میں جہاں کہیں ان کا تذکرہ کرتے ہیں پورے ایک صفحہ میں ان کے القاب و آداب لکھتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں،

هزار بار بشویم دهن بمشک و گلاب — هنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

نواب مصطفیٰ خاں گلشن بیخار میں فرماتے ہیں" باعتقاد من روزیکہ بے شرف مجلست ایشاں بپایاں رسید داخل ایام عمر نیست" خدا جانے ان کے وقت میں کتنی برکت تھی، صدر الصدوری کے فرائض کے ساتھ حکام و رؤسائے شہر سے میل جول، مشاعروں کی شرکت، سب سے بالا تر درس و تدریس کا مشغلہ تھا، شاہجہان بادشاہ کا مدرسہ دار البقا سلطنت کی تباہی کیساتھ برباد ہو چکا تھا، اسکو اپنے روپیہ سے زندہ کیا، عمارت درست کی طلبہ کے وظائف اور انکے پڑھانے کو اساتذہ مقرر کئے اور بطور مدرس اعلیٰ منتہی طلبہ کے اسباق اپنے ذمہ لئے ہفتہ میں ایک بار تعطیل کے دن سب کو لیکر باغ جاتے طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے انکو کھلاتے اور خوش ہوتے،

شاگردوں میں نواب سید صدیق حسن خاں بہادر مولوی سمیع اللہ خاں سی ایم جی مفتی سعد اللہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اُس زمانہ میں نواب کی سخن گوئی سے زیادہ اُن کی سخن فہمی کی دھوم تھی، مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف و مداح تھے، مرزا کے نزدیک نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھی، فرماتے ہیں:

غالب بفن گفتگو نازد بدین ارزش کہ او ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خان خوش کرد

نواب نے غدر کے بعد شغل بے حاصل کو بہت کم کر دیا تھا، کبھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے، تصنیفات میں ایک فارسی دیوان ہے، ایک ریختہ کا دیوان، ایک مجموعہ

(بقیہ حاشیہ نمبر ۳۳) مولوی ذوالفقار علی، مولوی فیض الحسن، ورالد جیسے نامور ان کے دامنِ تربیت میں پرورش پاکر نکلے جن سے ایک عالم نے فیض پایا، ۱۲۵۲ھ میں پیدا ہوئے اور ... ۱۲۹۵ھ میں وفات پائی، مولانا فضل امام خیرآبادی سے علوم حکمیہ اور شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ اور ان کے بھائیوں سے علوم دینیہ اور معارف ادبیہ کی تفہیم پائی تھی، عربی اور فارسی کلام کے یہ لکھنے کا یہ موقع نہیں، اردو کے دو چار شعر نقل کرتا ہوں۔

میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلف سیہ فام بھی پھر
کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

جس میں فارسی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ظاہر ہوتا ہے، ایک سفرنامہ ہے ترغیب السالک
فی حسن المسالک، فارسی نام اس کا رہ آورد ہے۔

علاوہ ان کتابوں کے ایک مسودہ تالیف گلشن بیخار ہے جس میں ریختہ گو شعرا کے انتخابی
کلام کو فراہم کیا ہے۔ اس کو دیکھ کر ان کی سخن فہمی کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے

[illegible] اور [illegible] تھے، جوانی میں مولانا شاہ اسحاق [illegible] سے [illegible] صحبت
رہی تھی، وہ ہندوستان سے ہجرت فرما گئے [illegible] نہیں ہوئی۔ مگر جب عمر [illegible]
نے رہبری کی۔ حضرت شاہ عبدالغنی محدث سے تجدید بیعت کر کے سلسلۂ [illegible] میں داخل
ہو گئے اس لحاظ سے وہ دنیا خود و عقبیٰ برد کے صحیح مصداق تھے

[illegible] برس کی عمر پائی اور ۱۲۸۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔

ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا   کہ جسے [illegible] گرمیٔ ہنگامہ [illegible] دل کا

ایک نالہ میں ستمہائے فلک سے چھوٹے   جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ [illegible]

کب طالع خفتہ نے دیا خواب میں آنے   وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین   دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی   صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے کہ ذکرِ غیر یہ کیا اُس کی بزم میں — آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آ گیا

کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر — کیا کوئی اور ستم یاد آیا

کہتا تھا وقتِ ترکِ مئے دور اک سے شیفتہ — دنیا کسی کو دل تو ونا دار و پھر کرے

جو بات میکدہ میں ہے اک اک زبان پر — افسوس مدرسے میں ہے بالکل زبان بند
اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی — کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز

عشرت سے شیفتہ ہر اک سے جو پوچھتے پھرنا — لے گا یاد بکشوں سے نشانِ بادہ فروش

کہنے لگے ہیں بے وفا مجھے میں نے جو یہ کہا — مرتے رہیں گے تم ہی پہ جیتے ہیں جب تلک
یاں عجز نے دیا ہے نہ واں ناز دلفریب — شکرِ بجا رہا نہ گلۂ بے سبب تلک

ہیں جاں بلب کسی کی اشارت کی دیر ہے — دیکھے ہے اس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ — دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

دشمن نواز یار و فلک بوالہوس پرست — کس سے جفائے غیر کا یا رب گلہ کریں

کچھ اور بے دلی کے سوا آرزو نہیں — اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ — طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

آہ و زاری نارسا شوقِ اسیری بے اثر — کون لائے آشیانے تک مرے صیاد کو

ننگِ مہمانیِ دشمن بھی کیا ہم نے قبول — شیفتہ لیکن نہ آئے وہ کسی تدبیر سے

ناصح ترو زبان ترے بس میں نہ ہو تو پھر — انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

اے جان لب پہ آکے ٹھہرنے سے فائدہ — رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہو اب چلے

ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کاہے کو تھا — شیفتہ اُس کو تو تو تم سے محبت نکلی

اے عدو کس لئے نازاں ہے سمجھ تو آخر — جس سے ہم خوار ہوئے ہیں یہ وہی عزت ہے

وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی — میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

جس لب کے بوسے غیر لے اُس لب کی شیفتہ — کم بخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

سحر ان کو ارادہ ہے سفر کا قیامت آنے میں شب درمیاں ہے

کرامت علی شہیدی

در سرودن شعر دستگاہے معقول دارد و در حساب مکاتب مفوض (؟) بنجاب بود

بوراستہ بیشتر بسر بردہ گاہ گاہ بہ دہلی وارد شد و ہنگام ورود دہلی بار راقم آثم

بارہا برخوردہ، مرد بے تکلف دوارستہ مزاج و وسیع المشرب است

آزادانہ می زید (عقد ثریا مصحفی)

کرامت علی نام شہیدی تخلص، عبدالرسول خاں کے بیٹے تھے، باشندہ دہلی کے تھے، مگر لکھنؤ میں نشو ونما ہوا۔ مصحفی سے مشق سخن کی، جب ان کا انتقال ہوگیا تو شاہ نصیر کو دکھانے لگے۔ شعر وسخن میں ایسی قدرت کامل بہم پہنچائی تھی کہ زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو، ایک طرح میں چونتیس چونتیس غزلہ کہتے تھے، اور کوئی غزل پچیس اور بیس شعر سے کم کی نہ ہوتی۔

یارباش، زندہ دل، خلیق، مرنجان مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ شیخ عالم علی نیر دہلوی ایک حسین، مہمان نواز آدمی ضلع فتح پور کے رہنے والے اور دہلی میں کسی بڑے عہدے پر مامور تھے۔ انکا اور شہیدی کا بہت دنوں ساتھ رہا ہے۔ ابتدا سے ملازمت میں وہ اور شہیدی دونوں کی سفارش سے سرکار انگریزی کے ملازم ہوئے تھے۔

شہیدی کا تعلق کمسریٹ سے تھا۔ بہت سا روپیہ یاربازی میں انھوں نے اڑا دیا جب حساب طلب ہوا تھا ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، مگر تھے طبیعت دار حسن مکان

میں دفتر تھا، اُسی کے ایک حصے میں رہتے بھی تھے [illegible] نے اس میں آگ لگا دی، اُن کے سامان کے ساتھ دفتر بھی جل کر خاک [illegible] ہو گئے [illegible]
اور خدا خدا کر کے جان بچی،

سرکاری ملازمت کے جاتے رہنے کے بعد [illegible] زندگی بسر کرتے رہے، بھوپال، دلی، اجمیر، پنجاب اور [illegible] تھا، اور ان مقامات میں کثرت سے [illegible]

۱۳۵۵ھ میں حج و زیارت کے ارادہ سے گھر سے نکلے، اسی سال فریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے کہ راستے میں بیمار [illegible] منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے [illegible] حسرتناک نظر اس پر ڈالی، اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا،

ان کے مشہور قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں [illegible] اسی تمنا کی ہے، کیسے خوش نصیب تھے کہ جن کی [illegible] حد تک پوری ہوئی،

ہوئی ہے ہمتِ عالی مری معراج کی طالب — [illegible] مقصد
کبھی نزدیک جا کر آستانہ پر ملوں آنکھیں — کبھی [illegible] نظارہ گنبد کا
فراغِ دل سے گزرے زندگی کا کوئی دم تنہا — [illegible] عیشِ مخلد کا
مدینہ کی زمیں [illegible] — کسی [illegible] میں دامِ ورد کا
تمنا ہی درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے — قفس [illegible] طائرِ روحِ مقید کا

غزلوں کے انتخابی شعر ملاحظہ ہوں۔

قدر سب چاہنے والوں کی تری دیکھ چکے — [illegible]

عالم میں اس کی تو انطاف شہیدی سب پہ — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح — وہ اُسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

شہیدی حشر کے دن بھی ہمارا ہو چکا اُٹھنا — یہی عالم رہا بعد فنا گرنا توانی کا

فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس خوشتر — گر اپنے دل میں نہ ہو وسوسہ رہائی کا

ہو چلا خنجر بیداد کا بسمل ٹھنڈا — لے ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

میں تو سمجھاؤں ہزار اُسکو شہیدی لیکن — میرے سمجھانے سے اب یہ دل شیدا سمجھا

اغیار کا منہ تھا مجھے محفل سے اُٹھاتے — سچ یہ ہے تری رنجش بیجا نے اُٹھایا

بیمار محبت کو اب اللہ شفا دے — سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اٹھایا

اندوہ دائمی میں کٹی کس خوشی سے عمر — گر مجھکو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

کر چکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا — نہ خریدو یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

سیکھ لے ہم سے کوئی ضبط جنوں کے انداز　　برسوں پابند رہے پر نہ ہلائی زنجیر

بے قراری دل کی میں کیونکر بتاؤں یار کو　　سینہ پر جب ہاتھ رکھتا ہے ٹھہر جاتا ہے دل

ہر وضع کے انسان سے ملاقات ہے انکو　　سب خلق مدارات کے قابل ہے مگر ہم

دوستو گر ہم سے کج خلقی ہو رکھنا تم معاف　　فرقت جاناں میں اپنے جی سے ہیں بیزار ہم

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری　　اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

اے روز قیامت ادب اس کا ہے تجھے فرض　　ہے تجھ سے بڑی میری شب تار کئی دن

ناکامی جاوید کی ہم مانتے منت　　افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی
ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے　　دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے
وہ وقت تو آنے دے بتا دیں گے شہیدی　　بن آئے کبھی شخص یہ مر جاتے ہیں کیسے
سب طالب اپنے اپنے ہوں مطلوب سے ہم　　ہیں نامراد ایک ہمیں تیرے واسطے

ان کے دیوانوں کو بھی کیا ضبط ہے اوقات کا　　دو پہر ہنستے رہے گر دو پہر رویا کئے
دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں　　کچھ نہ روسے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کئے

حصہ سوم

حیاتِ شعرا

دور اول

دلی کی تباہی کے بعد اربابِ فضل و کمال کا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں رہا، کچھ لوگ مرشد آباد و عظیم آباد چلے گئے، کچھ حیدر آباد دکن، مگر یہ مقامات دلی سے اتنے دور تھے اور سفر میں اتنی دشواریاں تھیں کہ ہر ایک کو ان مقاموں پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، خصوصاً ایسی حالت میں کہ مرہٹوں کی زبردست طاقت ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی، کبھی دکن میں گرجتی، کبھی دلی، کبھی بنگالہ میں آکر گرجتی تھی، اُس زمانہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو راتوں کو بھی چین سے سو سکتا ہو،

دلی سے قریب تر فرخ آباد اور فیض آباد دو مقام ایسے تھے، جہاں ان بدنصیب اور بے خانماں آوارہ لوگوں کی تھوڑی بہت قدردانی ہوتی تھی، فرخ آباد کی ریاست تباہ ہوئی اور فیض آباد سے نواب آصف الدولہ نے دار السلطنت لکھنؤ کو منتقل کیا تو صرف لکھنؤ اُن کا ملجا و ماویٰ رہ گیا،

ایک خاص سبب اور بھی فیض آباد پر لکھنؤ کی ترجیح کا یہ پیدا ہوا کہ نواب موتمن الدولہ

محمد اسحٰق خاں شوستری کی بیٹی امۃ الزہرا بیگم نواب شجاع الدولہ کو بیاہی گئیں۔ پھر ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ کی شادی نواب خانخاناں کی بیٹی سے ہوئی، ان بیگموں کے عزیز اور متوسلین فیض آباد آبسے، اور چند دنوں کے بعد لکھنؤ میں آکر بود و باش اختیار کی،

امۃ الزہرا بیگم محمد شاہ بادشاہ دلی کی منہ بولی بیٹی تھیں، نہایت سیر چشم، فیاض اور مہمان نواز، انھوں نے آدھی دلی کو اپنی طرف کھینچ لیا،

اتفاق دیکھو کہ پہلے میرزا جواں بخت شاہ عالم بادشاہ کے ولی عہد لکھنؤ آئے، یہ کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے، پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ آئے اور وہ یہیں رہ پڑے، ان کی وجہ سے بھی کچھ دلی کے بھولے بھٹکے آکر جمع ہو گئے، شاہزادہ کو بھی اپنے خانہ زادوں پر لطف و کرم تھا، جہاں تک ہو سکتا وہ ان لوگوں کو سمیٹے رہتے تھے،

علامہ سراج الدین علی خاں آرزو اور میر غلام حسین ضاحک وغیرہ بہت پہلے فیض آباد آکر بہو بیگم کے لائق بھائی نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہے تھے، لکھنؤ کے دار السلطنت ہونے پر میر ضاحک کے بیٹے میر حسن اور پوتے میر مستحسن خلیق لکھنؤ آبسے،

میر سوز اور مرزا رفیع فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کی مہربانی سے زندگی بسر کر رہے تھے، جب وہاں کا کھیل بگڑا تو فیض آباد پھر لکھنؤ آگئے،

میر محمد تقی میر کی وضعداری نے مدتوں انکو دلی سے نکلنے نہ دیا، آخر کب تک، وہ بھی گھبرا کر لکھنؤ آگئے، پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی، میر ولی اللہ محب، میر غلام حسین برشتہ، میر انشاء اللہ خاں، اور جرأت بھی آگئے،

مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق اختر نے بھی لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، غرض

کہ لکھنؤ میں دلی کی سبھا پوری کی پوری اُٹھ کر آگئی، اور گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا،
یہ وہ زمانہ ہے کہ فرمانروایانِ اودھ نواب وزیر کہلاتے تھے، اور دلی کے برائے نام
بادشاہ کی طرف سے خطاب اور خلعتِ وزارت انکے لئے آیا کرتا تھا، سرکارِ کمپنی نے
ایک خاص اثر کی بنا پر ان کو شہ دی اور نواب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی سر پر
رکھ کر دلی کی برائے نام وزارت سے سبکدوشی حاصل کی،

نئے بادشاہ کی نئی نئی امنگیں، دولت کی فراوانی، نواب سعادت علیخان کا جمع کیا
ہوا سترہ کروڑ روپیہ کا خزانہ، ہر طرف سے عیش و عشرت کی موجیں آنے لگیں، ہر طرف
شادیانے بجنے لگے، بقول شاعر ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو — ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

وضع قطع، لباس، خورد و نوش اور ماند و بود غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تراش خراش نے
نئے نئے انداز پیدا کر دیئے، گنبد نما دستار کی جگہ ہلکی اور نکیلی ٹوپی، جامہ و نیمہ کی جگہ چست
شلوکہ اور انگرکھا، شلوار کی جگہ کلی دار غرارہ یا چوڑیدار پائجامہ، سلیم شاہی کی جگہ نری کا نقش پا
بے نوک کا لکھنوا جوتا، اسی طرح ہر چیز کو قیاس کرو، ہر چیز نئی زمین نئی، آسمان نیا ہو گیا،
کہن سال اور کہنہ مشق شاعر جن کی عمریں دلی کی آب و ہوا میں بسر ہوئی تھیں، ایک ایک
کر کے رخصت ہوتے گئے، نوجوانوں نے میدان خالی پایا تو ان کی جوانی کی امنگیں ابھر آئیں،
زبان کی تراش خراش کر کے بد مزہ اور ناگوار الفاظ جو ان کے زمانہ میں عموماً مروج تھے ترک کر دیئے
آئے ہے، جائے ہے، لکھوتے ہے، ٹک، نت یا جمع مونث کے فعلوں کو الف نون
کے ساتھ آئیاں، جائیاں، اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی ہو تو موصوف کی مناسبت
سے صفت کو جمع بولنا، جیسے بھاریاں، ان سب کو خلافِ فصاحت قرار دیا جس کو متاخرین

دلی والوں کو بھی ماننا پڑا، اور اہل لکھنؤ دلی والوں کی تقلید سے اسی طرح آزاد ہو گئے جیسے نواب وزیر نے دلی کی بادشاہی کے خطاب و خلعت وزارت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔

مگر افسوس ہے کہ ان بزرگوں نے زبان کی تراش و خراش پر قناعت نہیں کی اپنی بلند پروازی کے زور میں قوت تخیل و حسن تشبیہ میں اعتدال نہ رکھنے سے ایسے اوج پر پہنچے جہاں آفتاب تارا بن گیا، اور دل پر اثر کرنے کی جگہ زبانوں پر صرف واہ واہ رہ گئی۔ چونکہ یہ مضمون کو مقدمہ میں بیان کر چکا ہوں لہٰذا اس جگہ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

شیخ امام بخش ناسخ[1]

(والا مایہ عالی پایہ بلند اندیشہ نازک خیال است در تلاش مضمون تازہ و معنی بے مثل و مثال از قدماء تنخوری بغزل سرائی مائل و غیرہ رباعیات تصنیف آخر از و دیدہ نہ شد، (ملاحظہ گلشن بیخار)

شیخ امام بخش نام، ناسخ تخلص، شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے، اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس نے متبنیٰ کیا تھا، بچپن فیض آباد میں بسر کیا، اس زمانہ کے رواج کے مطابق ورزش پر طبیعت مائل ہوئی، ہزاروں ڈنڈ کرتے اور سیکڑوں ہاتھ جوڑیوں کے ہلاتے، ورزش سے بدن کسرتی اور پھرتیلا ہو گیا تھا،

نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک امیر کو ایسے بانکوں ترچھوں کے رکھنے کا شوق تھا

[1] ناسخ و آتش گو باعتبار زمانہ کے ذوق و غالب کے معاصر ہیں، اسلئے انکو طبقہ متوسطین یا دور سوم میں جگہ ملنی چاہئے، مگر مصنف مرحوم نے انکی شاعری کی عمر اور نشو و نما کے لحاظ سے انکو متاخرین کے طبقہ اول میں شمار کیا ہے، (سید سلیمان ندوی)

ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ لائے، سیاہ فام مضبوط اور گٹھا ہوا بدن، سر منڈا ہوا، داڑھی خشخشی، بانکپن کے ساتھ جاڑوں میں شب کو نواب صاحب کے مکان کے پہنچی پر دے اوڑھنے اور دن کو باریک ململ کے کپڑے پہن کر ادھر ادھر اکڑتے پھرتے،

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے، انھوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا، وہ مرے تو انھیں خاصی دولت وصیت نامہ کی رو سے ان کو مل گئی، اب آسودہ حال ہو گئے اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر بود و باش اختیار کی،

حسنِ اتفاق سے مکان کے سامنے گلی بیچ مولوی وارث علی کا کمرہ تھا، وہ گھر بیٹھے طلبہ کو مفت درس دیا کرتے تھے، ان کو بھی شوق ہوا، جو کتاب وہ پڑھاتے اور ان کے مناسب حال ہوتی بیٹھ جاتے اور روز کے روز سبق یاد کر لیتے، اسی طرح رفتہ رفتہ اچھی خاصی استعداد ہو گئی، جو فن شاعری کی ضروریات پورا کرنے کو کافی تھی،

شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے، مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا، جو غالباً نواب محمد تقی کی ملازمت میں پیدا ہوا ہوگا، جو خود شاعر تھے، اور ان کا گھر شاعروں کا ملجا و ماویٰ تھا، پھر لکھنؤ آئے، تو یہاں جرأت کی گرم بازاری اور مصحفی و انشا کے ہنگامے آنکھوں سے دیکھے وہ شوق یہاں آکر چمک گیا، چپکے چپکے شعر کہتے اور کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے، بعضوں کا خیال ہے کہ ابتدا میں مصحفی سے اصلاح بھی لی تھی، کوئی کہتا ہے کہ مصحفی کے شاگردوں میں محمد عیسیٰ تنہا ایک شخص ہیں، ان سے تنہائی میں مشورہ کر لیتے تھے،[۱] جب اطمینان ہو گیا تو مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے،

۱؎ حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ میں مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچے سے ایک فقرہ نقل کیا ہے جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، مصحفی نے لکھا ہے کہ حمد و نعت دیوان پیش خوان بہ شیخ ناسخ کہ پیرا و دوستان محمد عیسیٰ تنہا است پیشتر ہم بہ سوئی تنہا دل دارد مقسوم گشت

اُس زمانہ میں مرزا حاجیؔ[1] ایک امیر زادے تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور اُن کی مجلس میں مرزا قتیلؔ، قاضی محمد صادق خاں اخترؔ اور بہت سے اہلِ کمال جمع رہتے تھے،

---

[1] مرزا حاجی لکھنؤ کے بڑے عالی خاندان امیر زادے تھے، نام قمر الدین احمد تھا، والد کا نام مرزا فخر الدین احمد مگر مرزا جعفر کے نام سے مشہور تھے، نواب حسن رضا خاں کے نامور بیٹے تھے، مرزا جعفر نے درسی کتابیں ملا حسین فرنگی محلی سے، دینیات مولوی سید دلدار علی مجتہد حضرت [illegible] فنون ریاضیہ [illegible] تفضل حسین خاں سے پڑھی تھیں، اور خان علامہ کے عہد نیابت میں بخشی گری کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوئے۔

مرزا حاجی اسی نامور باپ کے بیٹے اور خاندانی حیثیت سے مرزا … … کی دولت میں تھے، علوم و فنون میں صاحبِ استعداد اور مذاقِ سخن سے آشنا اور شیریں بیان تھے، زینت لکھنؤ کے نفس ناطقہ تھے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ نوابی میں انکا عروج بہت بڑھ گیا تھا، پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی اور نواب وزیر کو بجز اوقاتِ استراحت کے انکی مفارقت ایک گھڑی گوارا نہ تھی، عام دستور کے موافق انکا گھر اُس زمانہ میں قبلۂ حاجات بنا ہوا تھا، مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر، اور دیگر اہلِ فضل و کمال انکی مصاحبت میں رہتے تھے، شعر و سخن کا مشغلہ، زبان کی تراش خراش اور تحقیقاتِ علمی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا اسی صحبت میں شیخ امام بخش ناسخ کا نشوونما ہوا،

چند روز کے بعد نواب معتمد الدولہ کا زمانہ موافق ہوا، اُنھوں نے مرزا حاجی کو گھر میں بٹھا دیا، ایک مدت تک نظر بند رہے، ان کے تمام اعزہ جو سلطانپور، رائے بریلی اور سلون کی نظامتوں پر مامور تھے، محبوس و شکنجہ کش کیے گئے۔ مرزا حاجی کا لاکھوں روپیہ برباد ہوا، آخر کار ۱۲۲۹ھ میں جلا وطن کیے گئے اور ان کی املاک نواب نے محسن الدولہ بہادر کو دلا دی، تاکہ پھر واپس آئیں تو ان سے نہ لے سکیں، یہ کچھ دنوں کانپور میں رہے، اس کے بعد نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے فرخ آباد بلا لیا، علاوہ مصارف معمولی کے دو سو روپیہ ماہوار ان کی جیب خرچ کو مقرر کر دیئے۔ (بقیہ حواشی صفحہ ۳۴۶ پر)

شیخ امام بخش ناسخ کو خوش قسمتی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہو گئی، انکی صحبت میں انکو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق و تدقیق کا چسکا پڑا، اور آپ کے دل بڑھانے سے کلام

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۵) جب حکیم مہدی وزیر ہو کر لکھنؤ آئے تو ان کو اپنے ساتھ لائے، مالک بدر تن تو مل گئی مگر جب تمہ املاک نواب معتمد الدولہ کے پاس تھی وہ نہ مل سکی،

حکیم مہدی کی معزولی کے بعد یہ لکھنؤ میں رہے مگر نواب روشن الدولہ کی وزارت میں باوجودیکہ دونوں کے عزیز تھے مگر کچھ لوگوں کی سازش سے پھر انکو لکھنؤ چھوڑنا پڑا، صرف دو ہزار روپیہ لاکر ان کو دربار شاہی سے ملتا رہا یہ کانپور میں کسی نہ کسی طرح گذر کرتے رہے، واجد علی شاہ کے عہد میں نواب علی نقی خاں کی مہربانی سے جو ان کے رشتہ دار تھے، دوبارہ لکھنؤ دیکھنا نصیب ہوا مگر چند روز کے بعد ۱۲۶۵ھ میں دنیا سے گذر گئے،

سے قاضی محمد صادق خاں ہوگلی کے رہنے والے مرزا قتیل کے شاگرد اور بڑے باذوق شاعر تھے کچھ دنوں غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے زمانے میں خوش حالی سے زندگی بسر کی، اور بنام حیدر ایک کتاب غازی الدین حیدری ترتیب دی آخر زمانہ میں واجد علی شاہ کے یہاں رسائی ہو گئی تھی اسی سے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہیں مر گئے، انکی تصنیفات میں تواریخ انوری و جہاد المنثور، انشاء پردازی میں دو دیوان فارسی اور اردو کے ایک تذکرہ آفتاب عالمتاب بہت ضخیم و جسیم جسمیں چار ہزار دو سو چونسٹھ (۴۲۶۴) فارسی شعرا کا ذکر کیا ہے، علاوہ ان کے نور الانشاء گنج بے رنج وغیرہ چند کتابیں اور بھی ہیں، اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

کل شیخ بن کے مجتہد عصر آ گیا ‏ دکھلا کے باغ سبز ثواب عذاب کا
کہنے لگا از راہ نصیحت مجھے یہ طنز ‏ معلوم ہے کہ مست ہیں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں شیخ خوب جانتا ‏ پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں ‏ لیکن نہ کیجئے مجھے مورد عتاب کا
مے صاف در نہج باغ ہو ساقی جو ماہ وش ‏ اور کوئی بھی محل نہ ہو باعث حجاب کا

نے روز بروز رنگ سا پکڑنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش بڑھ گیا، اُس پر طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ مرزا حاجی کی ہم نشینی نے ان کی تصنیفات بڑھا دی، اہل فہم اور اہل کمال ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے لگے اور اپنی مطلب برآری کا ذریعہ سمجھنے لگے، غرض کہ مرزا حاجی کی مہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی اور [illegible] کو لکھنؤ میں شہرت و فروغ قبول اور حاصل ہو گیا،

چند روز کے بعد نواب معتمد الدولہ کا [illegible] عروج [illegible] مرزا حاجی نظر بند ہوئے

گردن میں [illegible]   [illegible] کا
کھینچ [illegible] اپنے [illegible]   [illegible] کا
منت [illegible]   [illegible] کا
اس وقت میں [illegible] آپ کو   [illegible] کیجئے [illegible] کا
اور [illegible]   قائل نہیں [illegible] کا

۵۱ آغا میر کا نام سید محمد خان معتمد الدولہ تھا [illegible] معتمد جنگ [illegible] کشمیری [illegible] غازی الدین حیدر کی نوابی زمانے میں ان کے معتمد خاص تھے، جب وہ نواب وزیر ہوئے تو نائب [illegible] بادشاہ ہوئے تو یہ وزیر قرار پائے، غازی الدین حیدر [illegible] قسم کی [illegible] کہ [illegible] کے قریب نہ [illegible] چند روز ہوش گوش سے کام کرتے رہے پھر آغا میر کو کیونکر گوارا ہو سکتا [illegible] یہ پیر و مرشد [illegible] حضرت عباس کی قسم کھائی ہے غلام بنی فاطمہ ہے، اس کا مظلمہ غلام کے ذمہ [illegible]

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

پھر تو وہ ایسے بدمست ہوئے کہ اس بدنصیب کو نواب نے [illegible] کر دیا، اسکو اگر بادشاہ نے [illegible] دیکھ کر پہچانا ورنہ [illegible] کہ اگر یہ تو جیتا ہی عرض کرتے اس کو غلام [illegible] دیکھ سکتا پیر و مرشد کی چشم مبارک البتہ عالم ارواح کو دیکھ سکتی ہے، حاضرین بھی نواب کے خوف سے یہی عرض کرتے، اس طرح رفتہ رفتہ بادشاہ اکثر مصاحبین کے سامنے فرماتے کہ خدا اور رسول [illegible] کسی طرح ظلم کا [illegible] نہیں، یہ شخص بنی فاطمہ ہے اگر کوئی بات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸ پر)

پنڈت صاحب چونکہ مرزا کے محرم راز اور مقرب خاص تھے، چھپ چھپ کر ان سے ملتے رہتے
تو [illegible] کو خبر ہوئی، تو ان کو بھی گھر میں بٹھا دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۷) عدل و انصاف کے خلاف سرزد ہوتا اسکا بھی مداوا ہو، مگر حالت یہ تھی کہ ہر شخص کی عافیت تنگ تھی جعل و فریب کا بازار گرم تھا، ملازمین و متوسلین کی تنخواہیں کئی سال کی چڑھی ہوئی تھیں، جس طرح سے بن پڑتا وہ لوٹ مار کرکے پیٹ پالتے تھے، سوداگروں کا اسباب جبر کیا جاتا تھا اور برسوں قیمت نہیں ملتی تھی ریذیڈنٹ تک کوئی پہونچ گیا تو قیمت ملی ورنہ ان کی بھی خیر نہیں، اپنے [illegible] سر میں ہوائیں تو سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہوگئی، اور ایک کروڑ سے کم عمارتوں پر خرچ نہیں کیا، مگر زندگی بھر انمیں رہنا نصیب نہیں ہوا چند روز کے بعد نکالے گئے، اور ہمارے بچپن میں وہ عالیشان عمارتیں کھد کر اسکی اینٹیں لکھنؤ سے سیتاپور تک ریلوے لائن میں بچھا دی گئیں، عالیشان سرا جو ان کی تعمیر کردہ رہ گئی تھی وہ اب جا کر کھدی اور وہاں پارک بن گیا ہے۔ [illegible] کی سخاوت و فیاضی کے ایسے ایسے قصے مشہور ہیں کہ آج انکو مشکل سے لوگ باور کریں گے ہمارے بچپن تک ایسے چند لوگ موجود تھے جنھوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ورنہ معمولی حیثیت میں لکھنؤ آئے،

دوسرے دن انکے دروازے پر ہاتھی جھومنے لگے، خدا جانے کہاں تک صحیح ہے، سید محمد میرزا نے تفسیر التواریخ میں لکھا ہے کہ میر بندہ علی ایک غالیچہ دان مفلس ہو کر لکھنؤ آئے، مسخرگی پیشہ کی، بدولت نواب کے مصاحب ہوگئے، وہ کہتے تھے کہ نواب کے ہاتھوں گیارہ سال میں چودہ لاکھ روپیہ میں نے پایا، محمد خاں اسکا خدمتگار تھا، اس کے پاس چالیس ہزار روپیہ جیب خاص کا تھا، اسنے ایک دن عرض کیا کہ ایک حقہ دار قید ہے، کہتا ہے کہ قید سے نجات پاؤں تو دس ہزار روپیہ دونگا، فرمایا جو تمہارے پاس ہے پہلے اسے دے دو پھر اس سے لینا، کشمیر سے اس زمانہ میں [illegible] تحفہ مال آیا کرتا تھا، ایک ایک [illegible] دوشالہ پانچ پانچ ہزار تک کو نواب نے لیا تھا، ایک دن دوشالہ اوڑھے ہوئے [illegible] خاص [illegible] اس دوشالہ کو دیکھ رہا تھا، پوچھا کیا دیکھتا ہے عرض کیا غلام کو حضور کی بدولت دوشالہ بہت نصیب ہوئے مگر ایسا [illegible] اسے دیکھ کر اتار کر اسکو دیدیا

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۶ پر)

ایک دن اُن کے پاس نواب کا چوبدار آیا، سمجھے کہ نواب نے بلایا ہے، مبادا بے آبروئی ہو، چوبدار سے کہا تم ٹھہرو میں سواری کی فکر کر لوں، اُس نے کہا میں تو اسی لئے آیا ہوں کہ سواری لاتا ہوں، وہ اُدھر گیا، اور یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، یہاں سعادت علی خاں نواب تھے، ان سے کوئی نیا ذریعہ نہیں تھا، اتفاق سے میر سعادت علی خاں مل گئے، انہوں نے یہ بیان کیا، وہ نواب کے رشتہ دار تھے کہہ سن کر صفائی کرا دی،

نواب مرزا کے متصل رہتے تھے، صاحب کا رد کوئی بات ان پر درست والے، یہ بھی ایسے لطیفہ غیبی کے منتظر رہتے تھے، دنیا کے ... بات کبھی کرتا جانا پسند نہیں کیا، نواب نے کہا کہ میں فقیر آدمی ہوں مجھے گھر پر پڑا رہنے دیجئے، طبیعت میں کچھ سوچ سمجھ کر ... دیتے، گھر بیٹھے گرد جب کوئی نیا مضمون پیش آتا، اُن کا لطیفہ ... موزوں کر دیتے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸) ایک مرتبہ سوار ہوئے، گھوڑا تیز تھا ... چھوٹے ... سوار کر تھا، اُتار کر اس کی طرف پھینکا، اُس نے تو ... دوسرے دن وہی ... سامنے آیا تو فرمایا کہ میں نے اسے دیا تھا یا ... کو کہا تھا۔

نواب سعادت علی خاں نے تو چودہ کروڑ روپیہ جمع کیا تھا، اس میں ایک کروڑ روپیہ سرکار انگریزی کو بطور قرض موبد کے دلوا دیا، اور اس کے پانچ فیصدی منافع سے صاحبات محل کی تنخواہوں کا وثیقہ کرا دیا گیا، بیگمات کے سلسلہ میں بیس ہزار ماہوار، نواب کے دو ہزار، بیوی کے دو ہزار، بڑے بیٹے کے ایک ہزار بیٹی کے مقرر ہو گئے اور گورنمنٹ انگریزی اس بات کی کفیل ہوئی کہ ان کی ہمیشہ حمایت کرے گی اور ان کی جائداد ضرورت کے وقت اپنی حفاظت میں لے لے گی۔ جان بادشاہ مذکور کے عہد دولت میں انہوں نے عیش و عشرت سے بسر کی اور بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

بادشاہ کے مرنے پر نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے، انہوں نے معزول و نظر بند کیا، چند روز کے بعد بحمایت سرکار انگریزی دو کروڑ روپیہ کا نقد و جنس لیکر کانپور چلے گئے، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۰ پر)

بادشاہ بادۂ غفلت سے سرشار تھے، نواب نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے، مرزا کو جلاوطن کیا، بادشاہ بیگم کی جائداد ضبط کرادی، مرزا نصیر الدین حیدر کا دربار بند کیا، اور یہ فکر ہوئی کہ محسن الدولہ کو اپنے قابو میں کرلیں،

نواب محسن الدولہ بادشاہ کے نواسے اور بادشاہ بیگم کے بھتیجے تھے، ماں کے مرنے کے بعد بادشاہ بیگم نے پرورش کیا تھا، اور ایک دم کو بھی اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں، مرزا انور علی شہزادے کے اخون شیخ صاحب کے دوست تھے، انکو مامور کیا تھا کہ نیر الدولہ [illegible] کے چل کر اعتماد الدولہ [illegible] بادشاہ بیگم کی سرکار [illegible] داروغہ تھے انکی [illegible] اور کفایت شعاری [illegible] نواب محسن الدولہ اکثر شاکی رہا کرتے تھے، اخون صاحب اس سے بہتر اور کیا موقع مل سکتا تھا، اب جب وہ شکایت کرتے یہ کہتے کہ نانا جان عافیت [illegible] اور معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کی بے اتفاقی کا ذکر کرتے رہتے تھے، مگر بادشاہ کو یقین نہ آتا تھا، جب محسن الدولہ کو سکھا پڑھا کر تیار کرلیا تو ایک دن ان سے کہلایا کہ مجھکو یہاں بہت تکلیف ہوتی ہے میں حضور کے قدموں تلے رہنا چاہتا ہوں، اب بادشاہ کو یقین آگیا، نواب کو حکم دیا کہ انتظام کرو، یہاں کیا دیر تھی، [illegible] کے قریب بیگم والی کوٹھی آراستہ کردی، سواری اور تمام لوازم امارت خاطر خواہ درست کردیئے، اخون صاحب [illegible] مقرر ہوئے شیخ صاحب کے وہ دوست تھے، پھر کیا پوچھنا مشہور تو یہ ہے کہ محسن الدولہ کی بدولت ہمیشہ کیلئے فارغ البال ہوگئے اور معتمد الدولہ کے دل میں [illegible] کی گنجائش بڑھ گئی،

پھر تو ان کی شاعری نے خوب زور پکڑا، اور ان کے گھر میں لوگوں کا مجمع ہونے لگا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۹) وہاں کو بمعاوضہ خرید کر کے ایک نیا شہر آباد کیا، جب تک جیتے رہے تمام شہر [illegible] کا صرف رہا، ان کے مرنے پر اولاد دنیقہ کی بدولت امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہی ہے،

خواہ یہ سمجھو کہ شعر و سخن کے قدردان کھنچ کھنچ کر آنے لگے، یا اسی پردے میں نواب معتمد الدولہ کی نظرِ عنایت کے خواہشمندوں کا جمگھٹا ہونے لگا۔ بہرحال پہلے مرتبہ حاجی محمد نواب معتمد الدولہ کی بدولت ان کی شاعری کا ہنگامہ خوب گرم ہوا اور لکھنؤ میں ان کی استادی کے ڈنکے بجنے لگے،

مگر افسوس ہے کہ اتنے جوڑ توڑ کی بدولت اُن کا [illegible] میں رہنا نصیب [illegible] حکیم مہدی[1] ایک فرزانہ و مدبر اہلِ کار اس زمانہ میں تھے، معتمد الدولہ نے ان کو [illegible]

---

[1] حکیم مہدی منتظم الدولہ نواب مہدی علی خاں [illegible] نہایت تجربہ کار تھے فضل و کمال کے ساتھ عدالت [illegible] دوراندیشی ان کو عطا کی تھی [illegible] علامہ تو نہ تھے، باوجودیکہ خوش قسمتی سے وزارت کر گئے مگر [illegible] نہیں [illegible] کا نمایاں نشان ہے جن کی یادگار اب تک محو نہیں ہوئی۔

ابتدا میں طبابت کی حیثیت سے نمایاں ہوئے [illegible] رسوخ بڑھا، اور کارگزاری کے جوہر کھلنے لگے اور [illegible] نواب حیدر غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے اور اپنے معتمد خاص آغا میر [illegible] ہوئے آدمی پر کسی نہ کسی طرح مجھے اٹھا [illegible] یہ سوچ کر [illegible] تھا کہ وہ اب تک ریاست سے دور بھی رہیں گے اور سرکاری معاملات [illegible]

انھوں نے علاقہ کا اتنا عمدہ انتظام کیا کہ سرکار [illegible] زیادہ [illegible] یہ کہ رعایا بھی سب راضی و خوش، اتفاق سے نواب [illegible] رسد رسانی کا اتنا عمدہ انتظام کیا کہ نواب گورنر جنرل نے [illegible] لکھ بھیجی، نواب معتمد الدولہ کو اب اور بھی ان کی فکر ہوئی [illegible]

نکلوا دیا، شیخ صاحب نے معتمد الدولہ کی رضا جوئی کے لئے غزل لکھی جس کا ایک مصرع ہے، ع

کا شتو برائے تحیت تسلیم کرنیست

دستبرد تبر ملت ۱۳ کے درپے ہوگئے، ابھی یہ خبر نہ تھے قبل اس کے کہ انکو گرفتار کیا جائے یہ اپنا مال و اسباب [illegible] بھیجکر خود بھی نکل گئے، چند روز شاہجہاں پور میں رہے اس کے بعد فرخ آباد چلے گئے اور وہاں کو بھار نکلے خرید کر کے عیش و آرام کرنے لگے،

شاہجہاں پور میں گرہ بندی کا پل شہر و قلعہ کے درمیان انہی کا بنوایا ہوا ہے، فرخ آباد میں ایک عالیشان کاروان سرا بنوائی اور لکھنؤ سے فرخ آباد تک راستہ میں جہاں جہاں ضرورت تھی سرائیں مسجدیں اور پل بنوا دیئے، جس سے بہت عرصہ تک نیک نامی کے ساتھ لوگ ان کو یاد کرتے رہے،

نصیر الدین حیدر جب بادشاہ ہوئے تو تھوڑے دنوں کے بعد معتمد الدولہ کو معزول کر کے اعتماد الدولہ کو قلمدان وزارت تفویض کیا، کچھ دنوں کے بعد ان سے بگڑ گئے تو منتظم الدولہ یاد آئے، ان کو ملک کا وزیر مقرر کیا، کم و بیش ڈھائی سال تک وزارت کی، اس تھوڑے سے زمانہ میں ملکی و مالی انتظام اتنا چست کر دیا کہ جو برائیاں معتمد الدولہ کے زمانہ وزارت میں عملی آرہی تھیں وہ سب دور ہوگئیں،

گومتی پر لوہے کا پل بنوایا [illegible] انگریزی شفاخانہ بنوایا، ایک یونانی دار الشفا تیار کیا، ایک معذور خانہ جس میں اندھے لولے لنگڑے اور محتاج زن و مرد رہا کریں، ان تینوں کیلئے جدا جدا عمارتیں تعمیر کرائیں، بیش قرار تنخواہوں پر ڈاکٹر [illegible] نوکر رکھے، ریذیڈنٹ لکھنؤ کی وساطت سے ان کے مصارف کیلئے نوٹ خرید دئے، جس کی بدولت یہ [illegible] چیزیں لکھنؤ میں اب تک موجود ہیں، یونانی دار الشفا چوک میں، انگریزی شفاخانہ وکٹوریہ گنج میں عام لوگوں کی حاجت روائی کر رہے ہیں، (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۳ پر)

محمد خاں قوال نے اس غزل کو نواب کے سامنے گایا تو اسکو ایکہزار روپیہ انعام ملا، شیخ صاحب کو جو کچھ دیا ہو اس کا حال خدا کو معلوم ہے، اس ایک دینے پر کیا ہے۔ نواب ان کے شاگرد ہو گئے تھے، عمر بھر سلوک کرتے رہے، اور ان کی بدولت انھوں نے امیرانہ زندگی بسر کی۔

مگر خدا کی قدرت دیکھو نصیر الدین حیدر نے تخت نشین ہوتے ہی معتمد الدولہ کو معزول کر دیا، پہلے میر فضل علی کو اعتماد الدولہ کا خطاب دیکر وزیر بنایا، جب ان سے کام نہ چلا تو حکیم مہدی بلائے گئے،

(بقیہ حاشیہ ص۳۵۲) ایک مدرسہ سلطانیہ قائم کیا، جسمیں ہزاروں لڑکے داخل کئے گئے، ہر بیس لڑکے پر ایک مدرس مقرر ہوا، اور طلبہ کے لئے فی کس پانچ روپیہ ماہوار کے حساب سے وظائف جاری ہوئے، یہ مدرسہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے کے چاروں سمت والے ایوانوں میں قائم کیا گیا تھا، جس کا اب نشان بھی نہیں ہے،

ایک مدرسہ اپنے روپیہ سے خاص کشامرہ کے لئے قائم کیا، جس سے منتظم الدولہ کو خاص طور پر دلچسپی تھی ہر ہفتہ بچوں کا خود امتحان لیتے اور اپنے ہاں مدعو کرکے طرح طرح کے کھانے اور لذیذ میوے کھلاتے تھے،

ایک چھاپہ خانہ لیتھوگرافی کا قائم کیا، زیر اہتمام مسٹر آرچر کے جن کی تنخواہ پانسو ماہوار تھی، ایک اسکول انگریزی تعلیم کے لئے قائم کیا، اور سب سے زیادہ جو نمایاں کام رصد خانہ سلطانی کا اجرا تھا جو کپتان ہربرٹ کے اہتمام سے قائم کیا گیا، اور عالیشان عمارتیں اس کے واسطے تعمیر کرائی گئیں، مولوی اسمٰعیل شہید وغیرہ علما اس میں بطور طالب علم داخل ہوئے،

افسوس ہے کہ منتظم الدولہ کو کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، بادشاہ عیش پرستی کے ساتھ آتش مزاج بھی تھا، ان میں متانت و سنجیدگی، نواب سعادت علی خاں کی آنکھیں دیکھے ہوئے، زیادہ دنوں تک نبھ نہ سکی، سنہ ۱۲۴۸ھ میں معزول ہو کر پھر فرخ آباد چلے گئے،

عرصہ کے بعد محمد علی شاہ کے زمانے میں پھر بلائے گئے۔ وہ ان کی کارگذاری سے ذاتی واقفیت رکھتے

حکیم مہدی کو شیخ صاحب یاد آئے، چوبدار بلانے آیا، انھوں نے اس کو کچھ دے دلا کر راضی کیا کہ انکو دربار میں لباس پہننے کی مہلت دیجئے، اور تعریف نگری کے پیچ درست کرنے کے بہانے موقع ڈھونڈھنے لگے، ادھر چوبدار شربت پانی کی فکر میں لگا، شیخ صاحب موقع پاکر نکل کھڑے ہوئے اور فقیر محمد خاں گویا کے ہاں چھپ کر پہونچے، خاں صاحب نے منشی گنج بہادر … کے میانے میں پردہ ڈال کر زنانی سواری کی طرح کول ہاران کو بھیج دیا، وہاں سے کہار اجیار پور ہوتے ہوئے الہ آباد پہونچے، اور شاہ ابوالمعالی کے ہاں دائرہ شاہ اجمل میں مہمان ہوئے وہاں رہتے رہتے گھبرائے تو کانپور چلے آئے، اسی سلسلہ میں بنارس اور عظیم آباد کی بھی سیر کی،

جب حکیم مہدی معزول ہوکر فرخ آباد گئے تو خیریت سے گھر آئے، مگر پھر تاریخ کہی اور انصاف یہ ہے کہ خوب کہی،

افتاد حکیم از وزارت — تاریخ بطرز نو رقم کن
از جائے حکیم ہشت بر گیر — [illegible] کم کن

چند دنوں کے بعد حکیم مہدی کا ستارہ پھر چمکا، محمد علی شاہ نے قلمدان وزارت سپرد کیا، شیخ صاحب پھر بھاگے، اور الہ آباد پہنچے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بار بار الہ آباد جانے سے گھبرا گئے تھے، اس گھبراہٹ کو بہت لطیف انداز سے ظاہر کیا ہے،

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں قدم — آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

مگر شیخ خوش قسمت کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حکیم مہدی کی وفات پر ۱۲۵۲ھ میں ان کی دوادوش ختم ہوئی

تھے کیونکہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں دونوں اہلکار تھے، اس زمانہ میں ان کو کام کرنے کا بہترین موقع حاصل تھا، مگر افسوس ہے کہ موت نے مہلت نہ دی، نو مہینے کے بعد آخر ماہ رمضان ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی،

امین آباد سے شاہ مینا کو جاتے ہوئے ان کا مقبرہ داہنے ہاتھ کو پڑتا ہے،

کا خاتمہ ہوگیا، اور اب کی دفعہ جو آئے تو مر کر بھی گھر سے نہ نکلے،

محمد علی شاہ نے سو روپیے ماہوار گھر پہ مقرر کر دیئے، اور ہر سال قطعہ سال جلوس پر خلعت بھی عنایت ہوتا تھا، محمد علی شاہ مذہبی آدمی تھے، آمدنی کا حساب کر کے سال بسال اپنے مال و دولت کی زکوٰۃ نکال لیتے تھے، اور جہاں تک ان سے ہو سکتا علما و مجتہدین کی خدمت کرتے تھے، شاعروں کو دینا شاید گناہ سمجھتے ہوں، انھوں نے ان کی تنخواہ بند کر دی، مگر شیخ صاحب ایسے صاحب سلیقہ تھے کہ جس قدر نواب محسن الدولہ کی سرکار سے یا معتمد الدولہ آغا میر کی مہربانی سے کمایا تھا، اسکو بیجا صرف نہیں کیا، تمام عمر فراغت سے زندگی بسر کی،

آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ بیاں کا جنجال رکھا ہی نہ تھا، مگر قیصر التواریخ میں سید محمد میرزا انس نے لکھا ہے، کہ بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی، حکیم زین العابدین ان کا بیٹا مرزا محمد علی کا شاگرد طبابت کرتا، اور خوش چلنی سے زندگی بسر کرتا ہے، بہرحال ناسخ نے ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی، اور ٹکسال والے مکان میں مدفون ہوئے، میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی،

دلا شعر گوئی بمُرد لکھنؤ سے

دو دیوان ان کے چھپ گئے ہیں، پہلے دیوان میں ان کا خاص انداز نہایت نمایاں ہے، دوسرا دیوان الہ آباد کی کمائی ہے جس میں بے وطنی اور پریشانی کی جھلک ہر جگہ نظر آتی ہے، اسی وجہ سے اس کا نام بھی دفتر پریشان تجویز کیا تھا،

ان دیوانوں میں غزلوں، رباعیوں، قطعوں اور تاریخ کے سوا اور کسی قسم کی نظم نہیں، طبیعت قصیدوں سے بہت مناسبت تھی، اگر خدا جانے اس کا شوق کیوں نہیں تھا، شاہانِ اودھ کی تاریخ و تہنیت میں کبھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی ہے تو غزلوں اور قطعوں میں اس فرض کو ادا کر دیا ہے،

ایک مثنوی حدیث مفصل کے ترجمہ میں ہے، اور ایک مولود شریف ہے، یہ دونوں نظمیں
ان کے سر پر نہیں کھلتیں، غزلوں میں بقول آزاد شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی
بہت ہے، اور تاثیر کم، صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دیکر ایسی دستکاری و
میناکاری کی ہے کہ بعض خوشنما بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے ہیں،

بات یہ ہے کہ ناسخ کی قوت تخئیل نہایت زبردست ہے، ایک چیز کو وہ سو سو دفعہ دیکھتے
ہیں اور ہر دفعہ کے دیکھنے میں انکو ایک نیا عالم نظر آتا ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کرکے
تمثیل اور مبالغہ سے اس میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس قوت کے استعمال
کرنے میں اکثر اعتدال سے گذر جاتے ہیں،

کہیں یہ مبالغہ اصلیت اور واقعیت سے اتنا دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی
کے ساتھ آفتاب تک ان کی گرد ہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف کسی لفظی تناسب
یا ایہام پر ہوتی ہے، کہیں دور کی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی بنیاد قائم کرتے ہیں جو
لطیف اور قریب الماخذ نہیں ہوتے کہیں پر کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دیکر اس کے تمام لوازم اور اوصاف
اس میں ثابت کرتے ہیں حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی،

یہ ان کا انداز بیان ہے جس کا نام نازک خیالی یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اسی نے
متاخرین کی شاعری کو تباہ کرکے چھوڑا، یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کرکے
اس کو چمنستان خیال بنا دیتے ہیں، اور افسوس ہے کہ یہی ان کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے،
پہلے ناسخ کی ایک پوری غزل میں نقل کرتا ہوں تاکہ اُن کا مخصوص انداز اس سے
معلوم ہو، اس کے بعد غزلوں کے منتخب اشعار پیش کیے جائیں گے،

روے جانان کا تصور میں جو نظارہ ہوا ‌ ‌ ‌ دل میں تھا جو داغ حسرت عرش کا تارا ہوا

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا / اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا
کس ادا سے تونے شانہ اپنے بالوں میں کیا / سر پہ ہر محبوب کے خط، مانگ کا آرا ہوا
محفلِ مے میں جو آیا تو برائے مے کشی / تھا جو شیشہ جوشِ مے سے ایک فوارا ہوا
گرم ہے کیا عکس تیرے شے آتشناک کا / آئینہ کی پشت کا معدوم سب پارا ہوا
سات غائب ہو گئی، حاضر ہوئے آثارِ صبح / وصل میں خورشید گویا شام کا [illegible] ہوا
چشم بد دور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف / سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا
ابر کو نسبت بھلا کیا چشمِ دریا بار سے / ایک دم رونے کنارہ پر جو ہم دھارا ہوا
شب ہوا سے ہل گئی جو اسکی زلفِ عنبریں / دم میں موم شمع سارا عنبرِ سارا ہوا
کس قدر ہے تیز ظالم آتشِ رنگِ حنا / سنگ پا گئے ہی بس تلووں سے انگارا ہوا
قد ترا سرو آنکھیں نرگس زلف سنبل رخ ہے گل / کون ہے گلگشت گل میں جو چمن آرا ہوا
جوشِ وحشت تیری آنکھوں پر یہ خوش چشموں کو ہے / مثل آہو دشت میں ہر ایک آوارا ہوا
ہو گئی ہے شمع تیرے سامنے خجلت سے آب / شمعداں گویا تری محفل میں فوارا ہوا
چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خواب مرگ / بعد مرنے کے جنازہ مجکو گہوارا ہوا
زاہدا ہم جانتے ہیں عشقبازی ہے گناہ / گھر لٹایا ہے جو وحشت میں وہ کفارا ہوا
ہو رہا ہے بت پرستی کا یہ دنیا میں عذاب / مجکو ہر داغِ جنوں دوزخ کا انگارا ہوا
پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا / پیٹھ پر بارِ گنہ کا جمع پشتارا ہوا
دود چھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں / ہاتھ میں جامِ مے گلرنگ انگارا ہوا
ہجرِ ساقی میں نہیں اے میکشو آوازِ رعد / نوحۂ غم میں بہر خونریزی یہ نقارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا / حوض میں روشن برنگِ شمع فوارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو — قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچار

غزل کے منتخب اشعار

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا — تیر جو آواز دے ہے نفس تیر انداز

پاؤں بھی اب اے جنوں کر پیچھے کانٹوں کے نذر — سر تو مدت سے نیاز سنگ طفلاں ہے

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھکر — قاصد خیال آئیگا خط کے جواب کا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے — آج آتی شب فرقت میں تو احسان

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں — دل دکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خا

نہ دہشت محتسب کی ہے نہ منت مے فروشوں کی — نہاں ہے نشہ آنکھوں میں شراب بے

ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں — ملی ہے عقل لیکن بخت ہے برگشتہ

بس میں ہو تو نہ پرائے کے کبھی اے ناسخ — آہ میرا مرے قابو میں اگر دل

خواب میں میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں — سو مجھے حسرت دیدار نے سو

عمر بھر وحشت میں گو صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں رہ گیا

رنگِ عشرت باغِ عالم میں نظر آتا نہیں
گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو غم صیاد کا

تمام عمر یوں ہی ہو گئی بسر اپنی
شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا

میکدہ تک محتسب کو میکشو آنے تو دو
دیکھ کر پیمانہ کو پیاس تسکیں ہو جائیگا

او محتسب سمجھ کے تو شیشہ کو توڑیو
دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

تھی شہادت سے غرض سو اس ادا میں ہو گئی
گو نہ قاتل سے نزاکت کے سبب خنجر اٹھا

تجھ سے انصاف تو کر چھٹ نہ سکا ایک رقیب
میں نے کیونکر تری الفت میں زمانا چھوڑا

جام مے لبریز ہیں ساقی فقط مطرب نہیں
گل کھلے ہیں باغ میں خالی ہے جائے عندلیب

ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہو گی ہزاروں بار صبح

کیا روز بد میں ساتھ رہے کوئی ہمنشیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

اے میکشو نزاکتِ ساقی کو دیکھنا   لاتا ہے رکھ کے مثلِ سبو جام دوش پر

مر گیا کیا ناسخِ میکش جو سارے مے فروش   مسجدوں میں بیٹھے اپنی اپنی دوکان چھوڑ کر

ناز حوروں کے اٹھائیں یہ کہاں اپنا دماغ   ہو بہار اور فردوس سے بہتر باہر
اے اجل تو نے غضب تفرقہ پردازی کی   قبر میں تو سرِ شوریدہ بھتر باہر

کافی ہے سر پہ داغِ جنوں میں نامِ یار   بیزار ہوں فلک کے تاجِ رنگیں سے میں

دمِ آخر تو کر لوں نظارہ جی بھر کر   الٰہی خنجرِ سفاک آہستہ ہو

میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار   اے ناصحو بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھکو

معشوقوں سے امید وفا رکھتے ہو ناسخ   نادان کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ

ہر کسی کا کام رکھتا ہے ادھورا آسماں   گر ہم پہونچا سرِ شوریدہ تو پیچیدہ ہیں

تاب سننے کی نہیں بہرِ خدا خاموش ہو   ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

داغِ فرقت زیست بھر، سوزِ جہنم بعدِ مرگ — ان بتوں کو کس توقع پر خدایا چاہیے،

فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول — کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے

شوق سے نے گردش اس درجہ مجکو چیرا — محنت سے رہ پوچھی خانۂ تن کی

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے — کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

کیا عجب ہے جو بچائے ابرِ رحمت بے کسی — ہے یہی تربت مقرر ناسخِ مغفور کی

خواجہ حیدر علی آتش

آتش تخلص، خواجہ حیدر علی نام تھا، آبا و اجداد دلی کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش دلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں سکونت اختیار کی،

آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے، باپ کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت تھے، ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی خوب نہ ہوئی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، کسی مربی کے موجود نہ ہونے سے فوج کے لڑکوں کی صحبت میں بانکے اور شوریدہ پشت ہو گئے،

اُس زمانہ میں بانکپن اور بہادری کی قدر تھی، نواب محمد تقی خاں[1] ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے، یہاں آکر دیکھا تو ان کو دوسری دنیا نظر آئی۔ انشا و جرأت کی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، انشا اور مصحفی کا اکھاڑا جما ہوا تھا، واہ واہ کے نعرے زمین سے آسمان تک جاتے تھے، ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ دو چار روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ یہ خود صاحب طرز ہو گئے،

استعداد علمی نہ تھی ... زمانہ بزرگوں کی صحبت اور مصحفی جیسے استاد کی شاگردی نے شاعری کی ضرورتوں سے ان کو اچھی طرح واقف کر دیا تھا، کلام کو ... دیتے رہے، اصناف سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، زبان کی تراش خراش

---

[1] اسد ولد نواب محمد تقی خاں بہادر ترقی تخلص، آغا سید محمد امین نیشاپوری کے خلف الرشید، فیض آباد میں بود و باش تھی اور نواب بہو بیگم کی سرکار سے توسل رکھتے تھے ... لکھنؤ ... بہو بیگم کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر کے عہد میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، میر سوز کے شاگرد تھے، شعر اچھا کہتے تھے، ان کا خاندان شرافت اور وضعداری میں ہمیشہ یکتا رہا ہے، لکھنؤ کی زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا مگر ان لوگوں کی وضعداری نہیں بدلی، مرزا حیدر اور ان کے دو بیٹے مرزا اعلیٰ جاہ اور مرزا والا جاہ اس خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور حقیقت یہ ہے کہ فضل و کمال، شرافت و پرہیزگاری میں یہ دونوں بھائی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، یہ شاعر تھے، مگر یہاں صرف نواب محمد تقی کے دو شعر نقل کرتا ہوں۔

ساکنان کعبہ نے کی بت پرستی اختیار ... وہ صنم نام خدا کیا ان دنوں ...

... آئینہ خانہ ... ہے

صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے زمانہ کے استاد مسلم الثبوت ہوگئے۔

یہی تو یا اسی روپیہ مہینہ بادشاہ کے ہاں سے ملتا تھا اسی کو گزران ... یاروں میں سے کوئی سلوک کرتا، تو اس سے بھی انکار نہیں تھا۔ باپ دادا سے توکل ترکہ میں پایا تھا، وہ موتی سلجھے ہی بانکپن اور شورہ پشتی کی تعلیم لی تھی، یہ دونوں رنگ بڑھاپے تک قائم رہے۔

گیروا تہبند باندھتے تھے، ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا تیغ کا کام کا بیمہ تھا۔ جوتا پاؤں میں، ڈنڈے میں ایک چھلہ لوہے کا لگا رہتا تھا، ایسے فاقہ کی حالت میں بیٹھے رہتے فاقہ کشی کرتے۔ بھنگ پینے کا چسکا زندگی بھر رہا۔

لکھنؤ میں نواز گنج کے قریب، جو سیوں سے آگے مادھودن کی چڑھائی مشہور ہے وہاں ان کا ایک چھوٹا سا باغچہ، ایک کچا سا مکان تھا، اُس کو آتش نے خرید لیا تھا، اسی میں رہتے تھے، شادی بھی کر لی تھی، ایک بیٹا تھا محمد علی نام، جو عین شباب ... بڑھاپے میں وہی عصائے پیری تھا، بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

اخیر زمانے میں مولا خان کی سرائے میں اُٹھ آئے تھے، داڑھی بھی بڑھائی تھی، اس پر مہندی کا خضاب، مگر وضعداری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی رندانہ مزاج، وہی فقر و فاقہ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے بچھ بچھی حقہ لگا رہتا۔ کوئی امیر غریب آتا اُس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش کیا جاتا۔

سنہ ۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے، یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے، میر وزیر حسین فوق نے تاریخ لکھی، ع

لکھنؤ میں نام آتش کر گئے

تمام عمر کی کمائی ایک دیوان غزلوں کا ہے جو ان کے سامنے رائج ہوگیا تھا۔ دوسرا

تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا، وہ بھی حجم میں خاصا ہے، شاگردوں میں یہ دوست علی خلیل، صاحب مرزا شاد، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علی خاں رند، نواب مرزا شوق، اور پنڈت دیا شنکر نسیم زیادہ نام برآوردہ ہوئے،

زبان کی صحت و صفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ کے دوش بدوش پہنچتے ہیں، مگر نازک خیالی اور بلند پردازی میں ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے، اور سوز و گداز میں یہ ان سے آگے ہیں، مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبد الغفور کے نام ہے کسی تقریب سے یہ قطعہ نقل کیا ہے، ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار | زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفان | خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم | ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس چیزے دگر کی مثال میں میر تقی میر، مرزا سودا، آتش اور ذوق کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ناسخ کے ہاں کمتر، آتش کے ہاں بیشتر یہ تیر نشتر ہیں،

میں ان کی بھی ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں، اس کے بعد منتخب اشعار پیش کرونگا،

فریبِ حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا | خدا کی یاد بھولا شیخ، بت سے برہمن بگڑا
قبائے گل کو پھاڑا جب مرا گل پیرہن بگڑا | بن آئی کچھ نہ غنچے سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا
نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا | تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا
تکلف کیا جو کھوئے جانِ شیریں پھوڑ کر سر کو | جو غیرت تھی تو پھر خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا
کسی چشمِ سیہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ | تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگلی ہرن بگڑا

اثر اکسیر کا میں نے قدم سے تیرے پایا ہے
جدا ہی خاک رہ مل کر بناتے میں بدن بگڑا

ترقی تقلید سے کبک دری نے ہنر کریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اسکا چلن بگڑا

زوال حسن کھلواتا ہے میوے کی قسم مجھ سے
لگا یا داغ خط نے آن کر سیب ذقن بگڑا

رخ سادہ نہیں اس شوخ کا نقش عداوت سے
نظر آتے ہی آپس میں ہر اہل انجمن بگڑا

وہ بدخو طفل اشک اے چشم تر ہیں دیکھنا کہ دن
گھروندے کی طرح سے گنبد چرخ کہن بگڑا

عجب مژگاں کی جنبش کا کیا اقبال نے کشتہ
شہید ہوں کے ہوے سالار ہم جب سے تمن بگڑا

کسی کی جیب کوئی تقلید کرتا ہی میں دیا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اسکا دہن بگڑا

کمال دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کب یا دن کوئی یاسمن بگڑا

رہی نفرت ہمیشہ داغ عریانی کو جامے سے
ہوا جب قطع جامہ پر ہمارے پیرہن بگڑا

رگڑوائیں یہ مجھ سے ایڑیاں غربت میں قسمت نے
ہوا مسدود رستہ جادۂ راہ وطن بگڑا

کہا بلبل نے جب توڑا گل سوسن کو گلچیں نے
الٰہی خیر کیجو نیل رخسار چمن بگڑا

اللہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

جہاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندوں سے
ہوا ناسور نو پیدا اگر زخم کہن بگڑا

تونگر تھا بنی تھی جب تک اس محبوب عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیم تن بگڑا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیفیت مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

آتش نے مسلسل غزل بھی لکھی ہے جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے، بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلوں کے لکھنے میں

بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں، مثلاً ہر اک موسم کی کیفیت صبح وشام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، سفر کی روداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں جو دو ایک شعر میں نہیں سما سکتیں، اس غزل کو بھی نمونہ کے لیے نقل کرتا ہوں۔

غزل مسلسل

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا
عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل فرحناک تھی روح، دل شادماں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

منتخب اشعار

خدا سر سے سودا نہ لے تری زلف پریشاں کا جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو اپنے سنبلستاں کا

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ کر چلے گئے | میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں | اُس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا | جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

حال ہے مجھ نیم جاں کی مرغِ بسمل کی تڑپ | ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا
کارواں یاروں کا پہنچا منزلِ مقصود تک | میں بگولے کی طرح سے خاک اُڑا کر رہ گیا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبرِ آتش پر نہ یار | دو ہی دن میں پاسِ الفت اُٹھ گیا

صندل کو مول لیکر کس کی بلا رگڑتی | میں درد سر کی خاطر یہ درد سر نہ کرتا

خریدارِ جنت آئے تھے بازارِ عالم میں | [illegible]

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری | خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئے دوست
فرشِ گل بستر تھا اپنا خاک پر سونے میں اب | [illegible]
اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے | دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے | کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

منہ دیکھتا ہوں یار کا کچھ کہہ نہیں سکتا | آنکھیں تو کھلی ہیں مرے دیکھنے ہی کو زباں بند

کوچہ سے یار کے کہہ صبا دور پھینک آئے | مدت کے بعد آئی ہیں ہم جا کے اُدھر

کون کہتا ہے بسر ہو گئے ایامِ جنوں | اک گریباں نظر آتا نہیں بے چاک ہنوز

کوچۂ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں | در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

جنوں میں بھی ہوئی زائل نہ مجھ سے دانائی | رہا میں ناز و وحشت میں بیشہ ہائے عشق

رخسارِ زرد پر مرے بہتے ہیں اشکِ خوں | یکجا دکھا رہے ہیں خزاں و بہار رنگ

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم | نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

اسے جان کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا ہے | ہماری قبر پہ نہ یار سے کی آرزو رو

جامِ شرابِ عشق سے دونوں ہیں بے خبر | بلبل چمن میں مست ہے میں کوئے یار میں

بلند و پست بسکہ روح کو برابر ہے
نسیم بے سر و پا کا کہاں مقام نہیں

برباد ہو رہے ہو کچھ آتش تمہیں نہیں
مٹی خراب یعنی کبھی ست اس دیار میں

یہ سعادت لکھی ہے قسمت میں کس کے دیکھیے
خون گرفتہ ایک ہیں مرد اور خنجر سیکڑوں

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جس کے قدر ہے
مئے الست نہ خم میں ہے نہ شیشہ میں نہ ساغر

مست شراب عشق کب آتے ہیں ہوش میں
یہ نشہ وہ نہیں ہے کہ جس میں خمار ہو

پر کترتے ہیں مرے صیاد تو کاٹ اس طرح
حسرت پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

باغ میں آئے ہو ساتھ ان کے بھی پھر لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہے چکاتے جا

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سوا نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے
زمیں میں دب گئے وہ جو آسماں سے نہ تھے

افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی
سر توڑ کے مر جاتے اسی کوہکنی سے

خوب روئے تھے لپٹ کر اپنے وطن کا سن کے نام
کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے

لگی ہے دیر بہت نامہ بر کے آنے میں
وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کے بدلے

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا آتی رہی
دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے

ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے ہیں گام
گر ہی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
مقام کو بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے گو دشمن ہزار راہ میں ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ مڑ کر کبھی بیدرد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

خواجہ محمد وزیر وزیر

محمد وزیر نام، وزیر تخلص، خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے، ملک توران وطن تھا، بانیٔ سلسلہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے، اور ننھیالی قرابت مرزا اداد کے نامی گرامی خاندان سے تھی،

مرزا یعقوب بیگ نانا تھے جو نواب امیر الامرا مرزا حیدر بیگ خاں کے حقیقی بھائی تھے، غرض دادھیال و ننھیال دونوں طرف سے عالی خاندان تھے،

فارسی کی پوری اور عربی کی کچھ کچھ درسی کتابیں علمائے لکھنؤ سے پڑھیں، عروض و قافیہ میں بہت اچھی مہارت تھی، گوشہ نشینی اور توکل باپ دادا سے ترکہ میں ملا تھا، ساری عمر کسی کی نوکری نہیں کی،

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا، شیخ امام بخش ناسخ سے مشق سخن کی، اور انہی کی زندگی میں استاد مسلّم الثبوت ہوگئے، شیخ صاحب کو ان پر فخر تھا اور بجا طور پر فخر تھا، اکثر اپنے شاگردوں کو اصلاح سخن کیلئے ان کے سپرد کر دیتے تھے اور ہر طریقے سے انکی توصیف فرماتے رہتے،

ان کو آخر میں شعر و سخن سے نفرت سی ہوگئی تھی، نقوش و تسخیر اعمال کا شوق رہ گیا تھا، ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے، سو روپیہ ماہوار سے کم خرچ نہیں تھا، مگر آمدنی کہیں سے نہ تھی، واجد علی شاہ بادشاہ نے دو بار یاد فرمایا، مگر علالت کا عذر کر کے اپنی جگہ سے نہ ہلے، اسی وجہ سے لوگ انکی آمدنی کو دست غیب پر محمول کرتے تھے

سنہ ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خاں قبول نے تاریخ کہی ع

شد زیر پادشہ شاعرانِ نامی بود

منشی اشرف علی شاگرد رستم دہلوی نے کہا ع

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی زندگی میں ابتدائی کلام کا جو مجموعہ مرتب ہوا تھا، وہ تلف ہوگیا، دوبارہ اسکے جمع کرنے کا خیال نہیں کیا، عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی کو اس کا خیال پیدا ہوا تو اُنھوں نے کچھ سادی کتابیں ان کو لا کر دیں اور ان کے دوستوں اور شاگردوں کو متوجہ کیا اس طریقہ سے پھر دوبارہ ایک دیوان مرتب ہوا، جو ان کے مرنے کے بعد سنہ ۱۲۷۱ھ میں چھاپا گیا،

رنگ ان کا وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت، بیانات کی متانت اور زبان کی صحت، غرضکہ پختگی کلام کے تمام لوازم اس میں موجود ہیں لیکن غزل کی جان یعنی تاثیر کے نہ ہونے سے ان کے کلام کی حیثیت ایک حسین مگر جسد بے روح سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی،

ان کے تمام دیوان کو اول سے آخر تک پڑھو اس میں دس شعر بھی ایسے نہ ملیں گے جن سے اہلِ دل کے قلوب کو سرور اور اربابِ نظر کی آنکھوں کو نور حاصل ہو،

مگر اس میں شک نہیں کہ جو ان کا رنگ ہے اُس میں ناسخ و آتش کے بعد انکے معاصرین میں سے کوئی انکا مثل نہیں، نمونہ کیلئے ایک غزل نقل کرتا ہوں اسکے بعد انتخابی اشعار لکھونگا،

عوض مطلع کے کھینچونگا میں نقشہ روئے جاناں کا — بنے تا مطلعِ خورشید مطلع اپنے دیواں کا

نہیں انبوہ خط میں جلوہ حسن روئے جاناں کا — عیاں ہے تخت پر یوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا

حنائی ہاتھ کی تاثیر طرفہ رنگ لائی ہے — شجر تیرے نگیں کا بن گیا ہے نخل مرجاں کا

کھلے حرف باتوں کے نظر آتے ہیں حیرت ہے / عیاں جوہر ہیں رشکِ آئینہ ہے جسمِ جاناں کا
کریگا آتش افروزی چمن سودائے گیسو میں / دھواں بنکر رولائیگا نظارہ سنبلستاں کا
بگڑ کر اس نے چلمن سے جو ہمکو آنکھ دکھلائی / غزالِ چشم پر دھوکا ہوا شیرِ نیستاں کا
پری وش پڑھتے ہیں کلمہ مرا میں ہوں وہ دیوانہ / ہر اک داغِ جنوں میں ہے اثر مہر سلیماں کا
ترے ہونٹوں کے آگے رنگ جب اسکا نہیں جمتا / تو کیا کیا جوش کھاتا ہے لہو لعلِ بدخشاں کا
ہے یہ حسنِ دو ہفتہ چار دن کی چاندنی ساقی / چھلک جاتا ہے بھرتے ہی پیالہ ماہِ تاباں کا
نہیں ہے سرمہ کا دنبالہ اے ترک آنکھ میں تیری / پھریرا اسرمئی ہے یہ نشانِ فوجِ مژگاں کا
ذقن میں دانۂ خالِ سیہ دیکھا تو میں سمجھا / لطافت سے عیاں ہے تخم یہ سیبِ زنخداں کا
جہاں کو قتل کرتے ہیں یہ مہرو جامہ زیبی سے / مگر تیغِ ہلالی ہے ہلال ان کے گریباں کا
حلب کی صبحِ صادق کا گماں ہے اسکے عارض پر / مسی پر لعلِ لب کے شبہہ ہے شامِ بدخشاں کا
بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی / دلِ گم گشتہ آپ ہی خضر ہے اپنے بیاباں کا
ہوئے ہیں جمع آنسو کر رہے ہیں شوخیاں کیا کیا / گماں ہے دامنِ مژگاں پہ بازی گاہِ طفلاں کا
فلک پر ہے دماغ اے منعمو اپنا گدائی میں / بہت ہے بوریا خواہاں نہیں تختِ سلیماں کا
نہ پایا بوسۂ لب اس پری سے جب تو یہ سمجھا / نہیں انساں کی قسمت میں چشمہ آبِ حیواں کا
لبِ لعلیں پہ اس کے یہ نہیں ہے پان کا لاکھا / نکل آیا ہے کھا کر جوشِ خوں لعلِ بدخشاں کا
مسیں بھیگی نہیں ہیں لبِ زیریں اس آئینہ رو کی / نمایاں پشتِ لعلِ لب پہ ہے یہ عکس مژگاں کا

منتخب اشعار

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر / زمینِ کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر
اسی خاطر تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے / اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا قیس اس نے غیروں کو بھوتے ہم رشک کے مارے
اجل بھی وہ دشت آئی نصیب دشمناں ہو کر

وزیر آغوش پیمان وقت میں بھی خالی نہ تھی آتی
نہیں ہے یار اگر تو درد ہے پہلو میں

تم بھی نظر و ہر است نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے بیزار ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

ہے نہ جنم بہ عجب خواب ناز تر
فتنہ تو سو رہا اور فتنہ جاگا

ہوئی گر صلح بھی تو بھی رہی رنجش
ملا نہ دل تو آنکھوں سے ملا کی

پڑا ہے تفرقہ سب اپنا سے
وزیر اپنے کہیں [illegible] کہیں ہم

قطعہ

نہ کر عوض مرے جرم و گناہ بے حد کا
الٰہی تجھ کو عفو و کرم سے کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر تجھے محتاج
یہ اس کا بندہ ہے جس کو کریم کہتے ہیں

میر وزیر علی صبا

درستی بندش و صحت و صفائی محاورہ و قت نگری بلندی اندیشہ سر آمد زمان ہو رائے و [illegible]
وزیر علی نام صبا تخلص تھا میر بندہ علی کے بیٹے تھے لکھنؤ وطن تھا [illegible] اور اسی شہر میں
یہیں ان کا نشو و نما ہوا اس زمانے کے مشہور زادہ [illegible] کی طرح [illegible] کی [illegible] اور [illegible]

کی بقدر ضرورت تعلیم پائی،

اُس زمانہ میں علوم قدیمہ کا زور شور تھا، عربی صرف و نحو اور منطق کے ساتھ ساتھ فن طب اور علم کلام کے نکات مسائل کا سمجھ لینا شریف زادوں کے لئے ضروریات زندگی میں داخل تھا، جو لوگ سبقاً سبقاً تحصیل نہ کرسکتے تھے، وہ بھی علماء کی صحبت میں اتنی معلومات بہم پہونچا لیتے تھے کہ مجلس گرم کرنے کو وہ کافی سے زیادہ ہوتی تھیں[1]،

میر وزیر علی صبا نے اسی زمانے میں تعلیم و تربیت پائی، شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، خواجہ حیدر علی آتش کے فیض صحبت سے وہ بھی مشاق ہو گئے،

ان کے دیوان کا نام غنچۂ آرزو ہے، جو ایک ضخیم جلد میں شائع ہو گیا ہے، صحت و صفائی محاورہ اور لطف سخن میں ان کا کلام ہمعصروں کی نسبت سے بہت بڑھا ہے،

سنہ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی، شاگردوں نے خوب خوب تاریخیں کہیں

[1] اس زمانہ میں ایک معمولی سے معمولی آدمی کی زبان پر بھی مصطلحات علمی اس بے تکلفی کے ساتھ رواں ہوتے تھے کہ انکو سن کر کسی طرح یہ باور نہیں آتا تھا کہ اس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں، اب بھی لکھنؤ میں شاہی زمانہ کے جو سن رسیدہ لوگ موجود ہیں ان سے مل کر اسکی تصدیق کی جا سکتی ہے،

میرے بچپنے میں ایک فقیرنی بھیک مانگنے آیا کرتی تھی، بیرانہ سالی میں بھی اس کی آواز میں لوچ اور شیرینی، صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں بہت شکیل اور کسی شریف گھرانے کی لڑکی ہوگی،

میرے ایک دوست نے اسکی بہت تعریف کی، اور کہا کہ باتیں کرنا چاہو تو دو یا آنہ کی بالائی منگوا کر اس کے سامنے رکھ دو، میں نے اسکو بلا کر بٹھایا اور بالائی پیش کی، تو بہت خوش ہوئی اور باتیں کرنے لگی، معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں، فارسی اور اردو کے اساتذہ کا کلام خصوصاً سعدی شیرازی کے منتخب اشعار اور گلستاں کے برجستہ فقرے اس طرح برمحل پڑھتی اور ترجمہ کرتی تھی کہ اسکی حلاوت آج تک باقی ہے،

افسوس ہے کہ بچپن کی وجہ سے اس کا خیال نہیں ہوا کہ اس سے عہد قدیم کے حالات پوچھتا، صرف اتنا معلوم ہوا کہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لڑکیوں کا کوئی مدرسہ تھا، اس مدرسہ سے اسکو کچھ تعلق رہا ہے،

کسی نے کہا۔ ع

صبا در گلشنِ فردوس جا کرد

کسی نے کہا: ع

صبا از گلشنِ دنیا کجا رفت

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے / بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اللہ رے اُن کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے / کیونکر کوئی جیے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہانِ بے ثبات / دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

اللہ ہے جو حال یہ بندہ کے ہو کرم / پہچانتا ہوں خوب میں سرکار کا مزاج

آدم سے باغِ خلد چھٹا ہم سے کوئے یار / وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج
کہتے ہیں میرے دوست مرا حال دیکھ کر / دشمن کو بھی خدا نہ کرے مبتلائے رنج

نہ کہئے نالۂ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر / سنی ہی تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آفت ہے قید سبحہ و زنار جان کو / تار حیات میں نہیں یہ گتھیاں پسند

صیاد و باغباں نہ کریں کج ادائیاں — نازو نیاز بلبل و گل میں ہے چار روز

اس مرقع میں عجب نقشہ ہے دیکھو جس طرف — صورتیں دس بیس ناخوش ہیں جو ہیں دو چار خوش

ہوش میں آ مجھے کیا جان نہیں اپنی عزیز — دوست رکھوں میں تجھے اے دلِ دشمن کب تک

کہتے تھے دل نہ دیں گے کسی کو تمام عمر — مجبور ہو گئے مگر اک دلستاں سے ہم

ہمیں کو رنج دیکر اُلٹے شکوے ہم سے کرتے ہو — جو اب اپنا نہیں رکھتے ہو تم باتیں بنانے میں

کون سنتا ہے تری جوشِ جنوں میں ناصح — خضر بھی آئیں تو ہم راہ بتا دیں اُن کو

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

نواب سید محمد خاں رِند

سخنش درد انگیز و کلامش مہر خیز در عین بے تکلفی تکلفے دارد۔ (از مہر جہاں تاب)

سید محمد خاں رند نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے، جو نواب برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے، ۱۱ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے، چونکہ "نواب وزیر" کے خاندان سے قریبی تعلق تھا، اس واسطے نواب بہو بیگم کے دامنِ تربیت

میں ناز و نعمت سے پرورش پائی، جب تک وہ زندہ رہیں فیض آباد میں رہے، ان کے مرنے کے بعد ۱۲۵۷ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی،

شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی، جب تک فیض آباد میں رہے میر مستحسن خلیق سے مشق سخن کرتے رہے، لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے، پہلے وفا تخلص تھا، خواجہ صاحب نے رند بنا دیا،

ایک دیوان فیض آباد میں میر خلیق کے شورہ سے تیار ہو چکا تھا، لکھنؤ آنے کے بعد اس کو غرق آب کر کے دو دیوان اور مرتب کئے جو گلدستۂ عشق کے نام سے چھپ گئے ہیں مگر ان دیوانوں میں بھی میر خلیق کے فیض صحبت کا رنگ صاف جھلکتا ہے،

بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ کی شاعری کا مدار مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت پر ہوا کرتا ہے، ان کے ہاں تینوں چیزیں کمزور ہیں، بلند پروازی اور خیال آفرینی میں خواجہ وزیر اور زبان کی صحت میں میر صبا کو یہ نہیں پہنچتے، مگر ان کے ہاں سادگی اور صفائی اور تاثیر کا ہلکا رنگ نظر آتا ہے، جس سے خواجہ وزیر محروم ہیں اور صبا کے ہاں بھی کچھ پایا جاتا ہے،

سنہ وفات ان کا میری نظر سے نہیں گذرا، مگر اتنا معلوم ہے کہ آخر عمر میں منہیات سے تائب ہو گئے تھے، اور دربار اودھ کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو کر غدر سے چند سال پہلے عتبات عالیات کی زیارت کی نیت سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، چونکہ ان کے مقدر میں یہ بات نہ تھی بمبئی پہونچ کر سفر آخرت اختیار کیا،

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا
مجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ضعف اتنا کہتے ہیں سینہ سے لبوں تک آتے
سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اٹھا

چھوڑا قفس سے تب ہمیں صیاد تو نے آہ
جب موسم بہار چمن سے نکل گیا

مژدہ اے گرد ملال آیا تیرے دل کا عالم
شہر سے آباد آتا ہے نظر ویرانہ آج

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجکو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں، میں کہاں، کہاں صیاد

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھائے بلبل

لطف گلگشت چمن کنج قفس میں بھولے
اب تو نقشہ بھی گلستاں کا مجھے یاد نہیں

کبھی خوف خزاں ہے اور کبھی صیاد کا کھٹکا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں

اے دل ہدفِ تیرِ نگہ پھر کیا تو نے — اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آلے

قید ملت میں پھنسے چھوڑ کے رندانہ طریق — کیسے جھگڑے میں تم اے کافر و دیندار پڑے

کیا بتاؤں میں کسے یاد ہے ہجران کا دن — تیں گذریں میں تجھے بیمار پڑے

وعدہ پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے — کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

جنوں اگرچہ ہمیں ہر برس ہوا لیکن — یہ ولولے نہ ہوئے تھے جو اب کی سال ہوئے

چار دن کی دوستی کا ہے زمانے میں رواج — کس توقع پر کسی سے آشنائی کیجئے

لے چلا جان لب پہ آ کے ٹھہرنے سے فائدہ — رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

ستم کرتا ہے چرخِ سفلہ پرور اہلِ غیرت پر — جو کانوں سے نہ سنتے تھے وہ آنکھوں سے دکھاتا ہے

کچھ ہنس کے کٹی وصل میں کچھ ہجر میں رو کر — ہر طرح غرض عمرِ دو روزہ بسر آئی

پھنسائیں بلبلیں گن گن کے توڑے پھول چن چن کے — چمن میں تو نے او صیاد دیکھیں کچھ بھی چھوڑا ہے

دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست ——— ہمت میں یہ پاؤں دیکھو تو آ کر کہاں تھکے

وقت بد میں کون دیتا ہے کسی کا ساتھ [illegible] ——— یاد آ رہی ہے اک ملی دنیا میں تنہائی مجھے

گذرے جس دم ہم دنیا سے ——— ہم نے جانا دنیا گذری
بحر جہاں میں زیست ہماری ——— شکل حباب دریا گذری

خوش رہو تم وطن میں اپنے [illegible] ——— ہم ہیں اور سیر دشت غربت ہے

کرے فرقت میں کبتک صبر اوپٹ ——— یہ عاشق تیرا پیغمبر نہیں ہے

بت کریں آرزو خدائی کی ——— شان ہے تیری کبریائی کی

کئی دن سے ہے گھات میں ضیاؔ ——— عندلیب آج کل ہی پھنستی ہے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لیجائیے ——— جو گذری گئی ہم پہ گذر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز ——— ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

مرزا محمد رضا برق

محمد رضا نام، برق تخلص، "فتح الدولہ بخشی الملک" خطاب تھا۔ مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے رواج

سلطان ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ خاتم شاہان اودھ ۱۲۶۳ھ میں اپنے باپ امجد علی شاہ کی جگہ تخت نشین ہوئے۔ شروع شروع میں کام میں جی لگایا۔ اسکار چھ رسالے نادری اور حیدری دو پلٹنیں قائم کیں، خود قواعد لیتے تھے۔ ... ایک صندوق ہوتا تھا جس پر ہر شخص کو عرضیاں ڈالنے کا اختیار تھا۔ اس کا نام مشغلۂ سلطانی رکھا تھا۔

چند روز کے بعد ان سب باتوں سے جی ہٹ گیا۔ نواب علی نقی خاں کو وزیر مقرر کیا جو سسر بھی تھے اور ہمدرد بھی، خود اپنے لیے بجائے سلطان عالم کے جان عالم خطاب پسند کیا۔ وزیر کو وصی عالم بنایا اور ملک و دولت انھیں سپرد کر کے شاہزادوں کے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ قیصر باغ بنایا گیا اور اسکو صدہا حسین و جمیل و خوش گلو اور خوش خرام معشوقوں سے آباد کیا گیا۔ گویوں اور ڈھاڑیوں کو قطب الدولہ اور دیانت الدولہ اور معتمد الدولہ نہ جانے کیا کیا خطاب دیکر انھیں وزرا کا ہم رتبہ بنایا گیا۔

شعر و سخن و موسیقی میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ طبلہ بجانے اور ناچنے میں وہ کمال پیدا کیا کہ اس فن کے بڑے بڑے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔ ہر سال قیصر باغ میں ایک میلہ مقرر کیا، جس میں ہر شخص گیروے کپڑے پہن کر شریک ہو سکتا تھا۔ جان عالم جس دن گم ہوتے اور پریاں جوگنوں کا بھیس بدل کر بین بجاتی ہوئی ان کو ڈھونڈھنے نکلتی تھیں تو پیچھے پیچھے تھے اور یہ منظر لوگوں کے لئے اس قدر ... ہو جاتے تھے۔ پھر جب وہ ملتے تھے وہ جشن منایا جاتا تھا، تو اس کے شان و شکوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

قیصر باغ میں پیڑھی کوٹھی چند روز ہوئے گر گئی ہے۔ اس میں اندر کا اکھاڑہ (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

موافق تعلیم پاکر شعر و سخن کی طرف توجہ کی، شیخ امام بخش ناسخ کا زمانہ تھا، نواب معتمد الدولہ کے
استاد ہونے کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کی شاعری کا سکہ رائج تھا، انہی کے شاگرد ہو گئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۶) جیسا تھا، یہ پایاں آسمان سے اتر کر [illegible] تھا خود جان عالم [illegible]
کر بیٹھتے تھے، [illegible] گئے تھے [illegible] بھی دو شے
میں دیکھے ہے،

جان عالم جب ان مشغلوں میں محو تھے، [illegible]
لیکر وزیر تک سب ہی بادۂ غفلت سے سرشار تھے [illegible]
تعلقہ داروں کی سرکشی سے ملک تباہ [illegible] تھا، [illegible] رہی تھی، مگر کسی نے کان
تک نہیں رینگتی تھی، سلیمن صاحب اس زمانہ [illegible] تھے [illegible] نقی خاں سے کچھ برہم بھی تھے،
موقع پاکر سرکار کمپنی کے اہل کاروں کے خوب کان بھرے [illegible] گورنر جنرل تھے، پنجاب اور
ریاست کو ضبط کرکے منہ کو خون لگ چکا تھا، [illegible] بادشاہوں کی [illegible] نالائق اہلکار
نکلوا دیتے، یا خود بادشاہ کو معزول کرکے [illegible] کسی کو بادشاہ کر دیتے، انتزاع سلطنت
فرمان لکھ کر جنرل اوٹرم کے پاس ۱۲۷۲ھ میں بھیجے [illegible] دو کروڑ روپیہ سالانہ آمدنی کا ملک
جس کے کرید [illegible] ایک پھوٹی ہو، انگریزی گورنمنٹ [illegible] جناب عالیہ (واجد علی شاہ کی ماں)
بہت چیخیں چلائیں کہ واجد علی نالائق ہے تو مصطفیٰ علی ایک بھائی کو یا جنرل سکندر حشمت دوسرے بھائی کو
بٹھا دو، مگر کون سنتا ہے، بیت المال کے مشاغل کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔
۵ رجب ۱۲۷۲ھ کو بادشاہ بنفس نفیس اپیل کرنے کو با صد حسرت و یاس لندن روانہ ہوئے، مگر کلکتہ پہنچ کر
[illegible] جناب عالیہ اپنے بیٹے جنرل سکندر حشمت مرزا حامد علی خاں ولیعہد اور مولوی مسیح الدین کا کورو
سفیر شاہی کو لیکر ایک سو دس [illegible] کے ساتھ لندن روانہ ہوئیں وہ لندن پہنچی ہی تھیں (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اور چند روز کی مشق میں ان کے اکثر شاگردوں سے بہتر کہنے لگے،

تمیز شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی انگشت نما تھے، بانک پٹہ اچھی جانتے اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۳) کو ان وکٹوریہ [illegible] ایک ملاقات ہوئی پائی کہ ہندوستان میں غدر ہو گیا جس میں انگریزوں کو [illegible] خاندان [illegible] واقعہ سے ہمدردی تھی وہ بھی ان کو [illegible] غضب آلود [illegible] دیکھنے لگے اور انجام یہ ہوا کہ جان علی اور جنرل سکندر حشمت نے یورپ میں سفر آخرت اختیار کیا، باقی لوگ [illegible] بریاں چشم گریاں واپس آئے، ادھر بادشاہ کو انگریزوں نے ایام غدر میں [illegible] مصلحت ملکی فورٹ ولیم میں نظر بند کر رکھا تھا، [illegible] دس مہینے کے بعد وہاں سے چھوٹ کر نکلے اور [illegible] قبول [illegible] مٹیا برج میں کوٹھیاں اور بنگلے خرید کر کے اپنے عیش و عشرت کا سامان مہیا کر لیا، چند روز میں عالیشان عمارتیں بن کر تیار ہو گئیں اور لکھنؤ کی [illegible] اُٹھ کر مٹیا برج آپہنچی، بادشاہ نے دل بہلانے کو زندہ جانوروں کا خصوصاً [illegible] کہ شاید دنیا میں [illegible] جواب نہ ہوگا،

اس زمانے میں جس نے مٹیا برج دیکھا ہے وہ بیان کرتا ہے کہ اس [illegible] زندگی حالت [illegible] باغ ارم بنا کر راجہ اندر کا اکھاڑا کر رکھا تھا، [illegible] محلات [illegible] ملک کی وہی شان [illegible] آرائش و آسایش کے سامان کی وہی افراط [illegible] وہی کیفیت، غرض جو کسی نے وہم و گمان میں نہیں تھا وہ کر دکھایا، اور اس طرح سے [illegible] کر دی کہ گویا کوئی [illegible] تھی ہی نہ تھی،

لوگ کہتے ہیں ان میں بڑی برائیاں ہی نہ تھیں کچھ خوبیاں بھی تھیں، اور یہ کہ باوجود اس عیش و عشرت کے شراب کو کبھی منہ سے نہیں لگایا [illegible] کسی کی بہو بیٹی زبردستی چھینی، جس پری پیکر پر دل آیا اس سے نکاح یا متعہ کر کے حرام کو حلال کر لیتے تھے، [illegible] تعصب مذہبی [illegible] دیوانگی کی حد تک نہیں تھا شیعہ، سنی اور ہندو سب ان کے خوان نعمت سے متمتع رہے، بلکہ اکثر ان کے [illegible] تھے اور ان کے مذہب سے کبھی تعرض نہیں کیا جو [illegible] مذاق اتنا عمدہ تھا کہ جس جس کا نام رکھتے یا جس کو خطاب (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۵)

تلوار خوب لگاتے تھے، نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی کے زمانۂ وزارت میں امرا و وزرائے روشناس ہو چلے تھے، واجد علی شاہ کے زمانہ میں ترقی کی، ہر وقت مصاحبت میں رہتے اور بادشاہ کے کلام میں اصلاح بھی دیتے تھے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۴) [illegible] سے ان کی ذہانت نمایاں ہوتی تھی، شاعری کی حیثیت سے مجموعۂ تصنیفات کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی نصیب نہیں، چھ دیوان غزلوں کے، کئی مثنویاں عاشقانہ قصوں کی نظم اکثر آپ بیتی، ایک کتاب مباحثہ بین النفس والعقل بطرز نثر، عجوبہ، رسالۂ ایمان، مراثی اہل بیت میں، دفتر پریشان متفرق اشعار و مثنوی، ناجی کی سیاست مدن میں، لحن موسیقی میں، جوہر عروض فن عروض میں، اور خدا جانے کتنی تصنیفات ہیں جن کی تعداد چالیس سے کم نہیں۔

کلام کا رنگ وہی ہے جو اُس زمانہ میں عام تھا، جس کی ذمہ داری خود ان کے مشاغل پر عائد ہوتی ہے، آپ بیتی جو قصے مثنویوں میں لکھے ہیں، ان کو کوئی مہذب آدمی دیکھ نہیں سکتا،

لے پری زاد و تماری آگ نے پھونکا گھر | قامت سے تا قامت شور و ورنہ ہو گا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں | لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یوں تو شاہان جہاں پر بھی پڑا وقت مگر | ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

قید ہونے سے کہیں چھوٹے ریاست جانگی | لاکھ گردش آسماں کو ہو زمیں ہوتا نہیں

سخاوت کیا کروں گا دامنِ جسم عریاں سے | خزانے میں وہ موتی جمع ہیں جو بٹ نہیں سکتیں

توقع صبح ہونے کی کسے ہوتی ہے فرقت میں | وہ راتیں آہ کی ہیں اے خدا جو کٹ نہیں سکتیں

اس زمانہ کا رنگ ہی اور تھا، لفظی رعایتیں ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی تھیں، نئی نئی تشبیہوں اور پیچیدہ پیچیدہ استعاروں کا ہر شخص دلدادہ ہو رہا تھا، اور شاعری اپنے بلند مرتبہ سے گر کر انتہا چھوٹی میں پھنس گئی تھی، یہ باتیں اس زمانہ میں عیب نہیں رہی تھیں، بلکہ طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں، خود برق کی زبان سے اس کی حقیقت سنو ؎

راجہ اندر کا اکھاڑا صحبت اقدس ہی برق   نام رکھا ہے پرستاں بزم عشرت گاہ کا

ناسخ و آتش کے شاگرد سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، کوئی کم کوئی زیادہ، اس کی تفصیل دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مقدمہ پڑھو،

برق بہت پر گو شاعر تھے، ایک ضخیم دیوان عمدہ کاغذ پر نہایت خوشخط انہی کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا، اس میں غزلیں، مخمس، مسدس، ترجیع بند، رباعیاں، قطعے سبھی کچھ ہیں، ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت درد انگیز لکھا ہے، معلوم نہیں کہ پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد دوسرا دیوان بھی ان کا مرتب ہوا یا نہیں،

انتزاع سلطنت کے بعد یہ بھی بادشاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے تھے اور جب بادشاہ فورٹ ولیم میں نظر بند کیے گئے تو انھوں نے [illegible] سنہ ۱۲۷۳ھ کو فرق مبارک پر تصدق ہو گئے، اور جو کچھ کہا تھا کر دکھایا ؎

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اٹھے   جان دی آپ کے دروازہ پہ مر کر اٹھے

منتخب اشعار

اترا تو حد سے جوش جنوں [illegible] اثر کیا   [illegible] ملال کا

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہوگئی　　اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دیر میں پھونکا　　کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

ہر اک نفس عشق میں ہے زندگی خضر　　جینے کے لئے مرتے ہیں بیمار محبت

آتا نہیں قرار دل بے قرار کو　　غم میں پھنسا ہوں ہم محبت چھوڑ کر

دل مکدر ہو تو سب عیش جہاں مٹی ہے　　تو نہیں پاس تو پھر عیش چمن خاک نہیں

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو　　دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے الفت میں　　تم جو غیروں سے ملے تم کو نہ غیرت آئی

خدا غریب کی سنتا ہے غیب سے فریاد　　اثر عجیب دل درد مند رکھتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں　　جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلہ ہوتا ہے

اٹھا کے آئینہ دکھلا دیا ہے میں نے　　نہ سوجھی عارض گلگوں کی جب مثال مجھے

میر علی اوسط رشک

علی اوسط نام، رشک تخلص، میر سلیمان کے بیٹے تھے اور فیض آباد بزرگوں کا وطن تھا، لکھنؤ میں ان کا نشو و نما ہوا، پورا نام و لقب وہ الاجاہ میر علی اوسط رشک ہے، والد ان کے علوم و فنون دین میں کافی مہارت رکھتے تھے، والد سے اور دیگر علما کی صحبت فیض سے استعداد علمی حاصل کر کے شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہو گئے،

شاعری میں وہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا جو خواجہ وزیر یا ان کے اور خواجہ آتش کے حصہ میں آیا تھا، مگر زبان کی تصحیح اور لغات کی تحقیق میں یہ ناسخ کے تمام شاگردوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے،

تاریخ گوئی میں بھی ان کو خاص ملکہ تھا، بات بات پر تاریخ کہتے تھے، اور مرنے جینے کی تاریخوں کا تو انھوں نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، ادھر کسی کا دم نکلا ادھر انھوں نے تاریخ نکال لی، کوئی پیدا ہوا نال کٹنے میں دیر ہو تو ہو مگر تاریخ میں دیر نہیں لگتی تھی،

سب سے زیادہ جو چیز ان کی زندگی کا نمایاں کارنامہ ہے، وہ زبان کی اصلاح ہے، ناسخ تو استاد تھے ہی، مگر واضع ان قوانین کے رشک ہی تھے، کچھ الفاظ نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں، وہاں بروزن جاں، نہو بروزن جہاں، رہو، پر، پتہ کر کی جگہ ہونا ضروری ہے، رکھا یا تخفیف کی جگہ رکھا یا لتشدید، نمک کی جگہ نک، بھنانا، پھنانا کی جگہ بناہنا، پھنانا، اسباب کی جگہ اس بارہ میں، شعلہ و عدہ، دنیا اور صحرا کا ہم قافیہ نہ ہو، علاوہ ان کے اور بھی قاعدے بنائے ہیں جن کی پابندی ناسخ و آتش نے بھی نہیں کی، مگر انھوں نے وجوباً ان کو اختیار کیا اور مزہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اسی میں چوپٹ ہو گئی،

معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعرا اسی ضرورت سے کہتے تھے کہ جو الفاظ یا جو ترکیبیں بول چال میں لطف دیتی ہیں ان سے شعر میں بھی کام لیا جائے۔ مثلاً آپ ہی کی جگہ آپی یا اور ہی کی جگہ اوری یا ایک ہی کی جگہ ایکی یا ساتھ ہی کی جگہ ساتھی، یا ہاتھ بیکنا کی جگہ بانہہ جھکا ہونا اثر کرنا مارڈالنے کے معنوں میں، اپنی طرف دیکھو جانے دو کے معنی میں ادھر کی باتیں ادھر کرنا، لگائی بجھائی کے معنوں میں اتنے سے کے بجائے صرف اسی کام کے واسطے، جب نہ تب، اکثر وقت بے وقت، بجان یار، جان پہ کھیلنے، خاطر نشان ہونا، مطمئن ہونا، صاحبی پانا، فروغ پانے کے معنوں میں۔ غرضکہ اس طرح کے سینکڑوں الفاظ اور ترکیبیں جو بول چال میں تھیں مگر شعر و انشا میں ان سے بچاؤ کیا جاتا تھا، انھوں نے ان کو نظم کیا ... ان کو وسعت دی اور صرف نظم کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ ۱۲۳۷ھ میں اردو کا ایک لغت تالیف کرکے ملک پر احسان عظیم کیا، جس کا تاریخی نام نفائس اللغات ہے۔ اس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات شائع کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری سے قطع نظر بھی اردو ان خدمتوں کے لحاظ سے رشک کو بجا طور پر اس کا فخر حاصل ہے کہ ان کو اساتذۂ شعر کے دوش بدوش جگہ دی جائے۔

رشک آخر عمر میں کربلائے معلی چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ ان کے تین دیوان ہیں ان میں سے نظم مبارک اور نظم گرامی دو دیوان ۱۲۵۴ھ اور ۱۲۶۳ھ میں ترتیب دیکر ۱۲۷۳ھ میں خود چھپوائے تھے۔ تیسرا دیوان ضائع ہو گیا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان دونوں سے اچھا تھا۔

ان دونوں میں چھوٹی بحر کے شعر کم ہیں، اصلاح زبان کی دھن میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کی ان کو پروا نہیں تھی، نمونہ ملاحظہ ہو،

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں — وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
پرزوں میں دستخط کروں کیا حال — ایک دو تین چار تاؤ نہیں
عید بھی وصل سے چلی خالی — کچھ گلے ملنے کا لگاؤ نہیں
گنگ کو بحر غم سے کیا نسبت — یہ وہ دریا ہے جسمیں ناؤ نہیں
زہر کیا ہے ترا لعاب دہن — یہ اگر قند کا ہے تو لاؤ نہیں
اب کی جاڑے ہیں اور نہ لذوا — اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاول الماس گوشت لخت جگر — فرقت یار میں پلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہو کباب — یاد کردنی ہے نان پاؤ نہیں
ہجر میں کیوں طرح طرح ترے دیا — بار غم بھر مرا دباؤ نہیں
یہ زمین غزل وہ ہے اے رشک — جس میں زر دیکھیں بھاؤ نہیں

یہ بہت بڑی غزل ہے جس کے کچھ اشعار میں نے نقل کئے ہیں، اتفاق سے ایک قافیہ رہ گیا ہے جس کو رشک نے ہاتھ نہیں لگایا، ان کے کسی حریف نے اس کمی کو پورا کر کے خود انہی کی طرف منسوب کر دیا ہے، اور نشتر کاکوروی نے نفس اللغہ کے مقدمہ میں ناظرین کتاب کی اس سے ضیافت طبع کر دی ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے،

دو پتے تھتھڑے دکھاؤ نہیں — رشک بیٹھا ہے تن بلاؤ نہیں

یہ تو ایک دل لگی ہوئی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانے کے اہل مذاق ان کے کلام کی نسبت کیا رائے رکھتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان کی صحت و صفائی کے سامنے مضمون کی تازگی اور بلندی کا خیال نہیں رکھتے تھے مضمون خاک میں مل جائے مگر زبان صحیح اور پاکیزہ ہو، باوجود اس کے ان کے دیوانوں سے ایسے اشعار بھی انتخاب کئے جا سکتے ہیں جن سے

ان کی مشاقی اور استعداد کا پتہ چلتا ہے مثلاً

کہاں یہ لطف چیتے نے کمر پائی اگر پتلی
تمھارے ہونٹ پتلے انگلیاں پتلی کمر پتلی

تجھے تشبیہ حیوانوں سے کیوں انسان دیتے ہیں
نہ وحشت چشم آہو میں، نہ چیتے کی کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہو
بدن شفاف شانے گول قد موزوں کمر پتلی

بیشتر حصہ ان کے کلام کا لفظی رعایت اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں پھنسا ہوا ہے اور کہیں کہیں ایسے مبتذل مضامین باندھے ہیں جو پڑھنے کے قابل نہیں، بد مذاقی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جستجو اور تلاش سے بھی ایسے اشعار ان کے ہاں نہیں ملتے جن سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہو، دو چار شعر جو ملے ہیں انہی پر قناعت کرتا ہوں

اس فہم پہ حقیقتِ صانع کی فکر ہو
واقف نہیں ہم اپنی حقیقت سے آج تک

ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپی
(آپ ہی)
دل ہی میں سراغ در دلدار ملے گا

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں پھول
تصویر روئے یار کہاں کہاں نہیں

جو مشکل ہے مرنا تو مرنا کسی پر
یہ مرنا تو اے رشک مشکل نہیں ہے

مرزا اصغر علی خاں نسیم

مولد و منشاش شاہجہان آباد دہلی است [illegible] لکھنؤ را از قدوم خود رونق بخشیدہ

بسیار افادہ نشست و ابیات خوش [illegible] جوہر جہانتاب

اصغر علی خاں نام، نسیم تخلص، نواب آقا علی خاں کے چار بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پایا، حکیم مومن خاں سے مشق سخن کی، اس زمانہ میں رواج تھا اپنے مکان پر مجلس مشاعرہ ترتیب دیتے تھے، اس میں مومن خاں و دیگر شاعر دلی شریک ہو کر داد سخن دیتے تھے

پہلے اصغر تخلص کرتے تھے بعد میں نسیم اختیار کیا، جب تک دلی میں رہے، بہت فراغت اور خوشحالی سے زندگی بسر کرتے رہے، باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے نہیں بنی اور کچھ ایسی مشکل پیش آئی کہ دلی کو چھوڑنا پڑا، غدر سے کچھ دن پہلے لکھنؤ آ رہے، واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، ان کی تعریف کے قصیدے دیوان میں موجود ہیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ دربار تک رسائی ہوئی یا نہیں، اور ہوئی تو ان سے کیا سلوک ہوا،

اتنا معلوم ہے کہ نواب سالار جنگ کے خاندان کے بعض امرا ان کے شاگرد ہو گئے تھے اور وہ ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے،

غدر کے بعد منشی نولکشور مالک مطبع نے جن کا چھاپہ خانہ اس وقت تک تمام ہندوستان میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے ان کی طرف قدردانی کا ہاتھ بڑھایا، اور نقش لیلہ کو نظم کرنے کی خدمت سپرد کی، ایک جلد اس کی تمام کر پائے تھے کہ خود ان کا قصہ تمام ہو گیا، اور ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی،

مزاج میں آزادی اور وارستگی بیحد تھی، جو کچھ لکھتے تھے اس کی نقل اپنے پاس نہیں

رکھتے تھے، مرنے کے بعد ان کے شاگردوں نے بڑی محنت اور کاوش سے ان کا کلام فراہم کر کے دیوان مرتب کیا،

نسیم نے تمام اصنافِ سخن میں قدرت کامل پائی تھی خصوصاً مثنوی میں انھیں یدِ بیضا حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی سے بیان اتنا واضح ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام نہیں کھپتا،

میری نظر میں وہ اپنے معاصرینِ اہلِ دہلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنے طرزِ بیان کو محفوظ رکھتے ہوئے اہلِ لکھنؤ کی متروکات کو قبول کرنے میں پیشقدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے بھی اس کی داد دی اور یہاں رہ کر اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا،

الف لیلہ منظوم کے ساقی نامے اگر ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو میرا خیال ہے، ظہوری کا ساقی نامہ اس کے سامنے بے حقیقت ہو جائے گا، نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے،

سنبھل ساقی کہ وقت اب وہ آیا — رہوں بے ہوش پھر وہ دور آیا
مزا رکھتا نہیں بے کیف جینا — تمنا ہے کہ [illegible] مینا
ہر اک قطرہ لہو بن بن کے ٹپکے — مرے دامن سے چھن چھن چھن کے ٹپکے
طبیعت صورتِ مے جوش میں ہو — تمنا غرقِ نوشانوش میں ہے
نظر آئے کنارِ جامِ گلگوں — لبِ شاہد سے ٹپکے لطفِ مضموں
وفورِ شوق وقتِ گفتگو ہو — سخن افسانہ ریزِ آرزو ہو
گلے مل مل کے لفظوں سے معانی — دکھائیں گفتگو کی نوجوانی

طبیعت محو ہو عرفی سخن میں
فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

سیہ بڑھنے نہیں دیتی ارادہ نوجوانی کا
اشارہ ہو کے رہ جاتا ہے ہر مہربانی کا

گلے میں بخت کے اٹکا کبھی کچھ قصہ نکل آیا
ہوئی تھی ابتدا کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

جب دیکھیے قرار نہیں ایک حال پر
میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

کبھی آغوش میں رہتا کبھی رخساروں پر
کاش اے آفت جاں میں ترا آنسو ہوتا

سب میرا نہ کھلواؤ کہ تم جاؤ گے شرمندہ
دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

افسانۂ محبت کا جو تھا خوف سے پیہم
آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

اب دود جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے
وہ جوش جو برسوں مرے سینہ میں نہاں تھا

بہت مشکل ہے رہنا پاک دامن نوشباب ہو کر
سنبھل کر رہ گیا جو دور پیر میخانہ میں آیا

اشک شیدہ ہیں ہمیں کیا خانہ ویرانی کی فکر
گر پڑے جس جا وہی اپنا وطن ہو جائیگا

کیسے دیتی قفس یہ بھی لگا ہیں　　کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

نام میرا سنتے ہی شرمائیے　　تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

آنکھوں میں ساتھ ہی ساتھ تبسم فریب بھی　　تیکھا بہ خدا کہ آج تو بچھے جاتے ہیں آپ

ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغِ تیز　　یہ ارادے ایک مشتِ خاک پر

ہوتی نہیں ہے کم مری دیوانہ وحشی　　جاتا نہیں ہے سر سے خیالِ وطن ہنوز

برق نے اک طرزِ بیتابی مرا سیکھا تو کیا　　سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطرِ ناشاد میں

ہم اسیرانِ قفس کیا جانیں نکہتِ بوستاں　　مدتوں بتلائے زحمتِ صبا دیتی

شوقِ شراب خواہشِ جامِ سبو نہیں　　ہے سب حرام جب کہ پہلو میں تو نہیں

میرا ہی دست خود سببِ دشمنی ہوا　　آئیں خرابیاں دلِ خانہ خراب سے

میر مظفر علی خاں اسیر

شاعر بلند فکر، عالی پایہ، دبیر نیکو تحریر، گران مایہ، صاحب التصانیف و کثیر التلامذہ

معاصر فقیر راقم ہست، (در ۱۲ ہجری جہان تاب)

مظفر علی اسیر، میر مدد علی کے بیٹے تھے، امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی کی کتابیں اپنے والد سے، عربی صرف و نحو اپنے چچا سید علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے مشق سخن کی، گویا ان کے ایسے زمانہ کے شاگرد ہیں کہ استاد کے رنگ سے انکو کچھ مقصد نہیں ملا،

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کے زمانہ میں ملازم ہوئے، آٹھ برس تک محکمۂ صدر امانت میں رہے، امجد علی شاہ کے زمانے میں نواب امین الدولہ کا ستارۂ اقبال چمکا تو ان کی عنایت سے میر منشی ہو گئے، جب زمانہ نے ورق الٹا تو امین الدولہ سے دوستی کی یاداشت میں چند دنوں اسیر رہے،

چند دنوں کے بعد پھر تقدیر پلٹی، واجد علی شاہ نے قید و بند سے آزاد کر کے تنخواہ مقرر کر دی اور تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب عنایت کیا،

انتزاع سلطنت کے بعد وہ زمانہ یاد آیا، جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں لکھنؤ میں رہتے تھے، اپنے صاحبزادوں کی تعلیم ان کے سپرد کر دی تھی اسی سلسلہ سے رامپور پہنچے اس وقت ان کے شاگرد نواب یوسف علی خاں بر سر حکومت تھے، انھوں نے سرپرستی فرمائی، اور اپنا کلام ان کو دکھانے لگے،

یوسف علی خاں کے مرنے کے بعد ان کے لائق جانشین نواب کلب علی خاں مرحوم کی

قدر دانی سے تھوڑے دنوں فراغت سے زندگی بسر کرکے سنہ ۱۲۹۹ ہجری میں وفات پائی،

اسیر بہت پرگو اور کہنہ مشق شاعر تھے، اور تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے مگر اپنے ہمعصروں کی طرح لفظی رعایتوں کے اسیر تھے، شاگردوں میں منشی میر احمد امیر، مولوی الہی بخش نازش، منشی احمد علی شوق، اور ریاض احمد ریاض یہ اچھے شاعر ہوئے، جو درحقیقت استاد کی ناموری کے زیادہ تر باعث ہوئے، تصنیفات میں ایک دیوان فارسی کا ہے، چھ دیوان اردو کے اور کئی مثنویاں ہیں، ایک کتاب عروض میں زر کامل عیار شرح معیار الاشعار ہے، کئی رسالے عروض و قافیہ اور صرف و نحو میں ہیں،

دشمن جو سمجھتے ہو تو کیوں مجھ سے ہو غافل
دشمن سے جہاں میں کوئی غافل نہیں ہوتا

آنکھ اسکی پھری مجھ سے یہ باور نہیں آتا
کیا ضعف سے بیمار کو چکر نہیں آتا

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دم حشر
[illegible]

مسجد سے نکل کر میں رہ بتکدہ بھولا
تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا

نفع پہونچا نہ کسی کو چمن گردوں سے
گل خورشید کبھی زیب گریباں نہ ہوا
اسکے دامن سے مرے خون کا دھبہ دھوتا
تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہ ہوا

ضعف پیری بڑھ گیا زور جوانی گھٹ گیا
اب عصا بنوا لیے نخل تمنا کاٹ کر

اٹھنا انھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے — حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل

وہ دریا ہم [illegible] — [illegible] چھینٹے لگا گیا ہے ہم

احباب کی نظروں میں سبک ہو نہ تم اے امیر — [illegible] کسی کے گراں ہیں

تھا اور زیست تجربہ قدرت خدا کی ہے — انسان کے [illegible] اپنی اجل ہیں

جو حشر میں ہوئی جب تری نظر [illegible] — [illegible] چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

[illegible] — [illegible]

وہ منہ پایا [illegible] — [illegible]

مر جانے پہ کس کی چاہ [illegible] — [illegible] پانی [illegible]

[illegible]

اسد اللہ [illegible]

کے شاگرد ہوئے، لکھنؤ وطن تھا، گندم گوں [illegible] میانہ قد، صاحبِ الفاظ تحقیق [illegible]
فنِ عروض میں [illegible] اور [illegible] نشست کے [illegible] کے شاگردوں میں [illegible] درجہ رکھتے تھے
چھوٹی شہزادی کی سرکار سے کچھ وظیفہ [illegible] ڈیوڑھی پر بیٹھا [illegible] کی معیت میں [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
تو آتے [illegible] ڈیوڑھی پر بیٹھنا فخر سمجھتے تھے
[illegible] ڈیوڑھی میں بیٹھ کر شعر کہتے [illegible] [illegible]
تھیں اور آپ تھے، لوگ کہتے ہیں ایک لڑکی اور ایک لڑکا بھی تھا [illegible]
اور تنگ حالی میں بسر کرتے، نواب محبت علی خان مرحوم کو خبر ہوئی کہ لکھنؤ میں ایک [illegible]
موجود ہے، بلوا بھیجا اور عزت افزائی فرما کر [illegible] مقرر کر دی، عرصہ تک رام پور میں رہے
آخر وقت میں وطن یاد آیا، نواب کے یہاں [illegible] یہ بھی غزل لیکر پہونچے، مقطع میں [illegible]
کی جدائی کا اظہار دردناک [illegible] کیا تھا، نواب کو رحم آیا کچھ دے دلا کر رخصت [illegible]
یہ پھر اسی مسند پر آ بیٹھے، جس کے بارے میں خود فرماتے ہیں،

آباد رہے لکھنؤ کے [illegible] / [illegible] ہر کوچہ ہے عشرت کا

مزاج کی [illegible] دیوان کی ترتیب کا موقع [illegible] یا ان کے دوستوں [illegible]
[illegible] ہاتھ لگیں [illegible] غزلیں لکھ کر [illegible]
[illegible] یہ دیوان چھپ گیا ہے،
لوگ کہتے ہیں کہ [illegible] ایک [illegible] تھا [illegible] کو دیکھنے
[illegible] اس کی کیا توقع [illegible] سمجھتا [illegible] کی عمر [illegible] میں
وفات پائی،

نہ تو وہ پھول نہ کلیاں نہ وہ سبزی نہ بہار
رت کے پھرتے ہی چمن زار کا تختہ الٹا

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

کیا کیا نہ مجھ سے سرگوشی دلبروں نے کی
پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

وصل میں [illegible] تشنہ دہاں پہنچا
رہ گئی حسرت کہ رہی دل کی تمنا دل میں

ظالم ہماری آہ کی پروا نہ کر
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

مدت سے التفات مرے حال پہ نہیں
کچھ تو کمی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں
دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

جو اب دل گئی پیری میں نوجوانی کی
بہار دیکھ چکے باغ زندگانی کی

تمنا ہی سے ہیں مسرت نہیں ہوتی
جو جاتی ہیں گھڑیاں تو راحت نہیں ہوتی

شب ہجر سے پوچھے کوئی مرنے کی خوشی
جان آتی ہے بدن میں کہ قضا آتی ہے

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں   مجکو اس پھول سے خوشبوے وفا آتی ہے

کٹی برسات پھر اس سال بھی فریاد و شیون میں
خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آئے کدھر برسے

دورِ دوم

منشی امیر احمد امیر

منشی امیر احمد امیر مولوی کرم محمد مینائی کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے، نسب کا سلسلہ مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے ملتا ہے، ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہمعصر علماء سے پڑھ کر شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے، اور کچھ دنوں کی محنت اور جانکاہی میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ اُستاد سے بھی آگے بڑھ گئے،

۱۲۶۹ھ میں خوش قسمتی سے دربار شاہی تک رسائی ہو گئی، ارشاد السلطان و ہدایۃ السلطان دو کتابیں لکھ کر پیش کیں اور خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے،

غدر کے بعد ۱۲۷۴ھ میں رامپور گئے، نواب یوسف علی خاں نے قدردانی فرمائی، ۱۲۸۱ھ میں ... نواب کلب علی خاں[1] مسند نشین ہوئے، اور خوش قسمتی سے امیر کو نواب کی اُستادی

---

[1] نواب کلب علی خاں والی رامپور علم دوست اور ہنر پرور اور قدردان رئیس تھے، ۱۲۸۱ھ میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مسند نشین ہوئے، اور اپنی دانشمندی سے رامپور جیسی چھوٹی سی ریاست میں ایسے ایسے باکمال لوگوں کو جمع کر لیا، جس کی نظیر نہیں،

علماء کے گروہ میں علامہ عبد الحق خیرآبادی، مولانا عبد العلی مدرس، مولانا ارشاد حسین، سید حسن شاہ محدث، مفتی سعد اللہ اور ایسے ایسے نامور فاضل جن سے کسب کمال کرنے کو عرب و عجم سے (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

کا شرف حاصل ہوا،

یہ زمانہ منشی امیر احمد کے عروج و اقبال کا زمانہ تھا، یہ جوہر قابل اور نواب جیسا قدر شناس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۲) شائقین علوم آیا کرتے تھے۔ اطبا میں حکیم محمد ابراہیم، حکیم علی حسین، حکیم عبد العلی، دہ حکیم حسین رضا، جو اپنے زمانہ کے چیدہ اور برگزیدہ لوگ تھے۔ شعرا میں میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر، میر سمعیل حسین منیر، آفتاب الدولہ قلق، احمد حسن عروج، مرزا رحیم، نادر علی جان، منشی امیر احمد امیر، نواب مرزا خاں داغ، شیخ امیر اللہ تسلیم، حکیم ضامن علی جلال، میاں صاحب بیگم، اور پیچھو، اور دوسرے بہت سے شاعر جو اپنے زمانہ میں بہت مستند مانے جاتے تھے، یہ سب رامپور کے وظیفہ خوار تھے،

غدر کے بعد دلی اور لکھنؤ میں جو جس فن کا با کمال تھا، اسکو رامپور کے سوا کہیں ٹھکانا نہ تھا، سرکاری باورچیخانہ میں ایسے ایسے رکابدار جمع کئے تھے جن کا مثل ہندوستان میں نہ تھا۔ داستان گو ایسے ایسے قابل کہ جس وقت داستان گوئی پر آتے تو بات بات میں انعام و خلعت سے سرفراز ہوتے، چوبدار اور مرد ہے ایسے ادب و آداب اور سلیقے کے کہ دوسری جگہ کے فہمیدہ اور سنجیدہ لوگ اُن کے سامنے بات نہ کر سکتے تھے،

لطیفہ مولوی بشارت اللہ فرزند مفتی سعد اللہ مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بار نواب سر شام سوار ہوئے، جامع مسجد کے قریب سواری پہنچتے پہنچتے نماز کا وقت آگیا ہو دراتر کر مسجد میں نماز پڑھی اور پھر سوار ہوئے، چوبدار نے دیکھا کہ پیشانی پر ایک تنکا رہ گیا ہے، جب سوار ہوئے، تو اُس نے بڑھکر یہ آیت پڑھی، "وسیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" نواب نے رومال سے پیشانی صاف کر لی، اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ نواب نے گردوپیش کیسے لوگوں کو جمع کر لیا تھا،

مگر یہ بھی سنو کہ اس چھوٹی سی ریاست میں اتنے لوگوں کی گنجایش کیسے نکالی تھی، یہ جتنے لوگ تھے انکی تنخواہیں بڑی بڑی نہیں تھیں، مولنا ارشاد حسین، مولوی عبد الحق اور منشی امیر احمد کے علاوہ کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی، علاوہ اسکے جو جس کام کا اہل تھا، ویسے وہ کام بھی لیا جاتا تھا، (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

جوہری، ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۷) مگر نواب کا رکھ رکھاؤ اس غضب کا تھا کہ جو ایک دفعہ انکے دربار تک پہنچ گیا ہو وہ پھر دوبارہ سے نکلنے کا نام نہ لیتا تھا، بات یہ تھی کہ عید بقرعید، سالگرہ اور عام طور پر خوشی کے موقعوں پر لوگوں کو خلعت و انعام دیتے تھے، اور جن سے زیادہ خصوصیت تھی انکی خبرگیری خود نواب رکھتے تھے، انکو معلوم ہوتا کہ مولوی عبدالحق قرضدار ہو گئے ہیں بلا کر حال پوچھتے اور جتنا قرض ہوتا اس سے کچھ زیادہ ہی عنایت فرماتے یہ لوگ بھی داد و دہش کے خوگر ہو گئے تھے، بے ضرورت بھی قرضدار بن جاتے تھے،

حیدرآباد میں نواب مرزا خاں کی دو ہزار روپیہ ماہوار تک تنخواہ ہوئی، اور نواب فصیح الملک خطاب پایا، مگر رام پور کو مرتے دم تک نہیں بھولے، حکیم عبدالعلی مرحوم میرے اُستاد تھے، رام پور سے آنے کے بعد واجد علی شاہ نے انھیں یاد فرمایا، ان کے مرتے وقت تک کلکتہ رہے، اسکے بعد بھوپال بلائے گئے، نواب شاہجہاں بیگم جیسی فیاض اور سیر چشم فرمانروا کا زمانہ، دونوں جگہ تنخواہ المضاعف، مگر میں نے انکو دیکھا ہے کہ جس وقت نواب کلب علیخاں کا نام آجاتا، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے، اور پہروں انہی کا ذکر کرتے،

نواب کی خاص صحبتوں میں مولانا عبدالحق، مولانا عبدالعلی، مفتی سعداللہ، منشی امیر احمد، اور دیگر علما و شعرا حاضر رہتے، مناظرہ کا شوق تھا، علما میں کوئی مسئلہ چھیڑ دیتے اور مزے لیتے، شعر و سخن، الفاظ کی تحقیق اور محاوروں کی صفائی و صحت پر شعرا کی گفتگو سنتے اور خود قول فیصل بیان کرتے،

دینداری کی حیثیت سے دیکھو تو اُس میں شانِ بے مثالی تھی، نماز روزہ کے پابند، ذکر و شغل کے علاوہ زکوٰۃ باقاعدہ ادا کرتے، حج کا سفر جس دھوم دھام سے کیا ہی اسکو زمانہ جانتا ہی، دلّی سے حضرت شاہ احمد سعید کو تشریف لانے کی تکلیف دی ہو وہ خود تشریف نہیں لائے، مگر اپنے فرزند ارجمند مظہر شریعت و طریقت حضرت شاہ عبدالرشید علیہ الرحمہ کو بھیجدیا، انکے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور ان کی تشریف بری کے بعد (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نواب کی زندگی بھر رامپور میں رہے، اور مرتے دم تک رہے، نواب کی قدردانی، امیر، منیر، داغ، تسلیم، جلال، اوج، عروج اور بحر کی صحبت، شعر و سخن کے چرچے ایسی باتیں تھیں جو دارالسرور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰۴) مرتے دم تک مولانا ارشاد حسین خلف حضرت مجدد سے اذکار و اشغال کی ورزش کرتے رہے،

حکیم عبد العلی مرحوم فرماتے تھے کہ مرض الموت میں ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تم پر میرے جس قدر حقوق ہیں وہ تم جانتے ہو اور میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ تم کس قدر رغبت و محنت سے میرا علاج کر رہے ہو، مگر جب وقت آجاتا ہے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اس لئے تم سے صرف ایک کام متعلق کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ جس وقت تمکو یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب جانبر نہ ہوسکونگا، مجھے فوراً مطلع کر دو، وہ فرماتے تھے کہ میں اس بات کو سن کر سناٹے میں آگیا اور سوچنے لگا کہ میں اس فرض کو کیونکر ادا کرسکتا ہوں، نواب مجھکو فکرمند دیکھ کر سمجھ گئے، اور مجھ سے دوبارہ تاکید کی، جب وقت آیا تو میں نے بارہا قصد کیا، مگر زبان ساتھ نہ دیتی تھی، خدا جانے کیونکر ان سے کہا یا وہ خود سمجھ گئے، حکم ہوا کہ مولانا ارشاد حسین کو بلاؤ، وہ تشریف لائے تو لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور ان سے فرمایا کہ وقت آپ کی ہمت اور توجہ کا ہے، یہ کہکر دونوں مراقب ہوگئے اور اسی حالت میں روح نے جسد عنصری سے مفارقت کی، سچ ہے دنیا خود دعقبیٰ بود کے یہی معنی ہیں، ۱۳۰۵ھ کا یہ واقعہ ہے، چار دیوان ریختہ کے ان سے یادگار ہیں، کلام کا رنگ ملاحظہ ہو

مرے ہی سامنے اغیار کی ہنس ہنس کے باتیں ہوں　　مجھی سے ہو بھرا شکوہ میری بدگمانی کا

بچا ہوا تھا جو کچھ جال سے ترا فتنہ　　دلوں کے رنگ وہی گردش زمانہ ہوا

گالیاں روز تھیں پر ہم نے سنا ہی نواب　　اور کچھ شب کو ہوا آپ کا اعزاز نیا

دم پور سے ملنے نہیں دیتی تھیں،

نواب کے انتقال کے بعد زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، وہ قدر دانی، وہ صحبتیں، وہ
اطمینان و فراغت [illegible] خواب پریشاں ہو کر [illegible] اوجھل ہو گئیں چنانچہ فرماتے ہیں

[illegible] پریشاں تک

حسب [illegible] نواب مرزا داغ حیدرآباد کو [illegible] امیدواری
کی جب دربار شاہی تک رسائی ہو گئی تو روز بروز [illegible] وقت [illegible] تنخواہ مل گئی،
منشی امیر احمد کو بھی قسمت [illegible] لے گئی مگر وہاں کی خاک دامنگیر تھی

چند آدمی [illegible]

سچ یہ ہے کہ امیر و داغ اس دور آخر میں [illegible] شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے،
ایک مضمون [illegible] زبان کی شوخی اور معاملہ نگاری پر فریفتہ، امیر
کے ہاں نازک خیالی کے ساتھ [illegible] اور مزہ یہ ہے کہ اس میں

(بقیہ اشعار حاشیہ صفحہ ۴۰۵)

دیا ہے بوسہ لے پھیر لو تم جانیں — یہ دل نہیں ہے کہ لے لو گے مسکرا کر تم

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں — [illegible] نگاہ واپسیں پر سوں

کہتی ہے جس کو فتنۂ محشر تمام خلق — [illegible] تمہاری ادا نہ ہو

ادا سے [illegible] سے غمزے سے ستم کرنے سے — [illegible] دل جائے جس بہانے سے

دقت پسندی کو دو چار نہیں ہونے دیا،

اہل سخن کا اتفاق ہے کہ یہ اس فن میں استاد مسلّم الثبوت تھے، وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر و انشاء کے لئے موزوں تھی، انھوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، ان کے کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ہر جگہ وسعت و گیرائی ہے، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستگی سے لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جوڑتے ہیں، خیالات نازک اور مضامین بلند آسمان طور پر باندھتے ہیں کہ ہر بات کی نقاشی پر فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے،

ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے جو اور شاعروں میں نہیں ہے کہ جیسے جیسے یہ بوڑھے ہوتے گئے کلام میں جوانی کی امنگیں بڑھتی گئیں، پہلا دیوان ان کا مراۃ الغیب ہے جو بہت ضخیم ہے اس میں سب کچھ ہے، قصائد، دیوان ریختہ جس میں غزلیں، رباعیاں، قطعات، تاریخیں، مخمس وغیرہ ہیں،

دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق ہے جس میں مراۃ الغیب سے کم ہے مگر صحت زبان، صفائی محاورہ اور پختگی کلام میں اس سے بڑھا ہوا ہے،

تیسرا دیوان محامد خاتم النبیین ہے جو نعتیہ ہے اس لحاظ سے اچھا ہے کہ نعت کا وہ مذموم طریقہ جس میں شاعر اللہ کے ساتھ پیغمبر انبیائے کرام کی جناب میں گستاخی کا جو پہلو نکلتا ہے اس کو چھوڑ کر نعت کہی ہے، مگر افسوس ہے کہ باوجود صحت زبان و پختگی کلام کے تاثیر یا سوز و گداز کا کہیں پتہ نہیں، اصل یہ ہے کہ اس بیان کا جو سانچہ ناسخ و آتش کے زمانے میں تیار ہوا تھا اس میں جو ڈھل کر شعر بامزہ ہو ہی نہیں سکتا، اس سانچہ کو توڑ کر دوسرا سانچہ تیار کر لو تو اس کی دو مصرعی ... ہے،

اردو نثر میں خیابان ... اور ... کی جبر ... ہے ... عبارت میں جناب سالک صاحب

صلی اللہ علیہ وسلم کے مولود مسعود کا ذکر صحت و صفائی کے ساتھ کیا ہے، یہ رسالہ اس قابل ہے کہ عورتوں اور بچوں کی نصاب تعلیم میں داخل کیا جائے،

ایک تذکرہ شعرائے رام پور کا انتخاب یادگار کے نام سے بفرمائش نواب کلب علی خاں مرحوم لکھا تھا، اُس کی نسبت امیر نے ایک دوست کے خط میں لکھا ہے کہ "اس میں مجکو حالات تاریخی اور انتخابِ اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسی قلم کو دستِ کاتب میں"

ان تصنیفات کے سوا جوہر انتخاب، گوہر انتخاب، مضامین دل آشوب، واسوختہ اور قصیدوں کا مجموعہ، مثنویوں میں نور تجلی، ابرِ کرم، ایک مسدس نعتیہ جس کا نام ذکرِ شاہِ انبیا ہے چھپ چکے ہیں،

سب سے بڑی اور مفید تصنیف امیر مینائی کی امیر اللغات ہے، جو افسوس ہے کہ پوری نہ ہوئی، صرف دو جلدیں اُس کی الفِ ممدودہ و الفِ مقصورہ کی شائع ہوئی ہیں، یہ کتاب پوری ہوگئی ہوتی تو اردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا،

نمونۂ قصائد

شبِ دوشینہ جو لی خواب میں میں نے کروٹ
آئی اک حور لقا پاس الٹ کر گھونگھٹ

شعلہ رخسار، جفاکار، قیامت، آفت
شوخ، عیار، غضب، قہر، چھلاوا، نٹ کھٹ

وہ نگاہیں غضب آلود وہ مژگاں کی صفیں
لشکرِ صبر جنھیں دیکھ کے کھائے گھونگھٹ

چشم کا اسکو جو دیکھیں جمعِ نام کریں
قہر پیشِ رسِ حسن میں وہ گدراہٹ

طرفہ چہرہ کی لطافت وہ سنہری رنگت
دست افشار، طلا سے بھی سوا زرماہٹ

آپ ہی چھیڑ کرے آپ ہی پھر صد سے بڑھے
توسنِ ناز کو پوئی سے وہ پھینکے سرپٹ

مستیِ حسن سے گردوں پہ کبھی ڈالدے ہاتھ
لے چھوئے گاہ لجالو کی طرح جائے سمٹ

پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں
ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ

فتنۂ حشر کو دیکھے تو کہے زلف سے آنکھ
لا چھپٹے میں اُسے دیر نہ کر دوڑ جھپٹ

طاقِ کاکل وہ بھبکیتی ہیں کہ سر کی کوئی چوٹ
روک لے مڑ کے تو وہ جھٹک کے لگائے پالٹ

دیکھ کر ابروئے پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں
پہلواں دو ہیں کہ کشتی میں گتھے ہیں غیٹ

جلوہ گر مردمِ چشم وصفِ مژگاں سے یہ ٹھاٹ
حور بیٹھی ہے درِ خلد پہ کھولے چوپٹ

بڑھ کے گلبرگ سے بھی دو کفِ نگیں نازک
غنچے ہیں انگلیوں کی کیوں نہ بلائیں چٹ

سینۂ آئینۂ شفاف شکم چشمۂ حسن
موجِ دریائے لطافت شکمِ صاف کی بٹ

غرض اس شکل کی معشوقہ کیا جس کا بیاں
نظر آئی تو تعجب جی کو ہوئی للچاہٹ

شوقِ دل نے یہ کہا مست ہی پر سو رہی
عشق پیچے کی طرح جائے ستی میں لپٹ

ہاتھ دامن پہ پڑا تھا کہ وہ پیچھے سرکی
سر قدم تک بھی نہ پہنچا کہ گئی دور وہ ہٹ

چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی
تازیانہ سے نہیں کم وہ پڑی تیغ چوٹ

ہنس کے ظاہر میں کہا واہ ری ٹھنڈی گرمی
آپ ہی لطف و کرم آپ ہی یہ جھنجھلاہٹ

چیٹ ہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد
تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھپٹ

ہوش میں آؤ ذرا خیر ہے کیسا ہے مزاج
خفقاں سے تو طبیعت میں نہیں گھبراہٹ

میں وہ ہوں جس کی ہوس میں ہیں ہزاروں نامی
سیکڑوں مر گئے تھی جن کو مرے نام کی رٹ

ذوقِ وصلت میں ہوئے گور کنارے کتنے
شوقِ دیدار میں کتنوں کی گئی آنکھ اوٹ

پاؤں کتنوں کے گھسے مثلِ سبو سر پھوڑے
بادۂ وصل کی پائی نہ کسی نے تلچھٹ

ناطقہ خانۂ دولت ہے مرا نام صفت
میں مکیں ہوں تو مکاں جائے زر و سیم سے پٹ

ملہمِ غیب نے بھیجا تو میں آئی ترے پاس
ہو گراں تجھ کو جو آنا بھی جاؤں میں پلٹ

وصف تو کرتا ہوں جس کا میں سگی ہوں صفت — دیکھ اعضا کو ذرا پردۂ غفلت کو الٹ

رخِ انور سے اُسی کی مری آنکھوں میں ہے نور — خلق اُسکا مرے گیسو میں ہے خوشبو کی لپٹ

صفِ مژگاں سے عیاں پنجۂ پر زور کی شکل — عزم اسکا مرے شاہینِ نگہ کی ہے جھپٹ

اُسکی جو راستیِ طبع وہ ہے قد میرا — دامنِ فیض نوالہ کا دمِ زلف کی لٹ

مصحفِ رخ کو جو دیکھو تو نمایاں ہے یہی شان — کعبۂ دل کو جو دیکھو تو اُسی کی ہے چوکھٹ

کون وہ کلب علیخاں بہادر انجم جاہ — رہتے ہیں جسکو ملک عالمِ بالا کی رٹ

عالم خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل — شجرِ طور کو جس باغ کی کہئے کونپل

خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو یاں کا دیکھے — خواب ہو طالعِ خوابیدہ کا خوابِ مخمل

سامنے اُس کے کسی اور چمن کا کیا ذکر — گلشنِ خلد بھی مجھکو نظر آیا جنگل

اک شگوفہ تھا اُسی باغ کا باغِ عشرت — ایک غنچہ اُسی گلزار کا گلزارِ امل

ساغرِ عشرت کونین وہاں کے دو پھول — میوۂ مقصدِ دارین وہیں کے دو پھل

سخت حیراں ہوں کہ دیوار کو دوں کس سے مثال — کہوں آئینہ تو آئینہ میں نہیں اتنا دل

دستِ مژگاں سے سنبھالے نہیں نگہ کو آنکھیں — پھر بھی دیوار پر جب چڑھتی تھی جاتی تھی پھسل

خطِ گلزار سے ہوگی یہ یہ مصرع تحریر — نقشِ ثانی ہے یہ فردوس ہے نقشِ اول

ہے یہ تاثیرِ نمو ہاتھ جو مجرم کے کٹیں — صورتِ دستِ چنار ائیں نئے سر سے نکل

اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیضِ نمو — نکلے گر بات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل

ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہند و سوسن کے لئے — پھر کے آیا تھا وہاں چھاگلوں میں گنگا جل

نوجوانانِ چمن دھوپ میں کیا کھلاتے — چتر کھولے ہوئے پھرتے تھے ہوا پر بادل

لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم — غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل
ہو گیا لوٹ میں سامان یہ آیا جو نظر — پاؤں کس طرح سنبھلتا کہ گیا دل ہی پھسل
لے اڑی ہوش مری حیرتِ نظارۂ باغ — گیا غش مجھے بیہوش گرا سر کے بل
متحیر تھا کہ یا رب ہے یہ کیسا گلزار — غنچہ ہے تنگ دہن کس سے معما ہو یہ حل
گوشِ گل میں ہی ہوئے طرب انگیز بھری — کون سنتا ہے جو پوچھوں میں کہ کیا ہے یہ محل
قمریوں کو نہیں کوکو سے مجالِ گفتار — بلبلوں کو نہیں نغموں سے کسی شاخ پہ کل
تھا اسی فکر سے دریائے تحیر میں غرق — کہہ رہا تھا کہ زہے صنعتِ صناعِ ازل
ناگہاں طرفِ چمن میں نظر آیا اک نور — آنکھ نے دل سے کہا دیکھ کے اس کو کہ سنبھل
طرفۃ العین میں وہ روشنی آپہونچی قریب — کھل گیا دیکھتے ہی اسکو مرے دل کا کنول
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے بیچ میں اک حور لقا — کچھ حسیں گرد ہیں آگے ہے فروزاں مشعل
حور وہ حور جسے دیکھے تو فردوس سے حور — مضطرب نعرہ زناں خاک بسر آئے نکل
فرق سے تا بقدم پیکرِ انداز و ادا — غمزہ و ناز سے ڈالے دلِ عاشق کو مسل
گرمیِ حسن سے رخسار بھبھوکا ایسا — شمع کی طرح جسے دیکھ کے دل جائے پگھل
چوکڑی آہوئے مشکیں کو ختن میں بھولے — بال کھولے جو عتاب میں وہ دکھائے چھل بل
قطرے کہتے تھے پسینے کے رخِ گلگوں پر — جوش کھا گرمیِ حسن آئی ہے چہرے پہ ابل
پتلیوں کا جو ان آنکھوں کی تماشا دیکھا — دلِ ناداں مرے پہلو میں گیا اور مچل
تیر پر تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں — نیم جاں پاؤں پہ اس کے میں گرا سر کے بل
اور کی عرض کہ اے عشوہ گر جلوہ فروش — رحم کر رحم بس آگے دلِ مضطر کو نہ چھل
رخِ روشن کی طرح آئینہ تو مجھکو کیا — اپنے گیسو کی طرح کر مرے عقدوں کو بھی حل

کون سا باغ ہے یہ کون ہو تو میں ہوں کہاں — تجھ سے وحشت نہیں یہ اد ہی حیرت کا محل
متبسم ہوا پہلے تو وہ سرمایۂ ناز — پھر اک انداز سے بولا یہ دکھا کر کس بل
سر اٹھا پاؤں سے یہ بے ادبی خوب نہیں — اچھی صورت پہ گیا دیکھتے ہی خوب مچل
ہوش میں آ یہ نہیں قسم بناتا ہے باغ — ہے سراپا چمن صنعتِ خلاقِ ازل
انس کچھ آج نیا تجکو نہیں ہے مجھ سے — کھا چکا چوٹ مرے حسن کی تو روزِ ازل
نہ پری ہوں میں نہ انسان نہ حور و غلمان ہوں نہ ملک — پر لطافت میں نزاکت میں ہوں ان سے افضل
باغ نقشہ ہے صفاتِ حسنہ کا اس کے — حسن فطرت میں جو وصف ہے کہیں ہو افضل
(معاذ اللہ)
ہاتھ پھیلائے جو شاخیں زرِ گل دیتی ہیں — ہے یہ مطلب کہ دہش میں ہو وہ بے مثل و بدل
اشرفی کے جو گلوں کا ہو چمن میں انبار — یہ اشارہ ہے کہ دولت میں ہو وہ ضرب مثل
جوش رحمت کا ہے اس بحر کرم کے شمہ — اس گلستان میں جو برساتا ہے پانی بادل
دیکھتا ہے جو رواں نہر میں پانی شفاف — چشمۂ فیض یہ اس کا ہے نہیں گنگا جل
پوچھتا ہے جو حقیقت کو مری او نادان — طبعِ نازک ترے آقا کی ہوں اے عبد اقل

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو

کہاں تو اہلِ وطن کی صحبت وطن کو چھوٹے ہوئی ہے مدت — کسی کسی کی ہے یاد دل میں خیال کچھ ہے کبھی کبھی سا
قریبِ یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

لاکھوں اس لیلیٰ کے دیوانے ہیں ان میں عشق نے — اک منتخب استخوان کا نام مجنوں رکھ دیا

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا
امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ اُلٹا ہے چاکِ گریباں کا
جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوکِ قاتل
کہ دو پیاسوں میں ہر یک قطرہ تب پیکاں کا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

جب کہا میں نے شبِ غم کوئی غمخوار نہ تھا
درد نے اُٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا

ہر جگہ جوشِ محبت کا نیا عالم ہوا
آنکھ میں آنسو جگر میں داغ، دل میں غم ہوا
روکنا فرقت میں اشکوں کا نہیں اچھا امیر
چار دن کے ضبط میں دیکھو تو کیا عالم ہوا

مرغانِ باغ! تم کو مبارک ہو سیرِ گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا
ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روزِ حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم — آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا

دیکھ اے درد جدا ہو نہ دل مضطر سے — اور اچھے گا یہ بیمار جو تنہا ہوگا

خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح — دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا

آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی — اور کیا تجھ سے بھلا اے دیدۂ گریاں ہوگا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی — وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا

آنے والا جانے والا بے کسی میں کون تھا — ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا

گل ہوا غنچہ تو آواز یہ اس سے آئی — جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہو کر

ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے بولتا ہے بہت — ملے وہ اب کی تو ناصح کو سامنے کر دیں

عمر کو سارا زمانہ گذران کہتا ہے — دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں

کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں — کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں

تو نے تو اے سیاہیِ شبہائے تارِ ہجر
دھبہ لگا دیا مرے بختِ سیاہ میں

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انہیں کی زباں کے ہیں

نہ کر اے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

دنیا ہے طرفہ میکدۂ بے خودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

وصال پر ہے جو وصل امتحاں کر دیکھو
امیر یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

غیروں کے حال پر تو بہت لطف ہیں تمہیں ہم پر بھی لطف حال ہمارا ابھی غیر ہے

سجدہ میں بلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

قدم کو لغزش، زباں کو لکنت، ہے رعشہ ہاتھوں کو سر میں جنبش
کہاں گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ہے ایسا مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے

شبِ وصلت قریب آنے نہ پائے کوئی خلوت میں ادب ہم سے جدا ٹھہرے حیا تم سے جدا ٹھہرے

ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ جہاں اسی انداز سے کہہ دے کہ نہیں تھوڑی سی

چھوڑے کہیں نہ گیسوئے پُرخم نے اسکے پیچ کچھ رہ گئے تو میرے مقدر میں رہ گئے

آنکھ کہتی ہے یہ دل سے کہ کریگی برباد خواہشِ وصل تجھے حسرتِ دیدار مجھے

تھی کھٹک درد کی پہلے سے مرے دل میں مگر تم مرے پاس سے اُٹھے کہ قیامت آئی

ہیں تغافل میں بھی سرگرم ستم وہ آنکھیں — آپ تو سوتے ہیں فتنوں کو جگا رکھا ہے

قاصد یہ زبان اس کی بیاں اسکا جھوٹ — [illegible]
آفت تو ہے وہ ناز بھی انداز بھی لیکن — مرتا ہوں میں جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

نگہبان دل واماندہ اب منزل قریب آئی — [illegible]
نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل — تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

قطعہ

محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے ہیں کہ منہ کو ڈھک رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

نواب مرزا خاں داغ

شوخی کہ در کلام او ہست بندہ نہ دانم کہ [illegible] دیگرے [illegible]
بخشیدہ اند فی زماننا ہیچ کس را میسر نیست بیش از ین [illegible] گفتار [illegible] تیر نگاہ
ما قل و دل (اہ طور کلیم)

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، نواب شمس الدین خلف نواب احمد بخش خاں

دہلی کے بیٹے تھے، ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۱۲۴۶ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے، چھ سات برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ماں شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو خلف بہادر شاہ ابو ظفر کے گھر میں بیٹھ گئیں اور شوکت محل کا خطاب پایا،

یہ بھی ماں کے ساتھ لال قلعہ پہنچے، وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا زوروں پر تھا، بادشاہ اور مرزا فخرو، دونوں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے، یہ بھی استاد ذوق سے مشق سخن کرنے لگے، اور ایک عرصہ تک مشاعروں میں ان کے ساتھ جاتے اور داد سخن لیتے رہے،

سنہ ۱۲۷۲ھ میں مرزا فخرو نے وفات پائی، ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ سے نکلے، یہ مصیبت کیا کم تھی کہ سنہ ۱۲۷۳ھ میں عالم آشوب ہنگامہ غدر کا برپا ہو گیا، وہ ایک عالم مصیبت تھی، ان کو بھی وہی جھیلنا پڑی، جو سب جھیل رہے تھے،

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد رامپور چلے آئے، اور نواب یوسف علیخاں بہادر کی عنایت سے دم لینے کی مہلت ملی، نواب کے بعد اُن کے لائق جانشین نواب کلب علیخاں بہادر کی عنایت نے سرپرستی فرمائی، پھر ان کی زندگی بھر رامپور میں رہے، کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی،

نواب کلب علیخاں کے انتقال کے بعد حیدرآباد گئے، کئی برس امیدواری میں بسر ہوئی، آخرکار قسمت نے یاوری کی، پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے، اور روز ورود سے اس وقت تک کی تنخواہ مل گئی، چند روز کے بعد ایکہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا اس دن سے مرتے دم تک اعلیحضرت محبوب علیخاں آصفجاہ ششم کی مصاحبت میں زندگی بسر کی، اور

لے میر محبوب علیخاں فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک مظفر الممالک آصفجاہ ششم (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

بیش قرار صلوں کے علاوہ سپہ سالار، یار وفادار، مقرب السلطان، بلبل ہندوستان، جہان استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک کا خطاب پایا،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۸) نواب افضل الدولہ میر تہنیت علی خان آصفجاہ پنجم کے بیٹے تھے، ۶ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، ۱۴ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ میں باپ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ دستور کے موافق محل سرا اور شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے، اور آصفجاہ ششم کی حکمرانی کی منادی کی گئی، اس کے بعد مرحوم کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی، اور فاتحہ سوم کے بعد تخت نشینی کے رسوم ادا کئے گئے،

نواب شمس الامراء امیر کبیر بہادر نائب حضور، اور نواب مختار الملک سالار جنگ اول مدار المہام قرار پائے سالار جنگ اول نے جس خوش اسلوبی سے ملک و دولت کا انتظام کیا وہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا،

اعلیحضرت میں فرزانگی و دانش مندی کے آثار نمایاں، ذہن و ذکاوت خداداد تھی، مولوی محمد زمان خاں شہید مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی انوار اللہ خاں، مولوی اشرف حسین، مظفر حسین، خوشنویس مرزا نصر اللہ خاں، مسٹر کلارک، سرور جنگ، افسر جنگ اور منو خاں، علوم و فنون، شہ سواری، نشانہ بازی وغیرہ کی تعلیم پر وقتاً فوقتاً سرفراز ہوئے، اور اعلیحضرت نے تھوڑے زمانے میں بہت سی چیزوں میں دستگاہ حاصل کر لی،

۱۳۰۰ھ میں سر سالار جنگ اول نے وفات پائی، راجہ نریندر پرشاد ان کی جگہ مدار المہام ہوئے ۴ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ میں اعلیحضرت نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور لارڈ رپن ویسرائے وگورنر جنرل ہندوستان نے حیدر آباد جا کر گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے کمر میں تلوار باندھی، نواب لائق علی خاں سالار جنگ دوم نے مدار المہامی کا جائزہ حاصل کیا، اور اسی سال کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی،

اعلیحضرت میں بعض صفتیں غیر معمولی تھیں، سب سے مقدم ان کی بے نظیر فیاضی اور سیر چشمی ہے جس نے برامکہ کی فیاضی اور سخاوت کو افسانہ کر دیا، ہندوستان کا کوئی گوشہ مشکل سے (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

* نواب مرزا خاں داغ، حیرت انگیز، ظریف، خوش طبع، رنگین مزاج، زبان میں فصاحت وسادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو مجموعہ فصاحت اور محاورت کا دریا بہتا پایا ہی حسن عشق

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) [illegible] بیان ہے کہ جہاں اُن کی داد و دہش کا فیض نہ پہونچا ہو، دور دراز مقامات پر بھی خانقاہیں [illegible] اور [illegible] کے [illegible] حیات کی منت پذیر ہیں اور خاص کر دکن کے منادر اور دیول [illegible] ان کے [illegible] ہات میسر ہیں۔

دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد ارباب فن و کمال کا ملجا و ماویٰ صرف اعلیٰ حضرت کی سرکار تھی جہاں سے ہر ایک کے قدر و منزلت تنخواہیں ہو گئی تھیں، مولانا کرامت علی صاحب سیرت احمدیہ، مولینا حیدر علی صاحب منتہی الکلام، مولینا عبد العلیم فرنگی محلی، مولوی محمد حسن سہارنپوری، مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں، مولانا محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھی، وحید الزماں خاں، مولوی محمد زماں خاں، مولوی مرزا ان خاں، مولوی محمد علی خاں، مولوی مشتاق حسین، مولوی ہدایت حسین، مولوی سید علی، مولوی نظام الدین حسن، مولوی [illegible] احمد، مولوی عزیز مرزا اور خدا جانے کتنے تو ہیں جو وہاں جا کر مناصب عالیہ پر فائز ہوئے۔

مولانا عبد الحی لکھنوی، مولانا عبد الحق خیرآبادی، مولانا [illegible] الحق دہلوی، مولانا [illegible] کانپوری، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، وغیرہم بدولت تو کوئی ان کا [illegible] کر سکتا ہے، سیکڑوں ارباب کمال تھے جن کے دامن فیض سے ایک عالم تربیت پا رہا تھا اور وہ صرف اسی سرکار کی بدولت فارغ البالی گھر بیٹھے علمی خدمتیں انجام دے رہے تھے [illegible] سے [illegible]۔ ان کو گھر بیٹھے [illegible] رہتی تھی۔

دوسری غیر معمولی صفت اُن کی بے خطا نشانہ بازی تھی، شاہزادہ جرمنی اور ولیعہد روس (بعد کو شہنشاہ روس) سے جس وقت نشانہ بازی میں مقابلہ ہوا تو وہ اُن کی (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

کے معاملات [illegible] عاشق معشوق کے خیالات گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو [illegible] خود بھی مزہ لیتے ہیں

(بقیہ حاشیہ [illegible]) [illegible] جو حیرت [illegible] ہو گئے [illegible] کہ اس فن میں بھی فرزند میں اپنا مقصود [illegible] ہزار [illegible] شیر شکار کئے اور ایسے صعب و دشوار گذار مقامات میں پہنچے جہاں بڑے بڑے [illegible] کے بھی چھکے چھوٹ جاتے تھے۔

تیسری صفت ان کی جفاکشی و محنت تھی، باوجود تنعم و بادشاہی کے جب کسی کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو [illegible] ہوتا تھا کہ [illegible] اور کوئی کام پیش نظر نہیں۔ اہل کار اور مصاحب تھک کر ہو جاتے تھے اور [illegible] کام میں لگے رہتے آفتاب کتنا ہی طلوع و غروب کرتا مگر وہ اس کام سے ہاتھ نہیں کھینچتے تھے۔

چوتھی صفت [illegible] اور رعایا پروری تھی [illegible] رعایا [illegible] قدر [illegible] تھی کو [illegible] کی [illegible] باپ بیٹے کی ما[illegible]

پانچویں صفت [illegible]

چھٹی صفت [illegible]

ساتویں صفت [illegible] جس کی وجہ سے باوجود [illegible] بے آزاری کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے مگر افسوس [illegible] بعض خودغرضوں نے انکو جام و ساغر پر لگا دیا تھا جس کی وجہ سے [illegible] یہاں تک [illegible] جسمانی کمزور ہو گئی اور عمر طبعی تک پہنچنے سے پہلے انھوں نے [illegible] ۱۲۴۶ھ کو وفات پائی،

ان کو شعر و سخن کا بھی شوق تھا [illegible] بھی [illegible] نظم میں [illegible] (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حسنِ اتفاق سے زمانہ بھی ان کو اچھا ملا، شاعری کا آغاز لال قلعہ سے جو اردوے معلّیٰ کا گہوارہ تھا، اور اُن کے شباب کا زمانہ نواب کلب علی خاں مرحوم جیسے قدردان کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا، گلزارِ داغ، آفتابِ داغ دو دیوان ایک مثنوی فریادِ داغ اسی زمانے کی کمائی ہے حیدرآباد میں تیسرا دیوان مہتابِ داغ تیار ہوا، مگر اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسافر بڑی بڑی منزلیں طے کرکے تھک کر کسی مقام پر بیٹھ گیا ہے، رامپور میں اسیر، امیر، بحر، جلال اور تسلیم کا جمگھٹا تھا، خود نواب سخن گو و سخن سنج، کلام کی نوک پلک کے دیکھنے اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے میں مشاق، اس وقت طبیعت پر غیر معمولی زور ڈالنے کی ضرورت تھی، ذرا چوکے تو ٹکسال باہر، حریفوں سے دادِ سخن لینا ہنسی کھیل نہیں تھا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۱) فرماتے تھے، جو کلام اُن کی طرف منسوب ہے اُس میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں،

اے یاس تونے داغِ تمنا مٹا دیئے ۔۔۔ گلزار تھا یہ دل اُسے ویرانہ کر دیا

اپنے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں ۔۔۔ مرد جو کہتے ہیں وہ کرکے دکھا دیتے ہیں

جھگڑے تو ہزاروں ہیں مگر بات ہے اتنی ۔۔۔ ہم تم سے وفا کرکے پشیمان بہت ہیں

ہوا بھی ہم اسیروں تک نہیں آتی جو یہ پوچھیں ۔۔۔ فضائے باغ کیسی نکہتِ گلزار کیسی ہے

نہ کر کسی سے محبت یہ ہم نہ کہتے تھے ۔۔۔ دلِ فریفتہ سنتا ہے تو بھلا کس کی

برخلاف اس کے حیدر آباد عیش و عشرت کا گہوارہ، کاوشِ فکر جو شاعری کا جزوِ اعظم ہے، مفقود، وہاں جاکر طبیعت بجائے محنت کش ہونے کے عشرت پسند ہوگئی، کچھ جوانی کی امنگیں بھی رخصت ہوچکی تھیں، ان سب وجوہ سے کلام پھیکا پڑ گیا، اور آخرکار ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ میں زبان تاک بند ہوگئی، مرنے کے بعد یادگار داغ، و ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے دو مجموعے ان کے کلام کے اور شائع ہوگئے ہیں،

غزلوں کے منتخب اشعار

ستم وہ چشم کا فرسے تری چلنا اشاروں کا
غضب وہ دل پکڑ کر بیٹھ جانا بے قراروں کا

خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں آہیں
پھپھولوں سے مرے سینہ پہ عالم ہے مزاروں کا

ہو کے ظاہر تو کیا عشق نے اک حشر بپا
حسرت اس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہوگا

عشق کیا شے ہے یہ وہ شے ہے کہ دل میں تو وصل
خون ہوکر آگیا، غم بن گیا، سم ہوگیا

اک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہوگیا

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے تنگ سا
کہ میرے عشق سے بہتے تنگ ٹال دیا

نئے تو چلتے ہیں حضرتِ دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلوتہی نہ کرنا

مری تقدیر کی برگشتگی سب میں بری ٹھہری / حسینوں کے [illegible] ان ہی برگشتہ مژگاں کا
[illegible] آنکھیں فرش راہ [illegible] / کف [illegible] نہ جائے خار مژگاں کا

ڈوب کر سینہ میں اس رنگ سے پیکاں نکلا / دل سے [illegible] ارماں نکلا

[illegible] تھا ایک [illegible] کا / [illegible] مژگاں ہو گیا
[illegible] / [illegible] کا نقصان ہو گیا

وہ [illegible] / [illegible] کہ بھر آیا

[illegible] / [illegible] نہ پایا

وصل میں ہلے وہ [illegible] / [illegible] گھر آیا

[illegible] / [illegible] کچھ ملال سا

تو سید [illegible] / [illegible] ثواب سا

وعدہ یہ مرے اُن کے قیامت کی ہی ٹھہرا / اور بات ہی اتنی کہ اُدھر کل ہی ادھر آج

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ — گری ہی پڑتی ہے بیمارِ ناتواں کی طرح

اے شیخ جس کو جو نشہ کا بڑھے گا شوق — جنت کو ہیں پسند ہم کو تو پسند

عمر کیونکر نہ بسر کیجئے غافل ہو کر — کہ ملا ہے ہمیں اک قطرہ نہ دل ہو کر

بزم اغیار کا ظاہر ہے ترا آنکھوں پر — مہ یاں نگہ کی خفت مرے آنکھوں تک

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر — دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں — دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

مجھ کو تباہ چشمِ مروت نے کر دیا — مل جائے تو چراؤں کسی کی نظر کو میں

کس سے وعدہ ہے جو گھبرائے ہوئے پھرتے ہو — یہ وہ گردش ہے کہ میرے بھی مقدر میں نہیں

شمعی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں — اگر آگ لگا دوں تو داغ نام نہیں

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے — اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے
وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی رونا ہے الفت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

* * *

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم
بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

* * *

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

* * *

دنیا میں جانتا ہوں کہ جنت ملی مجھے
راحت اگر ذرا سی مصیبت میں مل گئی

* * *

ہزار بار جو مانگا کرو تو کیا حاصل
دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہے

* * *

ایک تو حسن بلا اس پہ بناوٹ آفت
گھر بگاڑیں گے ہزاروں کے سنورنے والے
خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

* * *

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

* * *

نہیں آتا تجھے گر اے آہ رسا
نکلنا سیکھ لے جانِ حزیں سے

* * *

مرگِ دشمن کی دعا مانگ کے پچھتاتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو وہ غیر کے ماتم میں رہے

وقتِ خرام نازِ دکھا دو جدا جدا　　یہ چالِ حشر کی یہ روش آسماں کی ہو

تیرے جلوہ کا تو کیا کہنا مگر　　دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے

سید ظہیر الدین ظہیرؔ

ظہیر الدین نام، ظہیرؔ تخلص، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے اور دلی کے رہنے والے تھے ان کے والد ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ کے خوشنویس اور دربار شاہی سے صلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے۔

بارہ سال کے سن میں فارسی کی درسی کتابیں اور عربی کی مختصرات پڑھنے پائے تھے کہ "قوربیگی" کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، اور پڑھنا چھوٹ گیا، چند روز کے بعد کارگزاری کے صلہ میں "راقم الدولہ" کا خطاب پایا، تنخواہ بیس روپیہ ماہوار تھی، وہی قائم رہی،

شعر و سخن سے خداداد مناسبت تھی، مکتب ہی میں کچھ شغل کرنے لگے تھے، اتفاق سے ان کے مکان کے قریب قطب الدین مشیر شاگرد شاہ نصیر نے اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا تھا، یہ بھی اس میں آنے جانے لگے، اور جب زیادہ شوق بڑھا تو شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہو گئے، اس وقت ان کا سن چودہ برس کا تھا،

غدر ۵۷ء میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا، پھر سونی پت، اور نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے، یہاں سے لکھنؤ کا قصد تھا کہ معلوم ہوا کہ وہاں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، مجبور ہو کر کچھ دن بریلی میں رہ کر رامپور چلے گئے، وہاں چار برس رہے، اس کے بعد دلی آئے اور محکمۂ جنگی میں

ملازمت مل گئی،

چھنگی میں زیادہ دنوں نہیں رہنے تھے کہ اخبار علوہ طور (بلند شہر) کی اوڈیٹری مل گئی، یہ اخبار مہاراجہ شیودان سنگھ مہاراجہ کی نگرانی سے نکلتا تھا، وہ نہایت ہنر پرور ہیں تھے، ان کو الور بلا بھیجا، چار برس الور میں رہے، علاوہ تنخواہ کے تقریبوں میں قصائد کا صلہ بھی عنایت ہوتا تھا، جس سے بہت اچھی طرح ان کی گذر اوقات ہوتی جاتی تھی، مگر بدقسمتی سے مہاراجہ کے بعض بدخواہوں نے جھوٹی سچی شکایتیں کرکے مہاراجہ کے اختیارات سلب کرا دیئے، یہ بھی مجبور ہوکر پھر دلی آئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش لے کر جے پور گئے، سفارش کا یہ اثر ہوا کہ محکمہ پولیس میں ان کو جگہ مل گئی،

کم و بیش دس برس جے پور میں رہے، مہاراجہ رام سنگھ والی جے پور کے مرنے پر ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا، چند روز پریشانی میں بسر ہوئی تھی کہ نواب محمد علی خاں رونق خلف نواب امیر خاں مرحوم نے ان کو ٹونک بلا بھیجا، جب تک رونق زندہ رہے، یہ بہت آرام سے ان کے ساتھ رہے، ان کے مرنے پر نواب ابراہیم علی خاں بہادر فرمانروائے حال نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، اس طریقہ سے پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے،

آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق پیدا ہوا، ٹونک سے رخصت لیکر حیدرآباد چلے گئے اور آٹھ مہینہ تک باریابی کی تمنا میں وہیں پڑے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹونک سے جو کچھ ان کو ملتا تھا، وہ بند ہو گیا،

حیدرآباد میں آٹھ مہینے کے بعد باریابی ہوئی اور ہر تقریب پر قصیدے بھی پیش ہوئے مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری آرزوؤں کا خاتمہ کر دیا'

بیکاری کے زمانہ میں مہاراجہ کشن پرشاد نے ایک سال بعد چالیس روپیہ ماہوار

مقرر کر دیئے تھے، راجہ بھگوان سہائے اور نواب محمد خاں وفا بھی کچھ کچھ خدمت کرتے رہتے تھے

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دیوان ان کا جس کا نام گلستانِ سخن ہے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ گیا ہے، دیوان دوم وسوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا ہے معلوم نہیں چھپایا نہیں، دیوان چہارم جس پر بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ، بہت سے قصیدے اور مسدس شامل ہیں، ان کے نواسہ کے پاس ہے،

کلام کے متعلق حسرت موہانی کی رائے سے مجھے اتفاق ہے، اس میں بجائے ذوق کے مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے، ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیت کلام کی پختگی، محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی کے ساتھ تعقید الفاظ کا عیب بھی ہے جو ظہیر کے یہاں نہیں پایا جاتا،

مومن خاں کے یہاں شاعری کا مدار خیال کی نزاکت ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے، جو ظہیر کی شاعری کا سرمایۂ ناز ہے، چنانچہ خود ظہیر نے جا بجا اس کا اعتراف کیا ہے

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر   سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

دوسری جگہ فرماتے ہیں،

کیا بنا ہی طرزِ مومن نے ظہیر   طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

جہاں کہیں نزاکت خیال اور جدت اسلوب کے ساتھ الفاظ کی رنگینی اور ترکیب کی تازگی کی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں تو مرزا تسلیم کی طرح دلپذیری کی شان ان کے کلام میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں کہیں استاد کا رنگ ہے، وہاں مرزا داغ اور ان کے کلام میں فرق کرنا دشوار ہے

غرض کہ مجموعی حیثیت سے ظہیر کی شاعری دہلی کی اصلی اور قدیم شاعری کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام میں نہیں مل سکتی،

نمونہ ملاحظہ ہو،

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا
نگاہِ شرمگیں سے ہیں نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

زمانہ گزشتہ حسرت نے کیا کچھ گل کھلائے ہیں
بہاریں گئیں ہم کچھ نہ سمجھے کس برس فصلِ خزاں کیا کیا

تصور میں وصالِ یار کے ساماں ہوئے ہیں
ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا

ترے سجدے کئے ہم نے ترے در پر نیاز کی
بڑھا جاتا ہے یاں شوقِ سجودِ آستاں کیا کیا

بہت تڑپا کیے ہم یاد کر کے حال اپنا
کہیں جو ذکرِ جانانِ بادہ خوار آیا

اک مشغلہ ٹھہری ہے تمہیں رنجشِ بیجا
اک کھیل ہوا تم کو ستانا مرے دل کا

سمجھو وہیں تصور میں کسی برق ادا کو
سرمایۂ تسکیں ہے تڑپنا مرے دل کا

اچھا ہے نہ نظر آئے نہ دیکھتا
ہر ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا

قاصد بھی کوئی ہمدرد بنا نسب تھا
آتے ہی آتے راہ میں کمبخت مر رہا

بڑھ کر عشق سے مجھے وحشت فزوں ہوئی
میں کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا

بات کیا اُن سے کروں ان کو اٹھاؤں کیونکر
بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں،

کیا بڑی شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ
جرم ناکردہ خطاوار بنے بیٹھے ہیں،

وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان تمام
ہم الگ سب سے گنہگار بنے بیٹھے ہیں،

ہے مرے گھر پہ ابھی سے تیرگی چھائی ہوئی
گو ابھی شام شب ہجراں سحر سے دور ہے

کہئے تو کہوں انجمن غیر کی روداد
کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکین ہو الٰہی کیا تماشا ہے
اٹھے ہیں ... ہر بار سو سو بار دامن سے
الجھ کر خود دامن سے مرے کیا کیا پشیماں ہیں
کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار دامن سے

مرزا قربان علی سالک

قربان علی نام، سالک تخلص، نواب مرزا عاظم بیگ کے بیٹے تھے، حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور دلی میں نشو و نما پائی، اور فارسی کی درسی کتابیں اپنے عہد کے ارباب فضل و کمال سے پڑھیں، مومن و غالب بقید حیات تھے، اس زمانہ میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا، ان کو بھی اس کا شوق ہوا، پہلے بطور خود کچھ کہتے رہے، اس کے بعد حکیم مومن خاں کی خدمت میں پہنچے، اس وقت قربان تخلص کرتے تھے، غالباً خاں صاحب کے مرنے پر مرزا غالب کے یہاں رسائی پیدا کی اور سالک تخلص اختیار کیا۔

خوش مزاجی اور شگفتہ روئی کے ساتھ خدا نے ان کو ذکاوت ایسی عنایت فرمائی تھی کہ چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے معاصرین سے بہت بڑھ گئے، اور مرزا غالب کے شاگردوں میں سب سے بہتر نظر آنے لگے،

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامہ کے بعد الور میں جا کر نیابانی اور خوش قسمتی سے وکالت کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، ایک عرصہ تک وہاں رہنے کے بعد اپنا مسقط الراس یاد آیا،

اور حیدرآباد چلے گئے، وہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتۂ درسی کے عہدے پر تقرر ہو گیا، اسی خدمت میں زندگی بسر کر دی،

حیدرآباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک موقت الشیوع رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکالا جو اس زمانہ میں ناظم سررشتۂ تعلیم تھے، یہ رسالہ عرصہ تک جاری رہا اور اس میں بہت بیش بہا اور مفید مضامین نکالے گئے۔

ساٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۲۹ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، اور حیدرآباد میں مدفون ہوئے، بہار سخن ایک دیوان کا نام ہے،

یوں عمر گذاری ہے تری فرقت میں کہ ہر دم   جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

دل وہ کم ظرف ہے کہ تجھ کو نہ رہا چین کہیں   بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا

نہیں ہے اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں   پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

میرا ہوا آشیانہ اور آدھا جلا ہوا   بجھ بھی گئی تھی آگ تو بجلی کو کیا ہوا

تم غیر کے ہوئے تو رہا کیا جہان میں   گویا ہمارے واسطے کچھ بھی بنا نہ تھا

کچھ ہو پر ان کو جانب اغیار دیکھنا   اک بار منع کیجے تو سو بار دیکھنا

گرے ہیں چشمِ خلائق سے خاک ہو کر ہم ۔۔۔ ستم سے تم نے کیا کس طرح جہاں اپنا

[illegible] ستم کشی کا مجھے امتحان ہے اب ۔۔۔ درکار ایک اور نیا آسمان ہے اب

ابتک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں تو ۔۔۔ سنا ہے بات کا حال رات کو ایسا سنا کہ بس

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا ۔۔۔ میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

کاش اے میر تجھ سے بھی کہتے تو سہل تھا ۔۔۔ خواہش یہ کہ کہتے ہیں اُس بے وفا سے ہم

تم آ گئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون ۔۔۔ آج اپنے اپنے گھر ہی میں کچھ میہماں سے ہم

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب ۔۔۔ تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

اعتبارِ نگہِ ناز ہے کیا کیا اون کو ۔۔۔ قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

اے خضر اتنے دن ترے کیونکر بسر ہوئے ۔۔۔ ہم سے تو رات کٹ نہ سکی انتظار کی

ہوں وہ خود رفتہ کہ کب جانے کہاں دل کھویا ۔۔۔ یاد آتا ہے تو اتنا کہ نہیں یاد مجھے

جانے دے اے تصور جاناں نہ کر تلاش — ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

کچھ [illegible] بھی وہی اضطراب ہے — دل ہے کہ اک فرشتۂ قہر و عذاب ہے
پہنچے [illegible] کے گھر تک تو دامن جھٹک دیا — ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو مٹی خراب ہے

[illegible] — مجھ کو [illegible] کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

میر مہدی مجروح

میر مہدی [illegible] میر حسین [illegible] دلی کے رہنے والے اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے [illegible] تھے، وہ زمانہ انہوں نے بہت دیکھا تھا، جب کہ میر نظام الدین ممنون، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، شیخ ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں جیسے ارباب فضل و کمال بقید حیات تھے اور ان [illegible] مشاعروں میں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں تھے،

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ بھی خانماں آوارہ ہو کر مدتوں پانی پت میں رہے، جب دلی میں امن و امان قائم ہو گیا تو واپس آئے مگر وہاں کیا دھرا تھا، ناچار گھر سے نکلے اور کچھ دنوں مہاراجہ شیودان سنگھ رئیس الور کی قدردانی سے الور میں رہے تھے کہ وہاں بھی بدقسمتی نے رہنے نہ دیا، آخر زمانہ میں قسمت نے یاوری کی اور نواب حامد علی خاں رئیس رامپور کی عنایت و مہربانی سے زندگی [illegible] کسی قدر راحت سے بسر ہوئی،

۱۳۰۶ھ میں ایک دیوان [illegible] مظہر معانی کے نام سے چھپوایا ہے جس میں قصائد

غزلیں، رباعیاں، مخمس، ترکیب بند وغیرہ اصناف سخن موجود ہیں،

مجروح کی زبان نہایت صاف اور سادہ ہے، چھوٹی چھوٹی بحروں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں جن میں محاوروں کی چاشنی زیادہ پائی جاتی ہے۔ مگر اسالیب کلام میں جدت و تازگی نہیں ہے انہی مضمونوں کو جنھیں متوسط طبقے کے شعرا نے اپنی مخصوص زبان و طریقۂ بیان میں ادا کیا ہے، یہ بھی کام میں لائے ہیں، مگر بعض جگہ نزاکت خیال کی دلفریبی نہیں سکی معمولی بات چیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے [illegible] اور سادگی کے ساتھ کلام میں تغزل کے لوازم اچھی طرح پائے جاتے ہیں،

عود ہندی میں مرزا غالب کے ان کے نام بہت سے خطوط ہیں [illegible] ہیں، ان کے ایک ایک فقرے سے پیار و محبت کی [illegible]

[illegible]

[illegible] مجبور [illegible]

[illegible] میری دوات [illegible]

وہ لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا، [illegible] ...

سخت مضطر دل ہنگامہ طلب ہے یارو ۔۔۔ آج ہی کیوں نہ وہ ہو جائے جو فردا ہوگا

کبھی چشم خمار آلود کی مستی نہیں دیکھی ۔۔۔ بجا ہے حضرت ناصح کو دعویٰ ہوشیاری کا

ساقی کی چشم مست کا گر دور ہے یہی ۔۔۔ زاہد کو آج کل ہی میں میخوار دیکھنا

یہ کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا — میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

پوچھا جو محفل میں مجروح نہ کچھ بولا — وہ حال اگر کہتا تو کس سے سنا جاتا

نہ سوجھتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے — نہ مہربان ہے قسمت نہ مہرباں صیاد

اس جہاں میں نہیں جز رنج مآلِ شادی — گرتے ہیں خاک میں گل شاخ پہ خنداں ہو کر

ہوائے گل ہے اب نے شوقِ پرواز — بہت تھے سارے بکھرے بال و پر تک

کوئی محبت دل اٹکے اٹکا ہی کیا — کھٹک سی ہے کچھ چشم پُر آب میں

کسی نے لوٹ کر بجلی کو شاید بھر دیا دل میں — نئے ڈھب کی تڑپ ہے کچھ ہماری جانِ مضطر میں

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق — خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں

جو درد دل کی ہے لذت وہ دل ہی جانتا ہے — یہ دل لگی کی ہیں باتیں کہ بیقرار ہوں میں

اب ہم ہیں اور کنجِ قفس کی صعوبتیں — وہ نغمہ سنجیاں وہ نشاطِ چمن کہاں

دل ہی سمجھے ہے کچھ تڑپ کر مرے   برق کو لطفِ اضطراب کہاں

یہ بھی کچھ جی میں آ گئی ہو گی   کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں
طور جس آگ نے جلایا تھا   ہم وہ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں

ملتی ہے اُس کی وضع نہ بس غنچے یار میں   آئے نہ کیوں مزہ ستم روزگار میں
سوزِ دروں نے مجھکو کیا نخلِ آتشیں   شعلے بھرے ہوئے ہیں مرے برگ و بار میں
کب دیکھیں چاک جیب سے فرصت ہے آہ میں   دستِ جنوں کا دھیان ہی ایک ایک تار میں
گل سے تو لاکھ مرتبہ بہتر ہے روئے یار   بلبل یہ کیا ہے میں تو یہ کہہ دوں ہزار میں

مرے کس کام کا ہے بخت خفتہ   ہے شوخی میں دو نگاہ پاسباں کو

تھا برا ہجر و صل پر اتنا نہیں   جس کے مرنے کی مبارکباد ہو

رہتے شکوہ سنجِ ستم ہم سدا   کبھی آسماں نے کبھی یار کے

واں ستم تک دریغ ہے ہم سے   یاں تو قصے ہیں عنایت کے
دل کو کوئی بچا سکے کیونکر   اس کے انداز ہیں قیامت کے

کچھ ان بن ہو چلی ہے باغباں سے   بس اب نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

مشکل ہے وصل میں بھی تلافی فراق کی   پہلو میں گر یہی دلِ حسرت مآب ہے

سوزِ غم سے نہ دل بچے جب تک   سوزشِ عشق کا مزا کیا ہے

صبر کے فائدے بہت ہیں لے   دل ہی بس میں نہ ہو تو کیا کیجیے

کوئی ہمنوا ہے نہ یادِ آشیاں   جو چھوٹے بھی ہم تو کدھر جائیں گے
یہ اہلِ عدم اور ہم میں ہے فرق   گئے وہ تو ہم ٹھہر کر جائیں گے

عاشق نہ سمجھتے تو وہ منھ کو نہ چھپاتے   کھویا دلِ بیتاب نے وہ لطفِ نظر بھی

ہم لوگوں میں ہو ربط نہ باہم تو عجب کیا   جب گرم نہ صحبت رہی موسیٰ و خضر کی

جز غمِ مرگِ دوستاں اے خضر   کیا دھرا عمرِ جاودانی میں

حکیم ضامن علی جلال

ضامن علی نام، جلال تخلص، حکیم اصغر علی داستان گو کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے

تھے ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، غدر سے پہلے لکھنؤ کچھ اور ہی لکھنؤ تھا عیش و نشاط کی گرم بازاری کے ساتھ ہر علم و فن کے ارباب فضل و کمال کا بے نظیر مجمع تھا جن کے فیضانِ صحبت سے یہاں کا معمولی سے معمولی آدمی بھی دوسری جگہ کے قابل اور لائق لوگوں سے تقریر کی روانی اور شستگی میں بہتر نظر آتا تھا اُس کی باتیں سن کر کبھی اس کا گمان نہ ہو سکتا تھا کہ اُس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں۔

جلال اُنسی زمانہ کے آدمی تھے لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی کی درسی کتابیں اُس زمانے کے رواج کے موافق پوری پڑھیں، عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے ہی تھے کہ شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، امیر علی خاں ہلال[1] کے پاس آنے جانے اور اپنا کلام دکھانے لگے، ایک عرصہ تک انہی سے مشقِ سخن کی چونکہ ان میں قابلیت اور مناسبت فطری موجود تھی، چند ہی روز میں اُس نے اپنا رنگ دکھایا، جب ہلال نے ان کے کلام اور اپنی اصلاح کا اندازہ کر لیا تو خود انھیں اپنے استاد میر علی اوسط رشک کے پاس لے گئے، یہ کچھ عرصہ تک اُن سے مشقِ سخن کرتے رہے، جب وہ کربلائے معلّیٰ چلے گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے، اور کثرتِ مشق سے کلام میں رنگ پیدا ہو گیا

۱؎ امیر علی خاں ہلال پسر تراب علیخاں باشندہ لکھنؤ میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے، غزلوں کا دیوان معنی و مروت، مثنوی اور سراپا ان کی تصنیفات میں بیان کیا جاتا ہے، واجد علی شاہ کی سرکار میں ان کا توسّل تھا، انہی کے ساتھ کلکتہ گئے، نمونہ کلام کا یہ ہے،

مجھ سے الگ جو دفن یہ ہوتا تو خوب تھا ۔۔۔ پہلو میں میری قبر کے بنتا مزارِ دل

بڑھ بڑھ کے کیا ہی وار لگانے میں جی میں ہے ۔۔۔ ہاتھوں کے بدلے چوم لوں اُس تیغ زن کے پاؤں

یہ ہاتھا پائی بھی کہیں دیکھی سنی نہیں ۔۔۔ لاتوں کے ساتھ آپ کی چلتی ہیں کہنیاں

غدر ۵۷ء کے بعد رامپور چلے گئے، اُس وقت ان کا سن بائیس برس کا تھا، ان کے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کی سرکار میں داستان گوئی کی خدمت میں مقرر تھے، یہ بھی اِسی سرکار میں نوکر ہو گئے، یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی قدردانی فرمائی، چالیس کو سو روپیہ ماہوار ملتا تھا، چند مرتبہ مستعفی ہو کر چلے آئے، مگر قدردان نواب ایام معزولی کی بھی تنخواہ ادا کی اور ان کو ہر مرتبہ بلوا بھیجا۔

منگرول کے نواب حسین میاں ان کو پچیس روپیہ ماہوار بھیجتے، اور ہر قصیدہ پر سو روپے دیتے تھے، علاوہ ان کے اور لوگ بھی ان کی خدمت کرتے تھے، ان کا یہ بھی دستور تھا کہ بغیر مالی منفعت کے کسی کے کلام میں اصلاح نہ دیتے تھے، اور کسی خط کا جواب نہ دیتے جب تک اُس میں جواب کے لئے ٹکٹ نہ رکھا ہو،

ان کو اپنی زباندانی کا بڑا دعویٰ تھا، اور اس بات پر ناز تھا کہ وہ محاورے کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں، اس بارہ میں وہ کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے،

مگر باوجود دماغ اور نازک مزاج ہونے کے اہلِ کمال سے بتواضع پیش آتے اور اپنی فروگذاشت کو جلد تسلیم کر لیتے،

نواب کلب علی خاں مرحوم کے بعد لکھنؤ چلے آئے تھے اور منصور نگر میں ایک مکان خرید کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی،

سرمایۂ زبان اردو کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، جس میں محاورے، کنایے اور اصطلاحیں زبان اردو کی بیان کی ہیں، مفید الشعرا ایک رسالہ تذکیر و تانیث کی بحث میں ہے، قواعد المنتخب ایک اور رسالہ ہے جس میں بعض مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق و تصریف بیان کی ہے،

علاوہ ان کتابوں کے چار دیوان ہیں، بعضے مبسوط، بعضے مختصر، چہتر برس کی عمر پائی

اور ۱۳۲۵ھ میں جہاں سے تھے وہاں چلے گئے۔

خبر کیا تھی کہ خاموشی ہی رازِ عشق کھولے گی | وہی غماز ہوگا جو ہمارا رازداں ہوگا

جفا کرتے ہیں کب تک باوفاؤں پر وہ دیکھیں | ہمیں جو آزماتے تھے اب اُن کا امتحاں ہوگا

جی خوب بہلتا ہے بھلا ہو کہ بُرا ہو | سن لیتے ہیں ناصح سے کچھ افسانہ کسی کا

دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے | کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیکار نہ تھا

گناہِ عاشقی خواہانِ تعزیر پے ہوتا ہے | بنا دیتا ہے شعرِ نیک دار خود منصور ہو جانا

طاقت نے سنبھالا نہ تحمل نے دمِ ہجر | سب دعویٰ ہی کرتے تھے کوئی کام نہ آیا

پائی راحت ترے خنجر ہی کے نیچے قاتل | پھر جو ٹھہرا تو یہیں کچھ دلِ بسمل ٹھہرا

اُٹھے جو بزمِ یار سے تنہا ہم آئے گھر | طاقت کہیں حواس کہیں دل کہیں رہا

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغِ چمن | شگوفے دیکھیں انہیں کیا نہال کرتے ہیں

ترا دامن دبا لیتا تو زانو سمجھتے ہیں | ابھی کوئی نہ اُٹھے ہم بھی یہ پہلو سمجھتے ہیں

نقش قدم پکارتے ہیں راہ عشق میں،
مٹ جائے حوصلے جسے نام نشاں کے ہیں

اندازہ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا
کم حوصلہ ہمیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں

ادا و ناز پر یوں جان دیتے ہیں ترا دیگا
ذرا جینے تو دینے کسی مرجانے والے کو

جگر کا درد کھویا اور نہ کی دل کی تڑپ اُس نے
تمہیں سے پوچھتے ہیں کس مرض کی پھر دوا تم ہو

آنسو کے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق
حسرت ٹپک پڑیگی ہماری نگاہ سے

کوئی دامن جنوں میں کھینچتا ہے آستیں کوئی
اتارے لیتے ہیں خار بیاباں پیرہن اپنا

کیا تھی کسی کی ترچھی نظر کچھ نہ پوچھئے
اک تیر تھا کلیجے کے جو پار ہی رہا

رہتا ہے کلیجے میں نہاں دردِ محبت
یہ چوٹ وہ ہے جس کو ابھرنا نہیں آتا

نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا میں نے
چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے
نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

ایک سی شوخی خدا نے دی ہو حسن و عشق کو　　فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہو یہ دل میں ہو

لو بند کئے بیٹھے ہیں ہم دیدۂ مشتاق　　اب دیکھیں کہ آ جاتے ہو تم دل میں کدھر سے

خوبرویوں کے بگڑنے میں ہیں لاکھ بناؤ　　کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہو

سی لیں گے گریباں کو ہم یہ تو بتا دو　　کس طرح رفو اس میں ہو دل تم سے جو پھٹ جائے

شیخ امیر اللہ تسلیم

احمد حسین نام تھا، مگر امیر اللہ کے نام سے مشہور ہیں، مولوی عبد الصمد انصاری کے بیٹے تھے، نواحِ فیض آباد میں منگلسی ایک گاؤں تھا وہاں ۱۲۳۴ھ میں پیدا ہوئے والد ان کے پلٹن میں ملازم تھے، اس تقریب سے لکھنؤ میں نشو و نما پائی، باپ اور بڑے بھائی عبد اللطیف سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں، اور خطاطی میں کمال پیدا کیا،

شعر و سخن سے مناسبت خدا داد تھی لکھنؤ میں صحبت بھی ایسے لوگوں کی میسر ہوئی جو شعر و سخن سے مذاق رکھتے تھے، اس لئے وہ رنگ چمک گیا، جب مرزا اصغر علی خاں نسیم لکھنؤ آ گئے تو اس میں برگ و بار پیدا ہو گئے، ان سے مشقِ سخن کرنے کے بعد اپنی راہ اہلِ لکھنؤ سے الگ نکال لی،

ان کے والد پلٹن میں کسی عہدے پر مقرر تھے جس کی تنخواہ تیس روپیہ ماہوار ان کو ملتی تھی، جب وہ کبرسنی کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے تو انھوں نے محمد علی شاہ کے زمانے

انہیں ان کی جگہ پر کر دیا۔ یہ مدت تک کام کرتے رہے۔ اور مشق سخن بھی جاری رہی۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں مسٹر سلیمن ریذیڈنٹ لکھنؤ کی کسی شکایت پر ان کی پلٹن توڑ دی گئی۔ یہ بیکار ہو گئے۔ تین برس کوششیں کیں مگر بے سود۔

اس زمانے میں شاعری زوروں پر تھی۔ ایک منظوم عرضداشت اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھ کر معتمد الدولہ مرزا احمد علی خاں نبولن کی وساطت سے پیش کی۔ وقت آگیا تھا، بادشاہ کی نظر جو پڑ گئی تو نظم میں حکم لکھوایا۔

خوشنویسی و نیز خوش گو　　ہر دو فن می کنی و ہر دو نکو

نام تو مندرج بدفتر شد　　بست و دو روپیہ مقرر شد

اُس دن سے ان کو بائیس روپیہ ماہوار پھر ملنے لگے۔ ایام غدر میں جب لکھنؤ میں لڑائی ہو گئی تو پھر کسی پلٹن میں آکر وہی عہدہ پر مقرر ہو گئے جو شاہی زمانے میں تھا۔ نو مہینے تک جنگ کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ جب تمام ہو گیا تو رامپور چلے گئے اور عرصہ تک وہاں رہے۔

جب لکھنؤ میں پھر انگریزوں کا تسلط ہوا اور راستے محفوظ ہو گئے تو رامپور سے چلے آئے۔ نواب محمد تقی خاں نے دس روپیہ ماہوار کر دیئے اور اپنا کلام اصلاح کے لئے انکو دینے لگے۔ اور منشی نولکشور نے اپنے چھاپہ خانہ میں بیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔

نواب کی زندگی تک تیس روپیہ ماہوار ان کو ملتے رہے۔ ان کے مرنے پر بیس روپیہ رہ گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم مسند نشین رامپور ہوئے اور ان کی قدردانی سے ہر طرف سے نامی گرامی شاعر وہاں رامپور پہنچ کر خلعت ملازمت حاصل کیا۔ تسلیم بھی بیس روپیہ پر لکھنؤ میں پڑے ہوئے تھے۔

نواب کو خود یاد آیا۔ اُن کو بلا کر تیس روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی۔ مگر اس تیس روپیہ میں

ان کی بسر اوقات کیا ہوتی [illegible] قصیدے پیش کرتے [illegible] ہر موقع پر دو سو روپیہ ان کو ملا کرتا، اس پر بھی یہ قرض [illegible] مہم کو خبر ہوتی تو وہ [illegible] کرتے [illegible] کہ کتنا قرض ہے، یہ جو کچھ [illegible] سے دونا چوگنا ان کو [illegible] ادا کیا ہوتی کہ [illegible] مگر نواب کی فیاضی [illegible] تھا، اچھا ہوا [illegible] تھا،

نواب کی زندگی [illegible] نواب کے مرنے کے بعد [illegible] ہوئی اور [illegible] تیس کے دس پندرہ روپیہ [illegible] نواب کا کام وابستہ ہوئے [illegible] روپیہ ماہوار [illegible] خرچ [illegible] ان کو [illegible]

جب [illegible] کی حالت [illegible] اور حال پوچھا [illegible] نہیں چلا سکتے [illegible] کے [illegible] تیس روپیہ [illegible] ماہوار [illegible]

اس طرح [illegible] فراغت [illegible] آنکھوں [illegible] کی نعمتوں سے محروم ہوگئے تھے [illegible] وفات پائی،

غدر سے پہلے ایک دیوان تیار ہوگیا تھا، وہ غدر کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا، دوسرا دیوان غدر کے بعد مرتب کیا [illegible] غدر سے پہلے کے شامل ہیں، یہ دیوان نظم ارجمند کے نام سے چند قصیدوں اور [illegible] کے ساتھ لکھنؤ میں شائع ہوگیا ہے، اور [illegible] کاپی خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ رامپور میں تیسرا دیوان تیار ہوا جو نظم [illegible] کے نام سے چھپا ہے، اس کے بعد چوتھا دیوان [illegible] کے نام سے شائع ہوا [illegible] دیوان کے متفرق اشعار ان کے رامپور کی

شاگردوں کے پاس ہیں جن کے شائع ہونے کی توقع نہیں،

مثنویوں میں نالۂ تسلیم اور شامِ غریباں پہلے دیوان کے ساتھ شائع ہوئی ہیں اُس کے بعد صبحِ خنداں، دل و جان، نغمۂ بلبل، شوکتِ شاہجہانی، گوہرِ انتخاب اور تاریخ بدیعی یعنی تاریخ رامپور وقتاً فوقتاً لکھیں اور شائع ہوئیں، سفرنامۂ نواب رامپور جس میں پچیس ہزار شعر سے کم نہ ہوں گے، رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی موجود ہے،

تسلیم کو اصنافِ سخن میں جو قدرت مثنویوں پر حاصل تھی وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کو حاصل نہ تھی، اخیر زمانے کی مثنویاں جو اُن کی کمزوری اور بدحواسی کے زمانے کی تصنیف ہیں، دیگر اساتذہ کی بہترین مثنویوں کے برابر بلکہ ان سے بہتر کہی جا سکتی ہیں،

قصیدوں میں بھی ان کا رنگ خاص ہے مضمون کی بلندی اور بلاغت کو الفاظ کی رنگینی اور فصاحت کے ساتھ ایسا نمایاں کرتے ہیں کہ اکثر موقعوں پر قصیدہ میں غزل کا رنگ جھلکنے لگتا ہے،

تغزل میں نظمِ ارجمند کی غزلیں اپنی خصوصیتوں اور گوناگوں صنعتوں کے لحاظ سے اُن کی عمر کا بہترین سرمایہ ہیں، اس کے بعد کلام میں کمزوری کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں، عام جوہر ان کے کلام کا پختگیِ کلام، رنگینیِ الفاظ اور دلپذیریِ مضامین ہے جس سے بے ہمتائی کی شان اُس میں کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے،

قصیدوں کا نمونہ ملاحظہ ہو،

نغمہ سنجی کے نہ قابل نہ سزاوارِ فغاں — بلبلِ تصویر ہوں رکھتا نہیں گویا زباں

ہر طرح پوشیدگی حاصل ہے مجھکو عیب سے — سینہ میں مانند دل ہوں ہوں میں ہوں شکلِ گماں

بوئے گل ہوں گل کو بھی صحبت مری ہو ناگوار — ہوں سبک روحی سے اپنی طبعِ نازک پر گراں

میں پستی میں خیالِ سربلندی ہے وہی   ہوں ترقی آشنا مثلِ غبارِ ناتواں
ہوشیار اے خامۂ بیہودہ پیما ہوشیار   تا کجا وقفِ زبان آئین و رسمِ شاعراں
مطلعِ مضمونِ عالی یاد آیا ہے مجھے ،   جس سے پیدا ہے عروجِ التماسِ قدسیاں

اوج دکھلاتا ہے حسنِ پست فطرت ہر زماں   بوسۂ روے زمیں لیتا ہے کیا کیا آسماں
جوشِ مستی میں جوانانِ چمن کے سامنے   چلتی ہے بادِ صبا کرتی ہوئی اٹکھیلیاں
منبرِ ہر شاخ پر پڑھتی ہے بیٹھی عندلیب   خطبہاے مدحتِ واجد علی شاہِ جہاں
جس کی ادنیٰ ریزشِ زر کی بدولت دہر میں   مختصر ہے طولِ دامانِ زمین و آسماں

ٹپکے ہیں دیدۂ بے خواب سے کیا کیا گوہر   دیکھتے دیکھتے مٹ مٹ گئے کیا کیا گوہر
بے ثباتی کو مری دیکھ کے آنسو کی طرح   خود بخود ٹوٹ گیا ہاتھ جو آیا گوہر
تھا وہ غم دوست کہ صناعِ ازل کے آگے   اشک ہوتا ہیں بگڑ کر جو بناتا گوہر
دیتے ہیں اہلِ صفا اہلِ صفا کو قوت   ضعفِ دل کے لیے لکھتے ہیں اطبا گوہر
کس طرف جوش میں جاتا ہے کدھر اے تسلیم   تا کجا تارِ پریشاں میں پروتا گوہر
عذرِ شوریدہ سری ہے جو تجھے سن مجھ سے   مطلعِ صاف کہ ہر نقطہ ہو جس کا گوہر

غور سے دیکھ ذرا ہمدمِ والا گوہر   آبرو میں درِ مضموں ہیں سوایا گوہر
یہ دل و جاں ہے دل و جانِ صفا طینت کا   آبلہ ہے جگرِ چاکِ صدف کا گوہر
اس سے ہے حشر تلک زینتِ نامِ ممدوح   چند دم ہے سببِ رونقِ دنیا گوہر

گر تامل ہے تو ہیں منصب دوراں کے حضور — نہ رہے تنگ سخن اچھا ہے کہ اچھا گوہر

یوں ہی چاہت جو رہا حوصلۂ صرف و کرم — عالم بحر میں [illegible] گا عنقا گوہر
پرتو عارض [illegible] جو دکھائے اعجاز — دم [illegible] دیدۂ بینا گوہر
منقش [illegible] جب [illegible] عالم ایسا — [illegible] کو زیبا گوہر
[illegible] کو [illegible] منظور ہوا
دل میں [illegible] — [illegible] مرے تشنہ بیاباں کا

وہ [illegible] — [illegible] خالی [illegible] دکا

[illegible] — [illegible] نہیں ہو [illegible] بدل جاؤنگا

اللہ رے اضطراب [illegible] — [illegible] نگاہ میں سو بار دیکھنا

[illegible] خفا ہے [illegible] دشمن — [illegible] کوئی نظر نہیں آتا
[illegible] نرگس مست یار [illegible] — [illegible] نظر نہیں آتا

نالہ کھینچا ہے دل میں جو خدا شوق [illegible] — [illegible] کہ [illegible] بدل گیا

آبرو گر چاہتا ہے کنجِ خلوت کر قبول
قطرۂ نیساں صدف میں آ کے گوہر ہو گیا

محبت میں یہ بے رحمی کہ جلنا ہو گیا مشکل
خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا

تنگیِ کنجِ قفس، رنجِ اسیری، داغِ گل
اتنے سامانِ ستم اور ایک جانِ عندلیب

راحتِ طفلی، جوانی، غفلتِ پیری و مرگ
جیتے مرتے ہم نے دو آنکھوں سے دیکھے چار خواب

خشک گل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اداس
جی بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

پروازِ اولیں میں اسیری ہوئی نصیب
گویا قفس میں تھے جو اٹھے آشیاں سے ہم

چاہیے سب کچھ مگر اے دوست آتی ہے شرم
ان نصیبوں میں کسی شے کی تمنا کیا کروں

مانا کہ حسنِ یار سے لبریز ہے جہاں
لیکن وہ حوصلۂ شکیبِ نظر کہاں

غیر کیا دوست بھی ہوتا نہیں مشکل میں شریک
پھر گئیں وقتِ اجل دیکھ کے بیدم آنکھیں

وہ برق میں شوخی وہ لگاوٹ تھی ہوا میں | دی رخصت مے خود مجھے توبہ نے گھٹا میں

ے نکلے ہیں وحشت سے کیوں اقربا سوئے وطن | اب تو مجھکو وادیِ غربت بھی گھر سے کم نہیں

دو دن کی زندگی ہے اسیری ہے عندلیب | فکرِ قفس کرے کہ اسیری کا غم کرے

کیونکر کہوں کہ لطف بھی انکا ستم نہیں | کب آئے دیکھنے کو کہ جب مجھ میں دم نہیں

جس کی سحر نہ اس کی زمانے میں شام ہے | فرقت کی شب بھی روزِ قیامت سے کم نہیں

کیا خبر مجھکو خزاں کیا چیز ہے کیسی بہار | آنکھیں کھولیں آکے میں نے خانۂ صیاد میں

ملیں حسرتِ وطن کی آرزو میں خاک میں آکر | مبارک باد دے اے بیکسی شامِ غریباں کو

پارسا ہو کر ... بتوں کے عشق میں | میں اسی کا شکر کرتا ہوں کہ ایماں رہ گیا

حسرت اس کی رہ گئی یہ بڑی بات ہے مجھے | دل چیز کیا تھا ہاتھ سے اپنے گیا گیا

گل ہوا ... ہوں تو پریشاں | ہر رنگ میں اک آفتِ غم دل سے لگی ہے

ہمسائگی بھی سوختہ قسمت کی قہر ہے — بھڑکی جو دل کی آگ کلیجہ کو جا لگی

کیا خاک سنوں ناصح مشفق تری باتیں — کہتے ہیں نہیں میرے طبیعت کئی دن سے

رہا بھی ہوں تو کیا پرواز کی دل سے ہوس نکلے — کہ ہل سکتے نہیں ہم جو بال و پر زیر قفس نکلے

امید فیصلہ محشر میں کیا ہو وہ جو بیٹھے ہیں — تو ہاں تک جان کے دشمن یہاں فریاد رس نکلے

بر ارماں گردن و خنجر ہیں دونوں دیکھیے کیا ہو — کسے ناکام رکھے آسماں کس کی ہوس نکلے

نکالے گا کوئی کب تک دل بسمل سے پیکاں کو — جو سو میں ایک بھی نکلے تو یہ لاکھوں برس نکلے

یونہی لڑتے جھگڑتے عمر دو روزہ گذر جائے — نہ ہم [illegible] نہ ساتی عسس نکلے

قیامت ہے قفس میں دیکھ کر بازو کو رہ جانا — بلا سے [illegible] جاتا اگر یہ بال و پر ہوتے

اٹھا لینے کی فرصت اضطراب دل اگر دیتا — تو جیتے جی مرے بالیں [illegible] لخت جگر ہوتے

مجھے تو طعنۂ پرواز فصل گل میں کیوں دیتا — اسی قابل اگر صیاد میرے بال و پر ہوتے

چلو ہم مر گئے فرصت ملی جھگڑا مٹا ورنہ — یہی شکوے گلے باہم مری جاں عمر بھر ہوتے

ورم پیری مآل کار سے کیونکر نہ غفلت ہو — کہ اکثر آنکھ لگ جاتی ہے انساں کی سحر ہوتے

برنگ شمع مہماں شب کا ہوں شعلے جو رو دیتا — کہاں پایا [illegible] تو نے بے کسی مجھ کو سحر ہوتے

نہ رہتا کفر و دیں کا ایک بھی پابند دنیا میں — [illegible]

نہیں پردہ سے [illegible] دری ہے [illegible] — [illegible]

فقط آہ [illegible] روتے ہیں [illegible] — [illegible] کیا ہوتا جو نالے با اثر ہوتے

نہ شامیانہ، نہ شمعِ تربت، نہ موجِ سبزہ، نہ چادرِ گل
بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہوئی بے کسی کی

نالۂ تسلیم کا نمونہ

آغاز کلام

شگافِ کلکِ رنگیں خندہ زن ہے — مبارک باد آغازِ سخن ہے
بھری ہے بے نیازی مدعا میں — سرِ تمکیں ہے عرضِ التجا میں
بڑھی ہے ناتمامی گفتگو سے — مرا مطلب سوا ہے آرزو سے
خیالِ آئینہ حیرت فزا ہے — زباں مصروفِ حمدِ کبریا ہے

دعائے عاشقانہ

الٰہی دے زبانِ نکتہ دانی — دکھاؤں جلوۂ حسنِ معانی
اجازت خواہِ لطفِ گفتگو ہے — خموشی بہرِ رخصت روبرو ہے
تطاولِ سخن سے پارسا ہے — ابھی نادیدۂ حسنِ مدعا ہے
سحاب آسا عطا کر چشمِ گریاں — مصیبت زادۂ آغوشِ طوفاں
رہے بیداریوں کا حفظِ آداب — نہ ہوں آنکھیں کبھی منت کشِ خواب
نہ کم ہو کوئی دن سامانِ سودا — رہے سرمنزلِ احسانِ سودا
ترقی پر رہے شوقِ اسیری — رہے وحشت کو پاسِ دستگیری
فلک کو لذتِ ذوقِ جفا سے — نہ دوں فرصت تقاضائے بلا سے

خاتمہ

پلا ساقی شراب جام حسرت — کہ ہوں خدمت سے اب مشتاقِ رخصت
جو تو نے شیشہ و ساغر اٹھایا — مجھے قولِ غنیمت یاد آیا
بیا ساقی بیا اے قبلۂ شوق — کہ دور آخر شد و باقیست ایں ذوق
طبیعت جوش پر آنے نہ پائی — عروجِ فکر نہ کھلانے نہ پائی
نہ نکلا حوصلہ اپنی زباں کا — قلق ہے دل کو انجام بیاں کا
احبّا نے کہا ہنگامِ اتمام — کہ اس کا نامۂ تسلیم ہے نام
یہاں تک یہ پسندِ طبع آیا — کہ گویا دل سے میرے نقل پایا
ہوا ہاتف سے بہر سال ارشاد — قبولِ خاطرِ اربابِ فن باد
۱۲۷۸

نمونہ شامِ غریباں

حمد

اجازت او خیالِ قاصدِ دل — کہ آپہونچا دمِ تکلیف مشکل
طبیعت پھر مری کچھ ناز پر ہے — کوئی مطلب مگر آغاز پر ہے
مضامیں بیٹھے ہیں فکرِ رسا سے — زباں جنبش میں ہے حمدِ خدا سے
طلسمی کارخانہ اک بنا کے — نظر سے چھپ رہا صورت دکھا کے
کسی کو عشق کی لذت عطا کی — مزہ دیتی رہی اندوہ ناکی
کہیں ہے التماسِ شوقِ دیدار — کہیں ہے محرمِ اسرارِ انکار

کہیں طالب کہیں مطلوب وہ ہی — غرض ہر رنگ میں کچھ خوب ہی وہ
تماشا دوست یا یہ خود نما ہے — تصور بن کے پھرتا جا بجا ہے
کہاں تک ایک سی آہنگِ فریاد — بدل اب او کوئی رنگِ فریاد
ملک مشتاق ہیں حرفِ دعا کے — فلک پر بھیج تحفے التجا کے

مناجاتِ عاشقانہ

الٰہی دے کوئی دل سر بسر جوش — برنگِ زخمِ خنداں غم فراموش
ہمیشہ سایۂ خنجر میں تڑپے — اگر محشر بھی ہو محشر میں تڑپے
ہنسے رسوائی حالِ زبوں پر — بہائے اشک تدبیرِ جنوں پر
نہ ہو پامال غم کی سرکشی سے — اٹھائے ناز دشمن بھی خوشی سے
بڑھے گر بدگمانی چشمِ تر کی — قسم کھائے سرِ داغِ جگر کی
نہ ہو کامِ مذاقِ تلخ کامی — رہے ہر مدعا میں ناتمامی
رگِ سودا جنوں میں خون کو ترسے — سنے طعنے زبانِ نیشتر سے
مروں تیور اگر بدلیں الم کے — رکے سینہ میں دم رکنے سے دم کے
اجل سامانِ شادی کا سبب ہو — صفِ ماتم صفِ بزمِ طرب ہو
بڑھیں رتبے یہ تبلیسِ سرسری کے — اٹھاؤں ناز قحطِ مشتری کے
سیہ کاری نقیبِ لم یزل ہو — نیابت کعبہ تو ما یہ عمل ہو
بس اے تسلیم کب تک جوشِ مستی — کہاں تک شیوۂ مطلب پرستی
نہ کر شوقِ عرضِ التجا میں — گرہ دے طولِ زلفِ مدعا میں

زباں ہے مائلِ ذکرِ پیمبرؐ　　دہن ہے حلقۂ گرداب کوثر

مولوی محمد محسن محسنؔ

مولوی محمد محسن محسنؔ تخلص مولوی حسن بخش خلف مولوی حسین بخش علوی کاکوروی کے بیٹے تھے ۱۲۴۲ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے، سات برس کے سن سے سولہ برس کے سن تک اپنے دادا کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی، اُن کے انتقال کے بعد باپ اور مولوی عبدالرحیم سے تحصیلِ علم کی،

مولوی ہادی علی اشکؔ ان کی ماں کے خالہ زاد بھائی تھے، نقۂ پرہیزگار، عالم باعمل، تحقیقاتِ علمی اور اصولِ شاعری پر ان کو عبورِ کامل حاصل تھا، انہی سے مشقِ سخن کی۔

مین پوری میں چند روز عہدۂ نظارت پر کام کیا، اور وہیں سے وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دیکر کامیابی حاصل کی، اُس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی، بعد کامیابی آگرہ میں بود و باش اختیار کی، غدر ۱۸۵۷ء تک آگرہ میں رہے، اُس کے بعد مین پوری میں مستقل قیام کرکے وکالت کو خوب ترقی دی: چند روز میں اُن کی دیانت، راستبازی، صفائی معاملہ، نازک خیالی اور عالی دماغی کی دھوم مچ گئی، حکام ان کو خاص عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے،

ہر شخص سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور ہر کسی کے درد دکھ میں شریک ہوتے، انکسار جوہر طبعی تھا، پُرانی وضعداری اور ایشیائی مروت کا وہ بے مثل نمونہ تھے جس میں حکمت عملی، ضرورتِ وقت اور پالیسی کا گذر نہ تھا، جس شخص سے جو برتاؤ ایک مرتبہ ہوجا

اس کو وہ آخر تک نباہتے رہتے تھے،

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا، ابتدا میں کچھ غزلیں بھی لکھیں اور کبھی کبھی کسی کی فرمائش سے قصیدہ یا مثنوی، یا دوستوں اور بزرگوں کی تحریک سے تاریخہائے ولادت و وفات لکھیں، اس کے سوا نعت کے سوا انھوں نے کچھ نہیں لکھا، کلیات ان کے بڑے بیٹے مولوی نور الحسن بی اے ایل ایل بی نے جمع کر کے چھپوا دیا ہے، اس میں سب سے پہلے ایک نعتیہ قصیدہ "گلدستۂ کلام رحمت" ہے اسے ۱۲۵۸ھ میں لکھا تھا، اس کے بعد سراپائے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، جس کو ۱۲۶۹ھ میں تصنیف کیا تھا، پھر ان کا مشہور قصیدہ ہے جو شہیدی کے قصیدے کے جواب میں ہے، اس کو ۱۲۷۴ھ میں لکھا تھا، اور منشی امیر احمد امیر نے اس کی تضمین کی ہے، پھر "چہرۂ شہنشاہی" ایک ترکیب بند ہے، جو واجد علی شاہ کی تعریف میں کسی دوست کی فرمائش سے اور انہی کے نام سے لکھی تھی، پھر مثنوی "صبح تجلی" ہے، جو ۱۲۸۹ھ میں لکھی ہے، پھر "فغانِ محسن" اور "نگارستانِ الفت" دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، جن کو ۱۲۸۹ھ اور ۱۲۹۳ھ میں لکھا تھا، پھر "مدیح خیر المرسلین" ان کا وہ مشہور نعتیہ قصیدہ ہے، جس نے ہر کہ و مہ سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے، اس کا پہلا مصرع یہ ہے، ع

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

اس کو ۱۲۹۳ھ میں لکھا تھا، اور اس کا خمسہ منشی عبد المجید سحر نے بھی بڑے زور کا لکھا ہے،

پھر اپنی مشہور مثنوی چراغ کعبہ، شبِ معراج کے حال میں ۱۳۰۱ھ میں لکھی تھی، پھر ان کی مثنوی شفاعت و نجات ہے، اس کو ۱۳۱۱ھ میں لکھا تھا، اس کے بعد رباعیاں، غزلیں اور تاریخیں ہیں،

عام جوہر اُن کے کلام کا مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندش کی چستی،
استعاروں کی رنگینی اور قصہ طلب تلمیحات ہیں جن میں اُن کے معاصرین میں کوئی اُنکا شریک
نہیں بلکہ اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں،

ثاقب نے مکتوبات امیر مینائی کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ
منشی امیر احمد امیر سے محسن کاکوروی کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا، تو فرمایا کہ
"ان کا کلام ایک عالم ہے، خیالات نادرہ کا کہ اُس کو دیکھکر انسان حیران ہو جاتا ہے اور
ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے"

۱۸ صفر ۱۳۲۳ھ کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی، مرتے وقت یاس
انفاس جاری تھا، تاریخ وفات منشی زین العابدین فرجاد نے بڑی معقول نکالی جو کہ آیہ کریمہ
ہے، اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْن،

صبحِ تجلّی

بیضاوی صبح کا بیاں ہے — تفسیر کتاب آسماں ہے
ہے خاتمۂ شب دل افروز — دیباچہ نگار نسخۂ روز
آثارِ سحر ہوئے نمایاں — سیپارہ لئے ہوئے ہے دوراں
واللیل کو ختم کر چکا ہے — آمادۂ دورِ والضحیٰ ہے
عنوانِ فلک ہے در منشور — لوحِ زرین سورۂ نور
اطرافِ بیاضِ مطلع صاف — والفجر کے حاشیہ پہ کشاف
ہر دشت ہے مثلِ دشتِ ایمن — ہر کوہ برنگِ طور روشن

گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں
مشکوٰۃِ شریفِ مہرِ تاباں

ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے
انجم کا ستارا ڈوبتا ہے

ہنگام سپیدۂ سحرگاہ
ساعات میں روز و شب کے واللہ

اک مخبرِ صادق البیاں ہو
پیغمبرِ آخر الزماں ہے

کیفیتِ وحی میں ہے بلبل
ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گل

سبزہ ہے کنارِ آبِ جو پر
یا خضرِ رہ مستعدِ وضو پر

نوبت ہے صدائے قمریاں کی
تیاری ہے باغ میں اذاں کی

اک شاخ رکوع میں رکی ہے
اور دوسری سجدہ میں جھکی ہے

سوسن کی زباں پر مناجات
جاری لبِ جو سے التحیات

تسبیحِ شگوفہ یا مصوّر
تحریمہ "تاک" "ربِّ اغفر"

اللہ اللہ کیا سماں ہے
ہر شے کو حیاتِ جاوداں ہے

سرسبزی ہے باغ میں جناں کی
آمد ہے بہارِ بے خزاں کی

لوح و قلم ادیبِ تقدیر
محوِ خطِ نسخ عالمِ پیر

ایام کا بخت پھر جواں ہے
پھر عہدِ شباب آسماں ہے

ہستی و عدم میں ایک لے ہے
لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے

کیفیتِ خرمی سے آج مسرور
رنگین طبعانِ عالمِ نور

رضواں نے کہیں سبیل رکھی
ہر کوزے میں سلسبیل رکھی

تیار کئے بحکمِ باری
میکائیل اک طرف نہاری

آئی ہے ساغر و صراحی
کوثر سے کھنچی ہوئی صبوحی

گلدستے بہشت نے بنائے — جبرئیل درود پڑھتے آئے
بیٹھے ہوئے ہیں خوشی سے پھولے — غلماں لئے ہار، حور گجرے
خاکہ ہے زمیں میں آسماں کا — نقشہ ہے مکاں میں لامکاں کا
گویا اتر آئے ہیں زمیں پر — مینا بازار چرخ اخضر

ناگاہ تجسّس کی عبارت — پیدا ہوئی غیب سے بشارت
یہ صبح سعادت جہاں ہے — نورِ روزِ بہار جاوداں ہے
نازل ہے زمیں پہ کبریائی — بندے کے لباس میں خدائی
اس وقت دیارِ عرب کے — مطلع سے تجلیاتِ رب کے
برجِ شرفِ قریشیاں میں — اور ہاشمیوں کے خانداں میں
کعبے کی زمینِ نامور سے — اور عبدالمطلب کے گھر سے
اسلام کا آفتاب چمکا — بے پردہ و بے نقاب چمکا
پیدا ہوئے سرورِ دوعالم — پیدا ہوئے فخرِ نوح و آدم
محبوبِ خدا نبیِ مرسل — صبحِ دوین روزِ اول
مقصودِ ازل اجل و اعلیٰ — منظورِ حضورِ حق تعالیٰ
عینِ عرفان و مردمِ عین — ابروئے جبینِ قابَ قوسین
جانِ دلِ مرسلیں محمد — روحِ روح الامیں محمد
کیفیتِ وجد میں ہے اب ذوق — کہتا ہے خطیبِ خامۂ شوق
ہے ذکرِ ولادتِ پیمبر — اعلیٰ و اولیٰ اہمّ و اکبر

چراغِ کعبہ کا نمونہ

جبرئیلؑ

عمامۂ کرم کے درِ منثور
قرآنِ شرف کے سورۂ نور
مانندِ دوا زمیں پہ نازل
مانندِ دعا سپہر منزل
منشورِ اوامر و نواہی
عنوانِ صحیفۂ الٰہی
وارد ہوئے ابر ساں زمیں پر
ساتھ اُن کے براق برق پیکر

بُراق

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل
کھیت اُس کا بہشت خلد جنگل
مہ پارہ فلک سے آنے والا
اطلس کو کتاں بنانے والا
یوں چرخ سے نکلے وہ مبارک
فانوس سے جس طرح کہ پرتو
شیشے سے پری چمن سے شبنم
سیپی سے گہر حباب سے دم
گلشن سے بہار جسم سے جاں
آنکھوں سے نیند دل سے ارماں

درود

حاضر ہوئے [illegible] کے آستاں پہ
جس کا کہ مکاں ہے لامکاں پہ
محبوبِ خدا [illegible] تن جاں کا
مقصودِ رموزِ کن فکاں کا

ہاشم کی کلاہ میں گلِ تر دامن میں قریشیوں کے گوہر
امکاں کے گھر کا ابرِ نیساں دریائے قِدم کا شاخِ مرجاں
صانع کے قلم کا رنگِ ایجاد بندوں کے چمن کا سروِ آزاد
ایمان کی سند کا نقشِ خاتم عرفاں کے نگیں کا اسمِ اعظم
لاہوت مقام و عرش مسند شاہنشہِ انبیا محمدؐ

بیداری

آداب سے آپ کو اُٹھایا یا اپنے نصیب کو جگایا
بیدار ہوئی جو چشمِ حق بیں آنکھ ہوئی شکلِ خوابِ شیریں
دیکھا کہ عجیب ماجرا ہے گھر برجِ قمر بنا ہوا ہے
افشائے رموزِ غیب مضمر ہونے کا نہیں یہ دن کبھی پھر
سونا کبھی ہو نہ یہ جگانا لیتا رہے کروٹیں زمانا
طالع میں نہیں یہ شب کسی کے اختر سو بار سو کے جاگے
ہوگی نہ یہ پھر زمیں کی توقیر مٹی ہو ہزار بار اکسیر
انوار کا ہے ورود پیہم تاروں کی برس رہی ہے شبنم
جبریل ہیں اور براق بھی ہے قاصد بھی ہے اشتیاق بھی ہے

سیر مقامِ اعلیٰ

رکھا جو قدم جنابِ والا اعلیٰ سے تھا جو مقامِ اعلیٰ

دل کی تگ و دو بھی دم سے آگے | سر چار قدم قدم سے آگے

چمکا ہوا آئینِ تجلّی | پھیلا ہوا دامنِ تجلّی

وحدت کا کھلا ہوا دوناکا | جس میں نہیں دخل ماسوا کا

وارفتہ خیالِ جستجو کے | چھاپے لئے خونِ آرزو کے

امید کے ہو نشیب سینے | ٹوٹے ہوئے حوصلے کے زینے

نکلی ہوئی ہمتوں کی جانیں | اتری ہوئیں چلّے سے کمانیں

بیٹھے ہوئے دورباش ادب کی | طوبیٰ و بہشت عرش و کرسی

جانے کا نہیں یہاں ملک نام | روحوں کا پہنچ سکے نہ پیغام

تاثیرِ دعا کے در سے محروم | کوشش شرفِ اثر سے محروم

انسان کی واں تھی کب رسائی | آنکھوں میں کشش بٹھا کے لائی

وہ مردمِ چشمِ دین و ایماں | کحل البصرِ وجوب و امکاں

آنکھوں کو تلاش جلوۂ رب | کانوں میں صدائے نحن اقرب

آیا سوئے بزمِ لی مع اللہ | آئینہ میں جیسے پرتوِ ماہ

پہونچا وہ وہاں جہاں نہ پہنچے | جبریلؑ کی عقل کے فرشتے

نزدیکِ خدا حضور پہنچے | اللہ اللہ دور پہونچے

مدیح خیر المرسلینؐ

تشبیب

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ
کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل

دھر کا ترسا بچہ ہے برق لئے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل

ابر پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم
برق بنگالہ ظلمت میں گورنر جنرل

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

شاہد کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ
چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

جوگیا بھیس کئے چہرے پہ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل

وہ دھواں دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع
گر پہ پروانہ بھی ڈھونڈھے تو لیکر مشعل

ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے
برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

غزل

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل

خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل

سطحِ افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی
روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل

بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں
وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل

میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوشِ خروش
کسی بیدرد کو دکھلائے کرشمہ بادل

دلِ بیتاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی
چشمِ پُرآب کا ہے ایک کرشمہ بادل

طپشِ دل کا اڑایا ہوا نقشہ بجلی
چشمِ پُرآب کا دھویا ہوا خاکا بادل

اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے
میری آنکھوں کا ہے اترا ہوا صدقہ بادل

جامِ عمرِ فلکِ پیر ہوا ہے لبریز
لئے آتا ہے جنازہ دئیے کاندھا بادل

راجہ اندر ہے پری خانے کا پانی
نغمۂ نے کا سری کشن کنھیا بادل

دیکھتا گر کہیں محسنؔ کی فغان و زاری
نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

گریز

رشتۂ معنی ہے بھٹکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

اک ذرا دیکھئے کیفیت معراجِ سخن
ہاتھ میں جامِ زحل شیشۂ مہ زیرِ بغل

گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں کھا پاؤں
کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل

یعنی اُس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں
خرمنِ برقِ تجلی کا لقب ہے بادل

تا بارانِ مسلسل ہے ملائک کا درود
پئے تسبیح خداوندِ جہاں عز و جل

گلِ بے رنگیِ مطلق کے لہکتے گلزار
بے نیازی کے ریاحین مہکتے جنگل

باغِ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہ
انبیا جس کی ہیں شاخیں عرفاں میں کوپل

گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی
زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل

سراپا کے چند بند

للہ الحمد شبِ غم نے اٹھایا چادر
مرحبا طالعِ بیدار مبارک ہو سحر
مژدہ اے دل کہ ہوا نورِ خدا پیشِ نظر
بارک اللہ طبیعت کا ہے رنگِ دیگر
گر نہ ہو پاسِ ادب تو مجھے کچھ دوری ہے
سجدہ کرتے ہیں ملائک مرا وہ رتبہ ہے

لامکاں تک لئے جاتی ہے مجھے طبعِ رسا
لڑ گیا عرش کے پایے سے سخن کیا پایا
ہو رہا ہے صفِ ارواح میں میرا چرچا
خیر مقدم کی چلی آتی ہے ہر سوے صدا
بزمِ قدسی کا بلایا ہوا مہماں ہوں میں
ملک آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں وہ انساں ہوں میں

آج کس دھوم سے خدامِ سخن آتے ہیں
مسندیں فکر کی محفل میں بچھا جاتے ہیں
تنگیِ بزمِ جہاں دیکھ کے گھبراتے ہیں
گاؤ تکیہ کرۂ ارض کا ٹھکراتے ہیں
جشن کا روز ہے معنی کے شہ اقدس کا
اور اونچا کرو خیمہ فلکِ اطلس کا

ہم دکھاتے ہیں طبیعت کے تماشے کتنے
عالمِ نور میں چھوڑتے ہیں شگوفے کتنے
کھل گئے غنچۂ خورشید کے نکلے نکلے
عقدِ پروین سے کچھ جھڑ گئے گہنے کتنے

سادہ کاغذ ورقِ مہر درخشاں ہے آج

دستِ پُر نور عطارد میں قلمداں ہے آج

تضمین

کنویں جھانکا کروں کنعاں کے تو سودا ہے مجھے / طور پر جاؤں تو ناحق کا بھٹکنا ہے مجھے

ضبط ہے گر سرِ اعجازِ مسیحا ہے مجھے / سچ تو یہ ہے کہ ترے گھر میں کمی کیا ہے مجھے

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دور سوم

جدید شاعری کا آغاز

اردو شاعری کا یہ نیا دور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ پنجاب کے دار السلطنت لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ہو کر آئے اور ان کو اردو زبان کی اصلاح کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کے لئے انھوں نے اردو میں قواعد کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرائیں اردو نثر میں قصے لکھوائے مضمون نگاری کو ترقی دینے کے واسطے ایک سرکاری اخبار نکالا اور ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی،

اس مشاعرے میں بجائے مصرعہ طرح کے عنوان مضمون دیا جاتا تھا تاکہ عاشقانہ خیالات کی جگہ پر مناظر قدرت اور جذبات انسانی کے خاکے کھینچے جائیں۔ سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے جو اردو شاعری میں ذوق و غالب کی یادگار تھے اور حسن اتفاق سے انکا تعلق سررشتۂ تعلیم سے تھا ایسے نمونے کے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں کوئی طرز بھی ہو اول اول اس میں کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس میں تراش خراش ہوتی ہے اور وہ حسن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے یہی حالت اس طرز کی بھی ہوئی۔ پہلے پہل اخباروں میں شور و غل برپا ہوا پھبتیاں اڑائی گئیں اور کمزوریوں کو خوب نمایاں کر کے دکھایا گیا مگر اب آندھی نکل گئی ہے اور یہ طرز اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ کہن سال اور کہنہ مشق شاعر بھی جن کی ساری عمر گل و بلبل کی داستان سرائی میں بسر ہوئی تھی اسی طرز پر اتر آئے ہیں

مولوی محمد حسین آزاد

مولوی محمد حسین خلف مولوی باقر علی، آزاد تخلص، دلی کے رہنے والے اور قوم کے مغل تھے۔ شمالی ہندوستان میں اُردو اخبار پہلے پہل مولوی باقر علی نے قلم سے نکالا ہے۔

مولوی باقر علی کا بچپن سے شیخ محمد ابراہیم ذوق سے یارانہ تھا، اُس زمانے کی یاری رشتے اور ناطے سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتی تھی، اس لحاظ سے استاد ذوق آزاد کو بیٹا سمجھتے تھے، انہی کے سایۂ عاطفت میں آزاد نے تعلیم و تربیت پائی، اور اُن کے مرنے کے بعد حکیم آغا جان عیش[1] کے فیضِ صحبت سے فائدہ اُٹھایا۔

غدر کے ہنگامہ میں آزاد کا گھر بار لُٹ گیا، باپ شہید ہوئے اور اُستاد کی عمر بھر کی کمائی جس کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتے تھے، برباد ہو گئی، کچھ دنوں پریشان حالی میں اِدھر اُدھر

۱؎ خاندانی طبیب تھے اور شاہی دربار سے تعلق تھا، آزاد کہتے ہیں کہ زیورِ علم اور لباسِ کمال سے آراستہ صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں، ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا، طبیعت ایسی ظریف اور لطیفہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں، غزل صفائی کلام، شوخیِ مضامین اور حسنِ محاورہ سے پھولوں کی چھڑی ہوتی تھی اور گویا لطف و ظرافت کی پھلجھڑی۔

آزاد نے ان کو پہلے پہل استاد ذوق کے ساتھ مشاعرہ میں دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ اُس وقت کی تصویر اس وقت آنکھوں میں پھر گئی، میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک آنگیا، بال سفید، ایسی ہی داڑھی، اس گوری سرخ و سپید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی، باتیں ایسی کرتے جیسے پھلجھڑی کا ڈھیر (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

مارے مارے پھرتے رہے آخرکار لاہور پہنچے اور سررشتہ تعلیم کے دفتر میں پندرہ روپیہ ماہوار کی اسامی مل گئی، اس پر مدتوں پڑے رہے، رفتہ رفتہ پچہتر روپیے ہوگئے، پھر اور کچھ بڑھ گئے، اور ان کو موقع ملا کہ یہ اپنی کارگذاری کا جوہر دکھائیں، اُس وقت گورنمنٹ کو بھی اردو کے نشو ونما و ترقی کی فکر تھی، ان کو اس سے خاص طرح کا لگاؤ تھا انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنیا ڈالی گئی اور نئے طرح کے مصرع کے مضمون کا عنوان دینا قرار پایا، اُنھوں نے نمونے کے طور پر کئی نظمیں لکھیں اور مقبول ہوئیں،

اسی اثنا میں تعلیمی کاموں کے علاوہ ملکی کاموں میں بھی ان کو شریک کیا گیا، ایک مرتبہ کسی سرکاری کام پر کلکتہ بھیجے گئے، کچھ دنوں کے بعد پنڈت من پھول میر منشی گورنمنٹ پنجاب کے ہمراہ کابل و بخارا کا سفر کیا، پھر ایران گئے،

کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے قصص ہند کا دوسرا حصہ ان سے لکھوایا، اس کے بعد اُنھوں نے خود اپنی خواہش سے نیرنگ خیال کے دو حصے تالیف کئے، اور اس میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸) پڑا ہنس رہا ہے استاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور ان کی کمان کشش نے کھینچ کر انکی حد میں بھی پہنچایا، اب ان صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں اور نہیں پاتیں، غدر کے کچھ دنوں بعد دنیا سے انتقال کیا، افسوس ہے کہ آزاد نے ان کے دو شعر بھی نہیں لکھے،

سب سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے گلشن بیخار میں اُن کا ذکر بھی نہیں کیا، دو شعر سخن شعرا سے اور ایک آبحیات سے نقل کرتا ہوں[۱]،

کہتا ہے کوئی شعلہ جوالہ کوئی برق | اس دل پہ گماں لوگوں کا کیا کیا نہیں ہوتا

اک لفت کا بل ہو تو کہوں سیکڑوں بل ہیں | پیشانی سے ابرو تلک ابرو سے کمر تک

[۱] اس لحاظ سے تو تین شعر ہونے چاہئیں لیکن صرف دو ہی شعر نقل کئے ہیں، ”ع“

انگریزی طریقہ کی مضمون نویسی کا چربہ اُتارا

سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آبِ حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشاپردازی کا بہترین کارنامہ ہے عبارت کی بیساختگی اور برجستگی اور اس میں شاعرانہ تخیل و استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں،

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم سے لکھی گئیں وہ آج اردو کی انشاپردازی کے قالب میں روح کی طرح سے پیوست ہو گئی ہیں اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں جس طرح سے اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چون و چرا مانے جاتے ہیں، اُسی طرح سے ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے،

آزاد کی ایک اور تصنیف دربارِ اکبری ہے جو اُسی قلم کی کوشش کا نتیجہ ہے جس نے آبحیات لکھی تھی، فرق اتنا ہے کہ اس کے مسودے کو وہ خود صاف نہیں کر سکے، یکایک دماغ بگڑ گیا، اور ان کے شاگردوں نے اس کو مرتب کر کے شائع کر دیا،

ایک اور تصنیف ان کی سخندانِ فارس ہے، جو ایران سے لوٹنے پر لکھی تھی، علاوہ ان کتابوں کے مجموعۂ نظم آزاد، قصص ہند اور چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں ہیں جو سررشتۂ تعلیم کے تعلق سے لکھی تھیں،

آخر زمانہ میں پچتر روپیہ ماہوار کی پنشن ہو گئی تھی، اگر دماغ کے بگڑ جانے سے یہ کام کے نہیں رہے تھے ۱۹۱۰ء میں وفات پائی،

صنم پہ گر نہیں [illegible] پیری کی   اگر خود مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا

سراپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں
یہ بوجھ تھی مری گردن پہ سو اتار آیا

جو ان معرکۂ حسن و عشق تھا آزاد
چلا نہ دل پہ جو قابو تو جان ہار آیا

ادھر بھی چشم عنایات ہو ذرا ساقی
کہ دست دیت امیدوار بیٹھے ہیں
کمان ابروئے جاناں کے دل سے ہوں قرباں
کہ جتنے تیر ہیں سینے کے پار بیٹھے ہیں

آفریں ہمت کو اُس کے دل کی جس کو عشق تھا
جان دے دی پر نہ کی پروا جگر والا تو ہو
ناخنِ تدبیر کے خود کر دیگا تیرا عقدہ وا
پیچ پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

پوچھتا حال ہے کیا میرے دلِ ناشاد کی
آہ کی ہمت نہیں طاقت نہیں فریاد کی

دیکھنا قید تعلق میں نہ آنا آزاد
دام آتے ہیں نظر سبحۂ و زنار مجھے

سنے گا دیکھنا رو رو کے آواز اک جہاں میری
تمہارے عشق کی ہے داستاں اور ہے زباں میری
تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھکو چاک کر ڈالو
تمنا ہے یہ دامن کی اُڑا دو دھجیاں میری

از مثنوی شب قدر

اے رات تیرے وصف کہاں تک رقم کروں
نورانی وقت کی کہاں تک بیاں کروں

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر
بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھوئے ہوئے شفق کا نشان زرق برق سے
رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے

اس کے عمل کا توڑنا تیرا ہی کام ہے
سکہ ہے اب ستاروں پہ اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا تو راحت تھا پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

از مثنوی ابر کرم

چلنا وہ بادلوں کا قدم چوم چوم کر
اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

آتی ادھر صبا ہے ادھر ہے نسیم بھی
اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانان باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھائے ہے
اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجائے ہے

ساون کے گیت اٹھتے ہیں طوفان لو نین ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارمان لوں میں ہیں

ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹھکور ہے

خواجہ الطاف حسین حالی

"مولوی الطاف حسین خلف ایزد بخش پانی پتی امروز در دہلی است، در صحبت حضرت

شیفتہ جیسے بسر برده، مرزا غالب را فرد ہمیشہ یادگار است و در نغز سرائی
نادرۂ گفتار ۔ اھ (طور کلیم)

مولانا الطاف حسین حالی اس زمانہ کے مسلم الثبوت شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں
ان کی نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔ ان کی ولادت پانی پت میں ۱۲۵۲ھ
ہوئی، دادھیال انکا انصاری اور ننھیال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھا،
ولادت کے بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا۔ جب نو سال کے ہوئے تو والد نے
رحلت کی، اس وجہ سے تعلیم و تربیت کا جیسا انتظام ہونا چاہئے تھا، وہ ان کو میسر نہیں ہوا
قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد پہ شوق سید جعفر علی سے کچھ فارسی پڑھی اس کے بعد
مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو شیعوں میں ایک جید عالم تھے عربی شروع کی، ابھی
اچھی طرح کتابیں نکلی نہ تھیں کہ ان کے سرپرستوں نے مجبور ہو کر شادی کر دی، اس وقت انکا
سن سترہ سال کا تھا، شادی کے بعد یہ روپوش ہو کر دلی چلے گئے،
دلی میں مولوی نوازش علی مرحوم سے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں، عربی میں اچھی
طرح استعداد نہ ہونے پائی تھی کہ اہل وطن نے ان کو پانی پت بلا لیا، یہ وطن میں تھے کہ ہندوستان
میں غدر ۱۸۵۷ء کا محشر خیز ہنگامہ برپا ہو گیا، اور چھ سات برس تک ان کو نکلنے کا موقع نہ ملا
تاہم کچھ نہ کچھ کرتے رہے، مولوی محب اللہ، مولوی قلندر علی اور مولوی عبد الرحمن محدث
سے بغیر ترتیب انتظام کے کبھی منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں کبھی حدیث و تفسیر کا درس لیا
جب یہ لوگ باہر چلے جاتے تو شروح و حواشی کی مدد سے ادب کی کتابیں بطور خود مطالعہ کرتے
جس زمانہ میں دلی میں تحصیل علم کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے، ان کو اکثر مرزا غالب کے پاس
جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ان کے اردو فارسی دیوان کے اکثر مشکل اشعار کے معنی ان سے

ان سے پوچھا کرتے تھے، اسی زمانہ میں مرزا نے اپنے فارسی کے دیوان کے چند قصیدے بھی ان کو پڑھا دیئے تھے، مرزا غالب کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر سے منع کرتے تھے، انھوں نے چند دو ایک اردو یا فارسی کی غزلیں کہہ کر مرزا کو دکھائیں، تو انھوں نے کہا کہ میں اگرچہ کسی کو شعر کہنے کی صلاح نہیں دیتا مگر تمھاری نسبت میرا خیال یہ ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے، مگر دلی میں ان کو ایک دو غزل سے زیادہ کہنے کا اتفاق نہیں ہوا،

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں ان کو بیکار رہتے گذر گئے، اور فکر معاش نے انھیں وطن سے باہر جانے پر مجبور کر دیا، تو حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد سے شناسائی ہوگئی، اور ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا، نواب مرحوم جس درجہ کے شاعر تھے اس سے کہیں زیادہ ان کا مذاق شاعری تھا، حکیم مومن خاں کے بعد وہ اپنا کلام مرزا غالب کو دکھاتے تھے،

یہ جب ان کے پاس پہنچے تو ان کا پرانا شوق شعر و سخن کا جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہوگیا، انھوں نے متعدد غزلیں اردو فارسی کی لکھیں، اور جس طرح نواب مرحوم اپنا کلام جہانگیر آباد سے دلی مرزا کے پاس بھیجتے تھے انھوں نے بھی بھیجیں،

مرزا کی اصلاح نے ان کی طبیعت پر اتنا اثر نہیں کیا جتنا کہ نواب مرحوم کے فیض صحبت سے یہ متاثر ہوئے، نواب مرحوم مبالغہ کو ناپسند کرتے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنے اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے کو منتہائے کمال سمجھتے تھے چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب کو یکساں نفرت تھی، ان کی شاعری نے نواب مرحوم کے دامن تربیت میں پرورش پائی اور ان کی

صحبت میں رہ کر ایک خاص مذاق اُن کی طبیعت میں پیدا ہوگیا جس پر انھوں نے آگے چل کر جدید شاعری کی بنیاد ڈالی،

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت میں جب کہ ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں درست کرنی پڑتی تھیں تو رفتہ رفتہ ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہوگئی اور شاعری اور مشرقی نثار کے فضول حصوں کی وقعت اُن کے دل میں کم ہوتی گئی،

جب کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات کے ایما سے لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا مشاعرہ تھا، اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا، مولنا حالی نے چار مثنویاں لکھ کر اس مشاعرہ میں پڑھی تھیں (۱) برکھارت (۲) نشاط اُمید (۳) مناظرۂ رحم و انصاف (۴) حب وطن، یہ مثنویاں بہت مقبول اور بار بار چھپ کر شایع ہوئیں،

اینگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانہ میں بھی کئی نظمیں، اسی طرز کی لکھیں جس کی تحریک لاہور کے مشاعرہ میں ہوئی تھی، اسی زمانہ میں سرسید احمد خاں مرحوم نے ان کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور پستی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو بہت مفید ہوگی، اُنھوں نے ان کی تحریک پر مسدس مد و جزر اسلام لکھا جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے، اور جس کے اشعار ہر شخص کی زبان پر ہیں اور ہر قومی مجلس میں پڑھا جاتا ہے،

آخر عمر میں ایک حصہ اپنے عربی کلام کا شایع کیا ہے، اردو کا دیوان اُنھوں نے مرتب کیا ہے اور اردو شاعری پر سو دو سو صفحہ کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اُس میں شامل کر دیا ہے، جو دیکھنے کے قابل ہے اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے

اس سے مولانا کے مذاقِ شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے،

ان کی مشہور تصنیف حیاتِ سعدی ہے جس میں شیخ سعدی شیرازی کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں، اور ان کی نظم و نثر پر نہایت عمدگی اور خوبی سے تنقید کی ہے،

ایک کتاب یادگارِ غالب ہے اس میں مرزا نوشہ کے حالاتِ زندگی تفصیل سے لکھے ہیں، اور ان کے فارسی و اردو اشعار کا انتخاب بھی شامل کر دیا ہے،

ایک کتاب حیاتِ جاوید ہے جس کی ضخامت ہزار صفحہ سے زیادہ ہے، اس میں انھوں نے سر سید مرحوم کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں، اور ان کی تمام حیثیتوں پر مورخانہ و فلسفیانہ بحث کی ہے،

علاوہ ان کتابوں کے اور بھی ان کی تصنیفات ہیں، جن میں سے کچھ شائع ہوئی ہیں اب ملتی نہیں، اور کچھ ابھی تک شائع نہیں ہوئیں،

بہر حال مولانا حالی اس زمانہ کے ان مشہور لوگوں میں تھے جنھوں نے پرانے مدرسہ میں تعلیم پا کر ایسے کارِ نمایاں کئے جن کی مثال تعلیمِ جدید ابھی تک نہیں پیدا کر سکی،

۳۱ صفر ۱۳۳۳ھ کو مولانا نے وفات پائی،

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طلبِ وصل — جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

شاید ان کے بھول گئیں ہیں کفِ گیسوئے کام — گویا ہمارے سر پہ کوئی آسمان نہ تھا

وہ روز و شب بھی نصیب ہم کو تھا — کچھ صبح ہی سے شام الم کا نظر تھا

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

دل سے خوشیاں سب ہوئی ہیں گو بہم
نام تھا شاید جوانی کا نشاط
غنچہ چٹکا اور آ پہونچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

...ا ہوں رند بھی نہ بنے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک

...ب بھاگتے ہیں سایۂ لطفِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

بیقرار رہی تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

چارہ گر کار باندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

ترک دنیا کے علائق تو کیے سب ذوقؔ نے گر مناسب ہو تو اک ترک یا اور سہی

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہو گئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف طبع رنگیں تھی نئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب نہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی کی امنگ سر ہی سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر نہ رہی چیز وہ مضمون سجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
تاکہ بھڑکائے جوانی کے دل آتش کی طرح وہ ہو جس سے دماغ اپنا تہی ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں ہنسی بھی وہی ہو نہ مثل "قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفس دوں ہمارا ہیچ ہے گر کبھی حملہ پا سکے غالب جتاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی جن کو نادانی سے حملے اسکے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیے سب عقل نے ہتھیار ڈال زور بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

قوم کی پاسداری

مسلمان خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں — پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
…ہتے ہیں نفع بیچے اپنے اہلِ ملک کو — گو کہ اُن کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
…رخانہ کا یہ راجن کے کبھی چاقو نہ لیں — اُس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
…ردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انھیں — ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
…غرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ — جانتے ہیں دین و ایمان اپنا قصہ مختصر
…ن کے حالی نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا — ایک سی ہے ایک قوم اس عیب سے آلودہ تر
…ں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کے — یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اس پہ ہے طبعِ بشر
…یماں جیتی نکل جاتے ہیں پاسِ قوم میں — اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر
…ں بری اس عیب سے ہے دے کے اس دنیا میں ہے — چشم بد دور امتِ مرحوم اے جانِ پدر
…ر قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز — حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
…یہ گا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یہاں — جس قدر ہے ان سے اپنوں اور بیگانوں کو خطر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقی بشر — یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہیگا کوئی انسان میں عیب — ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

توقع بیجا

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں — ساتھی ہیں عزیز ایک ذلت میں نہیں
اس بات کی انسان سے توقع ہے عبث — جو نوعِ بشر کی خود جبلت میں نہیں

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کیلئے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح
مردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

وقت کی مساعدت

اے دل بگاڑ کا ہے سب کے چارہ
پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی
پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

فکر عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھلو زادِ سفر
مواج ہے بحر رکھو کشتی کی خبر
گاہک جو کسی ہے لیجاؤ مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گذر

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

محمد اسمٰعیل نام، وطن میرٹھ تھا، ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے ۱۶ سال کا سن تھا کہ سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی،

پہلے سررشتۂ تعلیم کے دفتر میں ملازم رہے، پھر کے بعد اسکول میں، ہڈ مولوی" کے عہدے پر مامور ہوئے، اول سہارنپور، پھر میرٹھ میں مدت تک رہ کر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہوگئے، چنانچہ اردو ریڈروں کی تصنیف قیام آگرہ کے زمانہ میں ۱۸۹۳ء کے درمیان کی تقریباً ۱۲ سال آگرہ میں مدرس فارسی کے عہدہ پر مامور رہ کر ۱۸۹۹ء میں پنشن پائی اور اپنے وطن مالوف میرٹھ میں واپس آکر قیام اختیار کیا،

کے درمیان کی، تقریباً ۱۲ سال آگرہ میں مدرس فارسی کے عہدہ پر مامور رہ کر ۱۸۹۹ء میں پنشن پائی، اور اپنے وطن مالوف میرٹھ میں واپس آکر قیام اختیار کیا،

ان کو تصوف کا بھی ذوق تھا، اور حضرت غوث علی شاہ قدس سرہ العزیز پانی پتی کے مریدان خاص میں تھے،

اردو زبان کی نظم اور نثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو یا تمدنی و اخلاقی دنیا سی ہو، قدیم و جدید ہر ایک طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے، اور بقول مولانا شبلی کے جدید رنگ میں مولانا حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق چند کلمات کہے تو وہ مولوی اسمٰعیل صاحب میرٹھی تھے،

مرحوم کا یہ بھی قصد تھا کہ لغات اردو کی ترتیب اور قواعد اردو کی تکمیل جدید طرز پر اپنے خیالات میں کر جائیں، چنانچہ ان کے مسودات محفوظ ہیں، اور ان کے جانشینوں سے امید ہے کہ اسکی تدوین و اشاعت کرکے پبلک کو مستفید کریں گے،

ان کی آخری علمی خدمت یہ تھی کہ وہ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سکریٹری ایم اے او کالج علی گڈھ کی فرمایش سے حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانحمری نہایت عمدہ طور پر مستند کتب و تواریخ وغیرہ سے مرتب کر رہے تھے، اور تنقید مثنوی قران السعدین منجملہ اس کے تکمیل ہو چکی تھی، اور کچھ حصہ کتب مذکورہ کا مرحوم کے ناگہانی حادثہ کی وجہ سے نامکمل رہ گیا

پچھتر سال کی عمر میں یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اپنے وطن میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے

کلیات ان کا چھپ چکا ہے، اور سررشتۂ تعلیم کے تعلق سے اردو ریڈریں ان کی سکولوں میں بسبب کمال سادگی اور سلاست کے مقبول ہو چکی ہیں، ان سے بہتر درسی کتابیں گورنمنٹ کا سررشتۂ تعلیم آج تک نہیں لکھوا سکا،

نظم بے قافیہ کی بیرنگی کو اردو زبان میں گوارا اور پسندیدہ کرنا انہی کا کام ہے، انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور وہ کلیات میں موجود ہیں جو بلحاظ متانت بیان و پختگی الفاظ کے وہی انداز رکھتی ہیں جو دیگر اساتذہ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے،

کھولا ہے مجھ پہ سرِ حقیقت مجاز نے — پختگی صلہ ہے خیالات خام کا
ہیں اب قرار منزلِ مقصود بے نشاں — رستہ کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا

وصل و فراق وہم سہی زندگی تو ہے — پھر ہم کہاں جو پردۂ راز نہاں اٹھا

اب اور ڈھونڈھئے کوئی جولانگہ جنوں — صحرا بقدر وسعت یک گام ہو گیا

سب جتایا کئے نیاز قدیم — وہ کسی کا کبھی آشنا نہ ہوا
کیا ملے جو کبھی نہ تھا پنہاں — کیوں ملے جو کبھی جدا نہ ہوا
تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا — میرا کیا تھا ہوا ہوا نہ ہوا

ہے اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو — یعنی پلے ہوئے اسی آب و ہوا کے ہیں
ان بد دلوں نے عشق کو بدنام کر دیا — جو مرتکب شکایت جور و جفا کے ہیں

تو ہی نہیں ہے رمز محبت سے آشنا — ورنہ دیار حسن میں رسم ستم نہیں

فروشی حسن کو جب سے ہوئی بد نظر
زرخ دل بھی گھٹ گیا جانیں بھی ارزاں ہو گئیں

کچھ لطف ہے جو کرتے ہیں کرم حضرت ناصح
تھے ورنہ مرے ایسے ہوا خواہ کہاں کے

رہ گئی تیرے سوا شاید تمنا اور بھی
کچھ کھٹکتے ہیں ابھی پہلوئے دل میں خار سے

بتلا دیا ہے راہ نما نے مجھے پتا
دنیا بھی اک مقام تری رہگذر میں ہے
چل شاہراہ دل میں اڑا توسن طلب
وحشت کا جوش چاہیے صحرا بھی گھر میں ہے

کشود کار سے تسکین دل کبھی نہ ہوئی
عجب نشاط تھی جو ترک مدعا نے دی

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے
پھر چمن اور آشیانہ اور ہے
ہاں دل بے تاب چندے انتظار
امن و راحت کا ٹھکانہ اور ہے
شمع پھیکی، رات کم، محفل اداس
اب مغنی کا ترانہ اور ہے
اتفاقی ہے یہاں کا ارتباط
سب ہیں بیگانے یگانہ اور ہے

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے
راحت طلبی موجب راحت نہیں ہوتی

یں ہمہ درماندگی انسان کے یہ دعوے
کیا ذات شریف ان کو بنایا ہے خدا نے

ہے آج رخ ہوا کا موافق تو چل نکل　　کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

برسات

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا　　ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا
گھٹا کے جو آنے کی آہٹ ہوئی　　ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی
گھٹا آن کر مینہ جو برسا گئی　　تو بے جان مٹی میں جان آگئی
زمیں سبزے سے لہلہانے لگی　　کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل　　عجب بیل پتے عجب پھول پھل
ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ہے　　ہر اک پھول کا اک نیا رنگ ہے
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا　　کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا　　وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور　　نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی　　پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ　　ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا　　میں اور کی گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس　　اپنا ہی کروں گا ستیا ناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم　　مٹی، پتھر تمام ہیں گرم

خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت — پھیکی باتوں میں کیا حلاوت

کس برتے پہ میں کروں دلیری — میں کون ہوں کیا بساط میری

ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم — سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم

کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی — کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور — ہمت کے محیط کا شناور

فیاض و جواد و نیک نیت — بھڑکی اس کی رگ حمیت

بولا للکار کر کہ آؤ لو — میرے پیچھے قدم بڑھاؤ

کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان — ڈالو مردہ زمین میں جان

یارو یہ ہچر مچر کہاں تک — اپنی سی کرو بنے جہاں تک

مل کر جو کرو گے جاں فشانی — میدان پہ پھیر دو گے پانی

کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں — آتے ہو تو آؤ حوصلا میں

یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ — دشوار ہے جی پہ کھیل جانا

ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت — کی اس نے مگر بڑی شجاعت

دیکھی جرأت جو اس سعی کی — دو چار نے اور پیروی کی

پھر ایک کے بعد ایک لپکا — قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا

آخر قطروں کا بندھ گیا تار — بارش لگی ہونے موسلا دھار

پانی پانی ہوا بیاباں — سیراب ہوئے چمن خیاباں

تھی قحط سے پائمال خلقت — اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت

جرأت قطرہ کی کر گئی کام — باقی ہے جہاں میں آج تک نام

نظم بے قافیہ تاروں بھری رات (۱)

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہوئے — مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسمان پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے — کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں

گہر اور لعل گویا

جوہیں آفتاب تاباں — نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم — یہ تمہاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں — بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی — نہ میسر آتی ان کو
تو غریب جنگلوں میں — یوں ہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راست و چپ کی — نہ طرف کی ہوتی اٹکل

نہ نشان راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے — وہ امیدوار دہقاں
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی — کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہہ رہا ہے خرمن — کہیں آنکھ اُن کی جھپکی
یوں ہی شام سے سحر تک — ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ — نہ شمار وقت و ساعت

مگر اے چمکنے والو! ہو تمھیں انھیں سجھاتے

کہ گئی ہے رات آدھی

وہ جہاز جن کے آگے | ہے وسیع بحرِ اعظم
ابھیں ہولناک موجوں | سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے | کوئی آ رہا ہے واپس
انھیں کچھ خبر نہیں ہے | کہ کدھر ہے اُن کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی | نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر | مگر اے فلک کے تارو

تمھیں ان کے رہنما ہو!

سیّد اکبر حسین اکبر

سید اکبر حسین نام، اکبر تخلص، میر تفضل حسین کے بیٹے، الہ آباد وطن ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں بمقام بارہ ضلع الہ آباد پیدا ہوئے، جہاں اُن کے چچا تحصیلدار تھے بچپن ہی سے آثار ذہانت فرزانگی ان کے ناصیۂ اقبال پر درخشاں تھے،

۱۲۸۴ھ ۱۸۶۷ء میں وکالت درجۂ اولی کا امتحان پاس کیا ۱۲۸۶ھ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور ایک سال بعد ہائی کورٹ میں مسل خواں ہو گئے، مگر اُن کی ترقی خواہ طبیعت کے لئے یہ سہارا کافی نہیں ہوا ۱۲۹۰ھ ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت میں کامیابی حاصل کی، اور چند برس کے بعد منصف مقرر ہو گئے،

انگریزی بطور خود سیکھی تھی، مگر عہدۂ منصفی میں قانونی قابلیت کے ایسے گراں قدر

جوہر اُن سے نمایاں ہوئے کہ سب جج بنا کر اُن کو ترقی دی گئی، پانچ سال نہیں گذرے تھے کہ
ڈسٹرکٹ و سشن ججی کے لئے اُن پر نظر پڑی، اور اسکی قائم مقامی اُنھوں نے ۔ ۔ ھ سال کی ۱۳۲۰ھ
میں اپنے مستقل عہدہ ججی عدالت خفیفہ سے پنشن پر سبکدوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے اور گورنمنٹ
نے بطور اعتراف خدمت کے "خان بہادر" کا خطاب عنایت کیا۔
شعر و سخن کا ذوق ان کو بچپن سے تھا، کچھ دنوں مولوی وحید الدین وحید[۱] سے کو

[۱] مولوی وحید الدین وحید ۔۔۔ آباد کے رہنے والے ۔۔۔ خاندان اور ذی وجاہت بزرگ تھے
ایک بھائی مولوی رفیع الدین مرحوم لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے، میرے بچپن میں اُن کی وکالت اچھی
تھی اور مہمان نوازی میں بہت مشہور تھے۔

مولوی وحید الدین کہنہ سال اور کہنہ مشق شاعر تھے، مصحفی کا زمانہ انھوں نے پایا تھا اور ان سے
مشورۂ سخن کیا تھا، الہ آباد کے اکثر شعراء ان کے شاگرد تھے تحصیل علم کے لئے پہلی مرتبہ جب مجھکو سفر کا اتفاق
ہوا تو میں الہ آباد گیا۔ اس وقت چودہ پندرہ برس کا سن تھا وہاں پہنچکر دیکھا کہ وحید میاں کی شاعری کا غلغلہ
بلند تھا، یوں تو منشی غلام غوث خاں بیخبر، مولوی ۔۔۔ ، حضرت حکیم خلیل الدین خاں وغیرہ
بھی اپنے اپنے رنگ میں خوشگو سمجھے جاتے تھے مگر وحید میاں کا نام بہت وقار اور عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا
ایکبار وحید کے گھر میں آگ لگی، ان کو اپنا دیوان یاد آیا جو ساری عمر کی کمائی تھی، اسکے نکالنے کو کوٹھری
میں گھسے، دیوان تو ہاتھ آگیا مگر دھواں اسقدر بھر گیا تھا کہ نکلنے کو انکو راستہ نہ سوجھا، جب لوگ تلاش کرتے
ہوئے مکان کے اندر گھسے تو دیکھا کہ دیوان ہاتھ میں ہے، ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور دم نکل چکا ہے، بچپن کے
سنے ہوئے دو شعر اُن کے یاد ہیں۔

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا ۔۔۔ دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
ہم نے اپنے آشیانے کے لئے ۔۔۔ جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

ضلع الہ آباد سے جو مصحفی کے شاگرد تھے مشق سخن کی، اور باوجودیکہ ساری عمر سرکاری ملازمت اور عہدۂ جلیلہ کی ذمہ داریوں میں بسر کی، مگر چونکہ شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، ان مخصوص پر بھی شاعری ترقی کرتی رہی،

جس زمانہ میں الہ آباد میں پڑھنے کو گیا تھا ان دنوں اکبر کی شاعری کا آغاز تھا، ان کے چھوٹے بھائی اکبر حسن مرحوم اور نسبتی بھائی میر کاظم علی سے ہر وقت یکجائی رہتی تھی، اس وقت اکبر کی نظمیں اودھ پنچ میں چھپا کرتی تھیں اور ان کی شوخی اور ظرافت کا چرچا ہوا کرتا تھا، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اکبر روم و روس کی جنگ کا حال نظم کر رہے ہیں، خدا جانے انجام کو پہنچا یا نہیں، اسی زمانہ میں انھوں نے مسٹر بلنٹ کی فیوچر آف اسلام کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا جنگ روم و روس کا دلوں پر اثر غالب تھا لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور قدردانی کی،

پنشن لے کر خانہ نشین ہونے کے بعد اُن کی شاعری چمکی اور زمانے کے میلانِ عام اور جدید طرز معاشرت کی خرابیوں کا جو اثر ان کے دل پر پڑا تھا، اس کو ظرافت کے پردے میں ظاہر کرنے کی راہ انھوں نے ڈھونڈھ نکالی،

میرے دوست شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن (حالی خان بہادر جسٹس عبدالقادر) نے ایک بار مخزن میں اُنکے کلام پر بحث کرتے ہوئے خوب لکھا ہے جو انہی کے لفظوں میں سننے کے قابل ہے

> ایک دن میرے ایک طباع دوست نے جو خود ایک نامور شاعر ہیں مجھ سے پوچھا کہ تمھارے نزدیک اکبر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے، میں نے کہا کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اکبر روشن خیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا واعظ ہے اس کے نزدیک ہر مشرقی نژاد کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے، اور اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اسلئے مذموم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے

خلاف ہے، بلکہ جائز حد تک ایسی چیزوں پر ناز ان کے اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی قدر کرسکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے، یہ خیالات اس زور اور ادا خوبی کے ساتھ معاصرین میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتے،

میرے دوست نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور یہ کہا کہ تمام باتیں جو آپ نے بیان کیں اکبر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ایسی بہت سی اور بھی گنائی جا سکتی ہیں مگر آپ نے نہیں گنیں، لیکن میں ان سب کو ایک مرکب لفظ میں ادا کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اکبر لسان العصر ہے"

اکبر کے لئے "لسان العصر" کا خطاب اتنا موزوں ثابت ہوا کہ ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ان کی صدائے بازگشت پہنچ گئی، اور گورنمنٹ کے دیئے ہوئے خطاب سے انہوں نے زیادہ مقبولیت حاصل کی،

افسوس ہے کہ ۱۳۴۰ھ کو لسان العصر کی زبان بند ہو گئی اور جس منزل کی وہ دوسروں کو زاد اور راحلہ کے مہیا کرنے کی رغبت دلایا کرتے تھے، وہی آخرکار ان کو پیش آگئی، ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ان کے کلیات کی تین جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، اور سنا ہے کہ خواجہ حسن نظامی ان کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں،

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مری آنکھوں سے ہے کیفیت مستی دل پیدا　　لب ساغر سے افشا ہو رہا ہے راز مینا کا

ملا ہے ہم کو یہ مضمون روشن چشم بینا سے　　کہ چھوڑی جس نے خودبینی اسی کو سب کچھ نظر آیا

ہے صاف عیاں اس سے عیاں جوشِ جوانی
آنکھوں سے سنبھلتا نہیں مستانہ پن انکا

دیکھنے سے شوق پیدا شوق سے پیدا طلب
آفتِ دل آنکھ تھی دل آفتِ جاں ہوگیا

اک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی
وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

جو دل میں آتی ہے اے واعظو نہیں کہتے
سکوت خوب ہے لیکن تمھیں نے کیوں نہ کیا

ضبط سے کام لیا دل نے تو کیا فخر کروں
اس میں کیا عشق کی عزت تھی کہ رسوا نہ ہوا

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا
یہ طرزِ احسان کرنے کا تمھیں کو زیب دیتا ہے
مرض میں مبتلا کر کے مریضوں کو دوا دینا

حلاوت زندگانی کی کہاں اس تلخ کامی میں
خدا کا حکم ہے جینے پہ ہے جبر مزا کیسا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول
یہ بات منحصر ہے تمھاری نگاہ پر

نہ سحرِ چشمِ جاناں ہے نہ لطفِ غمزۂ ساقی
تو پھر صحنِ چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل

ترچھی چتون سے خدا جانے وہ دیکھیں مجھے کب
موت کا وقت کسی شخص کو معلوم نہیں

ادھر ہم سے بھی بات آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
اُدھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

ہو جس طرف طبیعت لازم ہے شوقِ کامل
ہر بات میں اثر ہے ہر رنگ میں مزا ہے

کچھ قدر نہ کی عہدِ جوانی کی صد افسوس
ہم رہ گئے غفلت میں یہ آیا بھی گیا بھی

میں سمجھ گیا وہی ہے مرے پردۂ نفس میں
مجھے اب تو سانس لینا بھی ہے لطفِ زندگانی

میرے حواسِ عشق میں کیا کم ہیں منتشر
مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

اسبابِ انتشارِ جنوں مجھ سے چھن گئے
مطلب یہ ہے کہ عشق و جوانی کے دن گئے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اُس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

حضرتِ منصور نا بھی کہہ رہے ہیں حق کیا
دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

اخلاقی تعلیم ظرافت کے پیرایہ میں

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

منوی کو بھی بد نہ کہئے ترغیب ہے یہ
کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ

شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن
اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالسی میں اڑ جائے
باقی مگر قوم میں ابھی ہے کچھ جوش
غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

جینا تھا جس قدر ہمیں دنیا میں جی لئے
ساغر کسی طرح کے ملے اور پی لئے
غم بھی رہا، خوشی بھی، تحیر بھی، فکر بھی
جاتے ہیں اب کہ آئے تھے ہم بس اسی لئے

عمل اُن سے ہوا رخصت عقیدہ میں خلل آیا
کوئی پوچھے کہ اُنکے ہاتھ کیا نعم البدل آیا
محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں
واہ کیا جوش ترقی ہے مسلمانوں میں

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا سوں کا — جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

بیچ بنگلہ میں سر سے آئی تھی آوازِ اذاں — جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

زوالِ قوم کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب — تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی،

صبر خودداری، دلیری، حق پرستی اب کہاں — رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے

فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب — یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

نئی تہذیب میں وقت زیادہ تو نہیں ہوتی — مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے — کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

حریفوں نے رپٹ لکھوائی جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اب تو اکبر بار ہے ہم پر نمازِ عید بھی — تم اگر رکھ سکتے ہو روزہ خدا روزی کرے

اغیار تو دنیا میں اٹھائے ہوئے سر پر — ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اٹھتا نہیں سر بھی

اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اُس بت کی کمر بھی

دیر میں مورت بھی ہے وعظ میں قبلہ بھی ہے
شیخ ہمارا خوب ہے پیر بھی ہے گرو بھی ہے

وضعِ مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلی نہ ہوئی
ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے
کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے
یہی ہے عقدہ کشائیِ قوم تو اک دن
ازار بند کو کہہ دیں گے حبسِ بیجا ہے

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

حواس مختل ہیں سمجھ پریشاں عمل میں سستی قدم میں لغزش
کبھی کوئی شوق رہتا ہے کبھی کوئی پالیسی ہے غالب
مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو کہ میں ہوں دورِ فلک میں اکبر
مقیمِ دیر و مریدِ شیخ و اسیرِ قانون و محوِ مغرب

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر
فضلِ خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

گذران کا ہوا کب عالم اللہ و اکبر میں
پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

اُس نے میدان میں سر دے کے کیا قوم کا نام
آپ بنگلے میں منایا ہی کئے جان کی خیر

پارٹی کچھ بھی نہیں جب نہ ہو ذوقِ طاعت
قوم کی خیر نہیں جب نہیں ایمان کی خیر

لطف چاہو اک بت نوخیز کو راضی کرو
نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو

لیڈری چاہو تو لفظِ قوم ہے مہمان نواز
گپ نویسوں کو اور اہلِ میز کو راضی کرو

طاعت و امن و سکوں کا دل کو لیکن ہو جو شوق
صبر پر طبعِ ہوس انگیز کو راضی کرو

معاذ اللہ غفلت باریاں یہ ابرِ مغرب کی
کوئی آلودہ آز، کوئی صرفِ جوانی ہے

ضمیمہ نمبر ۱

مراثی کا بیان

عرب میں شاعری کی ابتدا اظہارِ جذبات سے ہوئی تھی، اس لئے سب سے پہلے شاعری
ابتدا مرثیہ سے ہوئی، جو سب سے قوی تر جذبہ ہے، فارسی شاعری کی بنا و تکلف، اور دربار
تم ہوئی تھی، اس لئے اُس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی، اور اس نے شاعری کے دو
ع جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا، دفعۃً پستی کی حالت میں آگئے تاہم چونکہ آغاز میں
ز میں فطرت کا اثر پایا جاتا ہے، اس لئے قدما کی شاعری میں جا بجا جذبات کا اظہار
ی کے ساتھ نظر آتا ہے،

اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی، وہاں شروع سے مرثیہ گو پیدا ہو گئے
عادل شاہ کے زمانہ میں ایک مرثیہ گو تھا جو اردو میں مرثیہ کہتا تھا، اور بادشاہ کے
رار پر بھی اُس نے اپنی زبان کو بادشاہ کی تعریف سے آلودہ نہیں کیا جب تک جیتا
صرف مرثیے کہتا رہا،

مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے ورنہ معلوم ہوتا کہ دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ انھوں نے
پہ ہاتھ ڈالا ہے یا نہیں، محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں معتد بہ حصہ مراثی کا ہے،

ابو الحسن تانا شاہ کے زمانہ میں کثرت سے مرثیہ گو تھے جو اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے
میں سے شاہ قلی خاں شاہی تخلص بڑے اچھے شاعر تھے، میر حسن اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ

کہ شائقین ان کا کلام ہاتھوں ہاتھ دکن سے ہندوستان لایا کرتے تھے، دکن کے شعراء میں سب سے پہلے ولی کا دیوان دلی میں آیا ہے، اور وہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے،

میر، مرزا کے زمانہ میں میاں مسکین مرثیہ گو تھے، سودا نے ان کا نام شہر آشوب میں لیا ہے، اس وقت تک عموماً مرثیے چھ مصرع ہوا کرتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جو ان کے دیوان میں موجود ہے، اور اردو میں مرثیہ کی وسعت و ترقی کا پہلا قدم ہے، کیونکہ چو مصرع میں اول سے آخر تک ایک خاص قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ہر قسم کے مطالب ادا نہیں کئے جا سکتے تھے،

اسی زمانہ میں میاں سکندر ایک مرثیہ گو گذرے ہیں، ان کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، ان کے بعد میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، میاں فصیح کا نام لیا جاتا ہے، مگر اس وقت تک مرثیے کم و بیش بیس تیس بند کے ہوتے تھے، اور ان میں حزن و غم کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا، اور شاعری کے دربار سے ان کی کچھ عزت و حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی، اس زمانہ کی یہ مثل مشہور ہے "بگڑا شاعر مرثیہ گو، اور بگڑا گویا مرثیہ خواں"

جہاں تک معلوم ہوا ہے، سب سے پہلے میر مظفر حسین ضمیر نے اس میں جدتیں پیدا کیں اور جس نظم کی بنیاد محض درد و غم پر تھی اس میں گھوڑے، تلوار وغیرہ اسلحۂ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے، سراپا ایجاد کیا، واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، لڑائی کے داؤں پیچ اور اس کے معاملات کا خاکہ کھینچا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز خوانی کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی،

میر انیس و مرزا دبیر نے اس بنیاد پر ایک بلند و مستحکم عمارت کھڑی کر دی، بیان کرنے

کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیئے، ایک ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کرکے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا، مناظر قدرت کی ایسی تصویریں کھینچیں کہ فارسی شاعری میں بھی اس کا نمونہ مشکل مل سکے گا، اسی طرح جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی کرکے اردو شاعری کو پستی سے بلندی پر پہنچا دیا،

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حصہ کو اردو شاعری سے نکال لو تو پھر اس میں سوا خدوخال اور گل وبلبل کے کچھ نہیں رہ جاتا، اور اردو شاعری کی تاریخ ناکمل رہیگی، اگر اس میں اس کا ذکر نہ کیا جائے،

مرزا سلامت علی دبیر

مرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، مرزا غلام حسین والد کا نام تھا، کہتے ہیں کہ ۱۲۱۸ھ کو دلی میں پیدا ہوئے چھ سات برس کی عمر میں باپ کے ساتھ لکھنؤ آئے، فارسی اور عربی کی کتابیں لکھنؤ کے نامور علما سے پڑھیں،

حیات دبیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ درسی کتابیں ان کی لکھی ہوئی تھیں، مولوی غلام ضامن، اور مرزا کاظم علی اخباری وغیرہ علماء کے شاگرد تھے، اور استعداد علمی قابل رکھتے تھے،

شعر وسخن سے قدرتی مناسبت تھی، میر مظفر حسین ضمیر اس زمانہ کے مرثیہ گو شاعروں میں بہت ممتاز تھے، ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہوتے ان کو بھی ذوق پیدا ہوا، اور یہ اُن کے شاگرد ہو گئے،

جو کچھ استاد سے پایا اُسے بقول آزاد بہت بلند اور روشن کرکے دکھایا، جو مرثیے

جس تیس بند سے آگے نہ بڑھتے تھے، ان کو دو ڈھائی سو تک پہنچایا، شوکت الفاظ مضمون کی آمد، اُس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنایے، المناک و دلگداز انداز جو مرثیہ کی اصلی غرض ہے، ان وصفوں میں وہ میر انیس سے ممتاز ہیں،

کچھ شک نہیں، کہ میر انیس زبان کی صفائی بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتے، مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں، یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے ایسے عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک اُن کے حریفوں کا طائر وہم بھی پرواز نہیں کر سکتا، بقول مولانا شبلی خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں،

مگر میری رائے میں اس فیصلہ کا یہ مطلب نکالنا خطرناک غلطی ہے کہ مرزا دبیر زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری ہیں، یا میر صاحب قوت متخیلہ میں بالکل ہیٹے ہیں، اور ان کے ہاں عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں نہیں ہیں، ایسا خیال کرنا ان دونوں بزرگوں کے دامن کمال پر دھبہ لگانا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہر شاعر کا رنگ طبیعت، انداز بیان اور طرز مذاق مخصوص قسم کا ہوا کرتا ہے ایک چیز ایک کے ہاں افراط سے ملے گی، دوسرے کے یہاں اُس سے کم یہی حال میر و مرزا کا بھی ہے، اس سے نہ ان کی تنقیص کی جا سکتی ہے نہ اُن کی، ع

ہر طرز میں جو خوب ہے وہ خوب ہے

مرزا صاحب نے چوہتر برس کی عمر پائی، چودہ پندرہ برس کے سن سے مرثیے کہنے لگے، اس پچاس ساٹھ برس میں کم سے کم تین ہزار مرثیے لکھے ہونگے نوحوں اور رباعیوں کا

کچھ شمار نہیں، ۳ محرم ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی، اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے،

صبح

گلگونۂ شفق جو ملا چہرۂ صبح نے | اسپند مشکِ شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیٔ طورِ صبح نے | ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافورِ صبح نے

لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہرِ درخشاں کے چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح | سلطانِ صبح نے کیا قصد اذانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتانِ صبح | چرخِ بہار میں پہ گیا خطبہ خوانِ صبح

منہ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرمِ سجدہ عیسی و خورشید ہو گئے

آیا جو تیغ روز لئے شاہِ نیمروز | ماہی شکار شیر سوار جہاں فروز
باندھے کمر میں خنجرِ بیضائے کینہ سوز | پھر دیو ہفت سر ہوا صیدِ عقابِ روز

مہتاب لشکرِ شہِ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سرِ انجم پہ پھر گیا

بڑھ کر نقیبِ نور پکارا سحر سحر | ذروں میں نور بھر در آیا قمر قمر
فرمانِ نور بدر کو پہنچا بدر بدر | لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر

برقع جو اٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبحِ ملمع نقاب کا

دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

پید شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیِ پرِ طاؤس شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

یوسفؑ غروبِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا — یعنی غروبِ ماہِ تجلّی نشاں ہوا
یونسؑ دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا — یعنی طلوع نیرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیمؑ اور ید بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیبِ دریدہ تھا — یا چہرۂ مسیحؑ کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ چرخ کا اشکِ چکیدہ تھا — یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہئے نہ مہر صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امید اہلِ بیت کا گھر بے چراغ تھا

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیر صبح — محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیر صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیر صبح — ہر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیر صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا — پھر مشکِ شب جہاں سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا — باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کے ذرّوں کے نامے میں

گرمی کی شدّت

وہ دھوپ کہ مرغانِ ہوا کرتے ہیں نالا — بس ہاتھ دھرا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا — اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
ہر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہِ دیں پر

نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورتِ عنقا — بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لبِ دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا — پر اوجِ امامت کا ہما رن میں ہے تنہا
کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس کڑی ہے

دوسرے موقع پر،

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب — گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغِ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب — خطِ غبار سے ہے یہی ابرِ سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی — رنگت ہے برجِ حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی — حدّت ہے موج موج میں تیرِ شہاب کی

فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی
آتش بدن بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوزِ جگر سے مردمِ آبی ہیں نالہ کش
نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نہ دو نایاب ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
تر دامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

آمد آمد کا کوکبہ

برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی ہے آمد
ہر مور پہ لرزہ ہے سلیماں کی ہے آمد
فرعونیوں پہ موسئی عمراں کی ہے آمد
تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد
جن سیر کو نکلے تھے یہ رستے سے مڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اڑے ہیں
رن میں پسر فاتح خیبر کی ہے آمد
صف گرتی ہے صف پر شہ صفدر کی ہے آمد
تاج شرف و فخر سکندر کی ہے آمد
شاہ شہدا سبطِ پیمبر کی ہے آمد
پیشانی جن و ملک اب فرشِ زمیں پر ہے
چترِ سرِ اقدس پر جبریلِ امیں ہے
خورشید ہے دن کو مہ نو شرم سے گھٹ کے
اغلب ہے کہ سیدھا فلک رکھ ہوا الٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی جھک کر
اک سونے کا نگ بنگئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہوا ہے

پیارے ہیں کیا شہر بدر چاند ہوا ہے

فتح و ظفر و نصرت و شمشیر دو سر ایک
قہر و جلال و رعب شہ جن و بشر ایک
مولا کی سپر اور فلک ہفت سپر ایک
افضال خدا اور نظر فیض اثر ایک
ہیبت ہے یہ بندے کی ویا خوف خدا ہے
سر خود تن دل سینے سے جاں تن سے جدا ہے

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم
وہ سکتہ ہے دہ گردہ عشرہ دہ تلاطم
ہر برج بھی گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم
جس طرح سے آندھی میں جدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموس کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

عباس نامدار پانی لانے کو جاتے ہیں،

عباس جبکہ جانب باغ جناں چلے
شانے پہ لاکھ شان سے لیکر نشان چلے
زوجہ نے پوچھا اے مرے والی کہاں چلے
بولے جہاں سے اب نہ پھرینگے وہاں چلے
اب آخری وداع کی باری نہ آئیگی
آئی ہے سب کی لاش ہماری نہ آئیگی

عباس سے سنا جو یہ اس تشنہ کام نے
دنیا سیاہ ہو گئی آنکھوں کے سامنے
اک آہ کی کمر کو پکڑ کے امام نے
پردہ اٹھایا بازوے شاہ انام نے
جھک کر ہلال برج فلک سے نکل گیا
نور نگاہ تھا کہ پلک سے نکل گیا

پاس ادب سے مجرے کو سب دور دور آئے
عفو قصور کے لئے کبر و غرور آئے

غل پڑ گیا جلو کے لئے فوج نور آئے ہاں لاؤ مرکب دو رکابہ حضور آئے
آیا سجا سجایا تگاور جناب کا
یا کھر کرن کے تاروں کی زین آفتاب کا

بجلی سے لگ کے گردن توسن پہ یا علی اک جست میں سوار ہوا حق کا وہ ولی
فی الفور نور طور کے معنی ہوئے جلی بجلی جلانا بھول کے خود تنک سی جلی
ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرم عناں ہوا
صرصر کی سانس رک گئی جب یہ رواں ہوا

پابوسی کو رکاب کا حلقہ دہاں بنا اور اس دہن میں پلہ مبارک زباں بنا
پھر آستان خانۂ زیں آسماں بنا عرش جلیل زین تجلی نشاں بنا
آنسو مگر نہ تھمتا تھا اُس راہوار کا
یعنی مجھی پہ آئے گا لاشہ سوار کا

دیکھنے لگا جو ہاتھ تصور عناں پر بگڑا بنا کے منہ کہ نہ کھیل اپنی جان پر
بولی زمیں کدھر تو کہا آسمان پر پوچھا جو آسماں نے کہا لامکان پر
یہ کہہ کے فکر و وہم کی حد سے گذر گیا
سایہ ہوا سے پوچھ رہا تھا کدھر گیا

غل ہر مکاں سے وہ کا تا لامکاں اٹھا ایسا جھکا کہ نہ پھر سر آسماں اٹھا
شعلہ علم کے نور کا اک ناگہاں اٹھا جنگل میں دھوپ چل گئی کوسوں دھواں اٹھا
انسان کیسے جان جنوں کی نکل پڑی
گاو زمیں یہ تڑپی کہ مچھلی اچھل پڑی

تلوار کی روانی ملاحظہ ہو،

نکلی غلاف نو سے تف سیر جوہری
یا آگے دست بوس سلیماں ہوئی پری
یا حجلے سے عروس نے کی جلوہ گستری
یا ہے یہ شاخ میوۂ عوبن ہری بھری
اس ہاتھ سے مرادیں تھیں جو جو وہ مل گئیں
باچھیں خوشی سے تیغ کے قبضہ کی کھل گئیں

شاخ نیام سے ہوا اس طرح پھل جدا
پیروں کے قد سے جیسے جوانی کا ہو جدا
ہستی جدا زمیں پہ تڑپ کر اجل جدا
خنجر جدا فلک پہ گرا اور زحل جدا
غل تھا کہ اب معاملۂ جسم و جاں نہیں
وہ تیغ برق دم کا قدم درمیاں نہیں

سایہ بھی صاف تیغ سے ہو کر جدا ہوا
مطلب یہ کہ پانی سے روغن جدا ہوا
تھا نہ رنگ چہرۂ دشمن جدا ہوا
گردن سے سر تو روح سے بدن جدا ہوا
پیہم صدا دلوں سے دھڑکنے کی آتی تھی
آواز بوق اٹھتی تھی اور بیٹھ جاتی تھی

سیدھی ہوئی جو تیغ تو لشکر الٹ گیا
میداں سے ہاتھوں کھینچے سروں سب کا بٹ گیا
سینے پہ تھے زور کو واں سے بھی گھٹ گیا
مانند نان خوف سے سینہ سمٹ گیا
بولی یہ تیغ دم سر اعدا پہ لوں گی میں
برش پکاری تو بہ ٹھہرنے نہ دوں گی میں

پڑھتی ہوئی زباں سے یہ لا فتا چلی
روشن نگاہ کینے کو آگے قضا چلی
بائیں کو تھر داہنے جانب بلا چلی
بالکل چراغ عمر ہوئے گل ہوا چلی

کھینچ نہ تیغ دولھا کو برچھی لگائی تھی
رن پر حسنؑ کی آہ نے بجلی گرائی تھی

چل وزن میں تھا پھول تجلّی میں نخلِ طور — گرمی میں محض نار تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ چال پری قبضہ چشمِ نور — خود مہر آب زہر تڑپ قہر شور صور
یوں دفعۃً زمیں سے گئی آسمان پر
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان پر

پھر تو بکار تھی یہ ادھر وہ اُدھر گرا — وہ پنجہ وہ ہاتھ وہ خود اور وہ سر گرا
بن بن کے برق سایۂ تیغِ ظفر گرا — واں مورچہ سے باپ ہٹا یاں پسر گرا
گر گر کے سر یہ رن میں برابر طپاں ہوئے
جو رن میں سرزمین کے معنی عیاں ہوئے

پھر دل پہ مردنی کی طرح تیغ چھا گئی — ہر استخواں میں مثلِ تپِ دق سما گئی
اعجازِ خاکساریِ حیدر دکھا گئی — مانند خاک ناریوں کے تن جلا گئی
سب کے گلوں سے ملتی تھی لیکن رکی ہوئی
جو سر پہ تھے کہ بوجھ سے خود تھی جھکی ہوئی

آتے تھے جو ڈرا تو عجب تیغِ تیز کو — سر سے گری جدا کیا پائے گریز کو
اپنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ ریز کو — برق و شرر نے نذر کیا جستِ تیز کو
بو گل نے رنگ لالے نے سرعت ہوا نے دی
یہ ہدیہ کیا ہے اپنی نیابت قضا نے دی

قربانِ برق و بارقۂ تیغِ شعلہ تاب — موتی کی آب و تاب سمندر کا پیچ و تاب

خود نوح خود سفینہ و خود ماہی و خود آب — سرگوشیاں فرات میں کرنے لگے حباب
ظرفِ تنک میں تھی نہ جگہ آب و تاب کی
بندھتی تھی اور ٹوٹتی تھی مٹھی حباب کی

کانٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو — پاؤں میں کجروی کو سروں میں غرور کو
سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو — نیت میں معصیت کو طبیعت میں ڈر کو
ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

عباسؑ فرات پر تو پہونچ گئے مگر پانی پینے سے وفاداری روکتی ہے؛

چلو بھر فرات سے سرکا کے آستیں — عبرت سے دیر تک اُسے دیکھا کئے وہیں
پھر لائے امتحاں کیلئے ہونٹوں کے قریں — سینہ میں دل تڑپ کے پکارا نہیں نہیں
گو مہرِ فاطمہ ہے یہ مجھ پر حرام ہے
ہفتم سے فاطمہ کا پسر تشنہ کام ہے

پانی جو بے حسینؑ کے منہ سے لگائیگا — ہے ہے وفا کا نام ابھی ڈوب جائیگا
اس وقت آبرو جو گئی پھر نہ پائیگا — یہ روز اب زمانے میں کاہے کو آئیگا
حضرت کہاں، فرات کہاں، کربلا کہاں
تا عصر خاتمہ ہے یہ دکھ، یہ بلا کہاں

غازی نے دل کے مشورے پر مرحبا کہا — دریا سے مڑکے پیاسوں کا سب ماجرا کہا
کاندھے پہ مشک بھر کے رکھی یا خدا کہا — چلتے ہوئے اجل نے پیامِ قضا کہا
ہے ہے نصیب پیاسوں کا رستے میں پھر گیا

سقۂ حرم کا فوج میں طوفاں کے گھر گیا

علی اصغر کا پیاس کے مارے حال بیحال ہے،

سر ننگے گرد بچھونے کے سب کنبہ ہے بہم — پھیلائے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دم بدم — چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو — للہ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو — نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو
اکبر کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہوں گے راہ میں

مظلوم کربلا شیرخوار بچہ کو لیکر پانی مانگنے کے لئے جاتے ہیں،

ہاتھوں پہ لے کے اس کو چلے شاہ اتقیا — اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
نکلا ہی دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا — اصغر پہ ماں نے ڈالدی اجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرۂ پر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفیٰ — لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا — منت بھی گر کروں گا تو وہ دیں گے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے ۔ چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے ۔ چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گر میں بقولِ شمر و عمر ہوں گناہگار ۔ یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصوروار
شش ماہہ بے زبان نبی زادہ شیر خوار ۔ ہفتم سے سب کے ساتھ یہ پیاسا ہے بیقرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زبان ہے تمہیں کچھ خیال ہے ۔ در نجف ہے بانوئے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے ۔ پیغمبر کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علی کا تم سے طلبگار آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری ہے ثواب ہے

پھر مونھ بے زبان کے چہرے سے جھکا کے ۔ رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر ۔ سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

میر ببر علی انیس

میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن کے پوتے اور میر ضاحک کے پر پوتے تھے، ان کی بلکہ

ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی، اور انھیں بھی اس پر ناز تھا، ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سے پڑھیں، اور ضروریات فن سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد ہوئے، اور جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا، اُس وقت سے تمام عمر اسی میں صرف کر دی،

بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیئے، ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کرکے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کے لئے ایک نیا میدان صاف کر دیا، اور زبان کا ایک معتدبہ حصہ جس کو اب تک شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا، اور جو محض اہلِ زبان کی بول چال میں محدود تھا، اس کو شعراء سے روشناس کر دیا، بقول مولانا حالی کے اردو شاعری میں جو بار راکد کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا،

مولوی محمد حسین آزاد نے آبحیات میں ٹھیک لکھا ہے کہ "شاہنامہ کے ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں، انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیئے، ایک مقرری مضمون کو سینکڑوں بلکہ ہزاروں رنگ سے ادا کیا، ہر مرثیہ کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا، اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا، اور اس پر کیا منحصر ہے، صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شامِ غریباں کی اُداسی، کبھی رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے، غرض جس حالت کو لیا ہے، اُس کا سماں باندھ دیا ہے"

میر امجد علی اشہری نے حیات انیس میں اور مولانا شبلیؒ نے موازنۂ انیس و دبیر میں ان کے شاعرانہ کمال کو جس جس رنگ سے ظاہر کیا ہے، وہ دیکھنے کے قابل ہے،

میرانیس کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا ہے، ان کی ابتدائی مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ کثرت سے متداول تھے، اور شعراے تکلف استعمال کرتے تھے، وہ ان کے ہاں بھی ابتدائی کلام میں پائے جاتے ہیں، پھر جس قدر زمانہ گذرتا گیا ان الفاظ اور ترکیبوں کو چھوڑتے گئے،

میرانیس نے تہتر برس کی عمر پائی، غدر سے پہلے ان کو لکھنؤ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، غدر کے بعد اوّل اوّل نواب قاسم علی خاں کے اصرار سے عظیم آباد تشریف لے گئے، اور وہاں کی مجلس عزا میں اپنی شاعری کے زور اور بے مثل پڑھنے سے قیامت برپا کردی، پھر ایک مرتبہ سید شریف حسین خاں کی تحریک سے حیدرآباد تشریف لے گئے، نواب تہور جنگ بہادر نے ان کی شان کے موافق خیر مقدم کیا، سامعین کی مجلسوں میں یہ کثرت ہوتی تھی کہ صدہا لوگوں کو سننے کی حسرت رہ جاتی تھی،

میر صاحب کا کلام جس طرح لاجواب ہے، ان کا پڑھنا بھی بے مثل تھا، ان کی آواز، قدوقامت، صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی، ان کا قاعدہ تھا کہ پہلے خلوت میں بڑا آئینہ سامنے رکھ کر بیٹھتے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے، وضع، حرکات سکنات اور بات بات کو دیکھتے اور آپ ہی اس کی موزونی و ناموزونی کو اصلاح دیتے تھے، آخرکار ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی، اور سبزی منڈی میں اپنے ایک مکان کے اندر مدفون ہوئے،

نور کا تڑکا

طے کرچکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح

گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور — یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور — خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
وہ ان زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سرخیِ شفق کی ادھر چرخ پر بہار — وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار — پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں :

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار — تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار — کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

ایک اور موقع پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیبِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

گرمی کا سماں

وہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
اک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار　　کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت،

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت　　پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت　　سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
داغ سیاہیاں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
تو سنے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر　　صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر　　لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

گھوڑے کی جست و خیز

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند　　سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُس کے جوڑ بند
سم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند　　نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ پھر گیا
اترا براق بن کے پری ہو کے اڑ گیا
جرأت میں شکلِ شیر تو ہیکل میں پیل تن　　پوئی کے وقت کبکِ دری جست میں ہرن

بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن — بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں تھی زلف حور سے خوشبو ایال کی — دیکھیں تو ہیں بدئیں سدا بال بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی — غصے میں جست شیر کی، شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن براق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصے میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے — بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے — تھم تھم کے کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
وہ منہ تھا کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر

تلوار کی روانی

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دو سر گری — کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ کبھی فرق پر گری — سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں پہ مثل کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر — بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں لہو کی نہر
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کے جس کے نہیں لہر — اتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر

زخموں سے جسم ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندانِ مار ہیں

غل تھا کہ ورچمکتی ہوئی آئی یہ گری ۔ برچھی سے اڑ گئی وہ سناں یہ گرد گری
ترکش کٹا کمان کیا پانی سے زرد گری ۔ یہ سر اٹھا وہ خود اڑا یہ زرہ گری

آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہر الٰہی اسی طرح

ہر بات میں اڑا کے کلائی نکل گئی ۔ کوندی گری زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی ۔ مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی

چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

دیگر

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب ۔ آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر کہ آگیا تاب ۔ تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب

جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی ۔ غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابرِ تر بھی خزاں بھی بہار بھی ۔ تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی

پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

ہنگامۂ جنگ

نقارہ دغا پہ لگی چوب یک بیک
اٹھا غریو کوس کہ ہلنے لگا فلک
شیپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک
ترنا پھونکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک

شور دہل تھا حشر بپا تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد

گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اس طرف اتر گئے دریا کو تیر کے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ کانپتا تھا وادیِ نبرد
تھا دن بھی زرد دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا کی گرد

اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں

حملہ کا زور شور

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے
اڑنے لگے شرر دم خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے

طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

جنگل میں بھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں　　تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
غار اژدروں سے چھٹ گئی نیزہ دستِ نیستاں　　برپا تھا بر و بحر میں اک شورِ الاماں
مانندِ موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک نہنگ کا پانی میں آب تھا

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر　　تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں ادھر
چکر میں بھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور　　پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارہ کو چھوڑ کے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر　　شیروں سے دشت گرگ سے بن اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر　　اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن میں ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیئے پر کانپ کانپ کے

دو حریفوں کی معرکہ آرائی

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں　　چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں　　ڈانڈا ہے ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر　　قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر

دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر — جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھائے جب — قبضہ میں لی کمانِ کیانی بصد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب — تیوری چڑھائی قاسمِ نوشاہ نے بھی تب
تیرِ نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اتر گیا

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بدخصال — جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ حسنؑ کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال — اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اس کی سپر سے ڈھال
وہ جھڑ لگی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیئے سر پر سمند کے

عباسؑ نامدار نے پہلو سے دی صدا — ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا — سنتے ہی بس فرس کو فرس سے کیا جدا
گھوڑا ابھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

امام کی بے کسی اور دشمنوں کا نرغہ

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے — ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکرِ اعدا میں صف آرائی ہے — یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے

برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مار لو پیاسوں کو ہے شور ستمگاروں میں
زخمی بازو ہیں، کمر خم ہی، بدن میں نہیں تاب
ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہی پاؤں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہیں آنکھیں ہیں پر آب
تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کے جواب
شدت ضعف سے جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گذر جاتے ہیں
گیسوئے آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے
شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے
لاکھوں آفت میں ہی اک جان دل آزاروں سے
شکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کے فرصت نہیں دم لینے کی
خون میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے
ہے جبیں چاند سی پر نور مگر زخمی ہے
سینہ سب تیروں سے چھنتا ہے کمر زخمی ہے
تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضرب شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں
برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے
مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے
بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے
گرد زہرا کی جائی گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دوجہاں گرتے ہیں

مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اتنی بات صاف کہنی چاہیے کہ حضرات اہل بیت اطہار

رضوان اللہ علیہم اجمعین، کی اصلی شان دکھانے میں مرثیہ گویوں نے بڑی کمی کی ہے، اکثر وقائع و بیانات کو جزع و فزع و اضطراب تک پہنچا دیا ہے بیبیوں کی شان اس پیرایہ میں لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے یہ نہایت بزدل اور خوف زدہ، دکھ کی ماری آتی تھیں، نوحہ و بکا ہے، حالانکہ وہ پاک بزرگ ان کمزوریوں سے بہر حال دور تھے، مدعا عوام کو رلانا ہوتا تھا، اس نے مراثی کا پایہ بہت پست کر دیا ہے، شاعری میں جان پڑی ہو، مگر اخلاقی و مذہبی پہلو مفقود ہو کر رہ گیا، شہادت نامہ خواہ کتنا ہی موثر ہو گیا، مگر وقائع نگاری کا خون ہو گیا،

ضمیمہ نمبر ۲

اس کتاب میں میرے والد بزرگوار کا ذکر کئی جگہ آیا ہے، نیز اس لئے کہ وہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے مورخ تھے، اُن کے حالات زندگی کے بیان کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں، جہاں تک ممکن ہے اختصار کے ساتھ لکھونگا تاکہ جو حالات مجھے معلوم ہیں وہ اُن کی اکثر تصنیفات کی طرح ضائع نہ ہوجائیں،

مرحوم کا اسم گرامی مولوی سید فخرالدین، اُن کے والد کا نام مولوی سید عبدالعلی۔ سادات قطبیہ حسینیہ کے چشم و چراغ تھے، نسب کا اتصال امام حسن مثنیٰ خلف الصدق سبط اکبر امام حسن مجتبیٰ سے ہوتا ہے، حسن مثنیٰ اپنے عم نامدار شہید کربلا امام حسینؑ کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ صغریٰ سے بیاہے ہوئے تھے، اسی لحاظ سے اس خاندان کے لوگوں کو حسنی حسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس خاندان میں سید شاہ علیم اللہ، سید محمدؒ نجی، سید شاہ لعلؒ، شاہ ابوسعیدؒ، شاہ محمدؒ واضح، مولانا قطبؒ الہدیٰ محدث، مولانا محمد ظاہرؒ، مولانا خواجہ احمدؒ، مولانا ضیاءؒ النبی، سید مصطفیٰ اور سب سے زیادہ نامور حضرت سید احمد شہیدؒ بڑے زبردست علما و مشائخ گذرے ہیں

والد مرحوم کی ولادت تکیہ شاہ علیم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ میں ہوئی، کم سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ ناگور تشریف لے گئے، جہاں ان کے والد ماجد تحصیلدار تھے، وہیں فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی سید محمد طٰہٰ نصیرآبادی اور حکیم احمد جان دہلوی سے پڑھیں، تیرہ برس کا سن تھا کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا، سرکار نے اُن کی خدمات جلیلہ پر نظر کرکے کچھ وظیفہ تعلیم مقرر کردیا، جو عرصہ تک والد مرحوم کو ملتا رہا،

ناگور سے آنے کے بعد اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر مرحوم کے دامن تربیت میں پرورش پائی اور شرح وقایہ تک اُن سے اور مولانا رحیم اللہ بریلوی سے وطن میں رہ کر تعلیم پائی، اپنے نانا کے وفات پانے کے بعد لکھنؤ تشریف لائے، اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے شروع کیں، شعر و سخن کا ذوق ناگور میں حکیم احمد جان کی صحبت میں پیدا ہوا تھا، پھر اپنے نانا سید محمد ظاہر کی صحبت میں ترقی ہوئی، وہ علمی فضل و کمال کے ساتھ فارسی و اردو خاص کر بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے لکھنؤ پہنچ کر وہ شوق تازہ ہو گیا، شیخ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہوئے اور تین برس مسلسل لکھنؤ میں رہ کر تمام درسی علوم و فنون کی تحصیل کی، اور خطاطی میں بھی کمال پیدا کیا، نسخ و نستعلیق و شفیعہ بہت اچھا لکھتے تھے، اور اُن کے شکست میں عجیب طرح کی شیرینی تھی،

لکھنؤ سے وطن گئے اور چند روز وہاں رہے، اس کے بعد وجہ معیشت حاصل کرنے کو باہر نکلے، چند روز راجپوتانہ میں، چند روز ساگر میں رہے، ساگر میں مہتمم بندوبست کے اجلاس میں نائب سررشتہ دار ہو گئے تھے، مگر شاید سال ڈیڑھ سال کے بعد کسی بات پر برہم ہو کر نوکری چھوڑ دی، اور وطن چلے آئے، کچھ دنوں رہ کر حیدرآباد روانہ ہو گئے،

اُس زمانہ میں ہر جگہ ریل نہیں تھی، یہاں سے حیدرآباد تک کہیں گھوڑے پر، کہیں ریل پر، کہیں بہلی اور تانگے پر، شاید بیس دن میں امراوتی پہنچے تھے، حیدرآباد میں چند روز کی امیدواری کے بعد کسی اسکول میں صدر مدرس مقرر ہو گئے، اور تقریباً آٹھ برس تک مختلف اضلاع میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے،

ضلع بدر میں سید محمود اصفہانی حریف تخلص سے شناسائی ہوئی، یہ وہاں صدر مدرس تھے اور وہ صدر تعلقہ دار (کمشنر) کے میر منشی تھے، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اُن سے

فارسی زبان اور محاورے کی تصحیح کی اور جب تک وہاں رہے ان کو اپنا کلام دکھاتے رہے
کیا، آخرش بوجہ بُعدِ مسافت کے ترکِ تعلق کر کے وطن آ گئے اور دو ڈیڑھ سال وطن
میں رہ کر بھوپال تشریف لے گئے وہاں بھی چند سال رہے، جب وہاں سے آئے تو عرصۂ دراز
تک کہیں نہیں گئے، مرحوم کی عادت تھی کہ رخصت لیکر بہت کم آتے تھے، جب کہیں رہتے تو
دل گھبرا جاتا تھا تو نوکری چھوڑ کر چلے آتے تھے،

عرصۂ دراز تک وطن میں رہتے رہتے جب دل گھبرایا تو ٹونک تشریف لے گئے، وہ
بھی مثل وطن کے تھا، اکثر اعزہ دو دو چار چار برس سے رہتے رہتے وہیں کے ہو گئے تھے، نواب
ابراہیم علی خاں نے عہدۂ طبابت سے تنخواہ مقرر کر دی، دو ڈیڑھ سال رہنے کے بعد پھر
وطن چلے آئے، اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے. وطن کے گوشۂ عزلت میں زندگی پوری
کر دی، بیعتِ طریقت اپنے پھوپھا مولانا سید خواجہ احمد علیہ الرحمہ سے کی تھی، اُن کی طرف سے
نیز اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر کی جانب سے خلیفہ بھی تھے، اور ذکر و شغل خاندانِ نقشبندیہ
کے طریقے پر کرتے تھے، مگر پیری مریدی نہیں کرتے تھے،

مزاج میں خاموشی، متانت، حلم، اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی، برادرانہ
جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں تھا، ہر شخص سے دوست ہو یا دشمن اچھی طرح سے
ملتے اور کسی سے پرخاش نہ رکھتے، صبر و قناعت کی صفت اُن کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی
تمکنت اور غرور اُن کو چھو نہیں گیا تھا، کوئی بیمار یا کوئی رات کے وقت آتا تو گھر سے
باہر نکل کر اس کا حال پوچھتے، اگر وہ کسی مریض کے دکھانے کو لے جانا چاہتا تو اسی وقت
اس کے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اسکو دیکھتے اور دوا بتاتے تھے،

ایک زمانہ میں طاعون نہایت شدت سے پھیلا ہوا تھا. گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہوئے

تھے، مرد و عورت، لڑکے، بوڑھے سب جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے تھے، ان جھونپڑیوں میں خود جاکر بیمار پرسی کرتے تھے۔ دوا بانٹتے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں بھی حاضر تھا مجھے ساتھ لیکر تشریف لے گئے، اور دیر تک گنواروں کو سمجھاتے اور دوا بانٹتے رہے، اس تنگ جھونپڑی میں دیر تک مریض کے پاس کھڑے رہنے سے جو تکلیف مجھے ہوئی تھی وہ آج تک یاد ہے۔

طبیعت میں کاہلی نام کو نہ تھی، جو کام جس وقت کرنے کا ہوتا اسی وقت انجام کو پہنچاتے۔ ایک شخص نبض دکھا رہا ہے، اس کے مرض کی تشخیص کرکے نسخہ لکھ کر دیا، ایک نے کہا مجھے تعویذ لکھ دیجئے، اس کو تعویذ لکھ کر دیا، ایک کھڑا ہے کہ اس طرح پر مجھے غزل لکھ دیجئے، کوئی کسی کی ولادت یا وفات کی تاریخ یا شادی کی منظوم تہنیت لکھوانے آیا ہے، وہ ہر ایک کی فرمائش پوری کر رہے ہیں، پڑھنے والے کتاب لئے بیٹھے ہیں، ان کے سبق شروع ہوگئے، گھر میں ان کا خلوت خانہ علیحدہ تھا، وہاں صرف ایک مشغلہ تھا کتب بینی اور تصنیف۔ تالیف تصنیفات کا ایک دفتر بے پایاں تلف ہو چکا ہے، جو نام مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں:

تاریخ نگمیل کھنڈ اردو، ناگور میں لکھی تھی، جمعیت زبان اردو، اردو صرف و نحو کی بسیط کتاب ناگور یا ساگر میں لکھی تھی، جوش دل اردو کا پہلا دیوان، پریم راگ بھاشا کا دیوان، دیوان فارسی اور رقعات فخریہ دونوں حیدر آباد میں لکھے تھے، کیا عجب ہے کہ ان دونوں کی نقلیں ان کے حیدر آبادی شاگردوں کے پاس ہوں، دیوان خیالی تیسرا دیوان اردو کا جس کو بھوپال میں ترتیب دیا تھا۔ مثنوی بہار تسلیم، حیات فخر، فغان فخر تینوں مثنویاں لکھنؤ میں یا وہاں سے آنے کے بعد وطن میں لکھی تھیں، ان میں سے فغان فخر ذو بحرین تھی، ان کے مسودے میرے بچپن تک موجود تھے، فغان فخر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

یاس ہے اب عشق کی تاثیر سے پھر گیا دل نالۂ شبگیر سے

آہ سے جاتا رہا بالکل اثر | کرتی ہے اب نفع کے بدلے ضرر
حسن کے گل سے اُڑی بو مہر کی | لذتِ الفت نہیں باقی رہی
جل گئے پروانہ کے مانند ہم | خاک میں اب تک وہی ہی سوزِ غم
وحشتِ دل کا وہی ہی زور و شور | ہو گئی شیرینی جان ہائے شور
آتشِ جاں سوز ہے یہ بد بلا | پانی سے بجھتا نہیں اس کا جلا

بے سلسلہ

جوش میں وحشت کے جب آتا خلل | تھام کے دل پڑھتا یہ آخر غزل
عادتِ مشقِ ستم اچھی نہیں | اتنی بھی غفلت ستم اچھی نہیں

چشم تھی تر آہ کا لب پر دھواں | نبض تھی ساقط دل مضطر تپاں
لوٹتا تھا خاک پہ بسمل کی شکل | پھرتی تھی پر آنکھ میں قاتل کی شکل
جلتا تھا اُس آگ میں جس کا دھواں | دیدۂ ظاہر سے رہتا تھا عیاں
برق کی صورت کبھی آتی ہنسی | ابر کے مانند میں روتا کبھی
ناخنِ وحشت سے تھا سینہ فگار | فاش تھا رازِ دل و جاں بے قرار

بہارِ تسلیم کا رنگ ملاحظہ ہو

مدحِ سخن

ہے لطفِ سخن نیا ہمیشہ | یہ بات ہے شوق زا ہمیشہ

ہے مخزنِ راز ہے لاریب — کہتے ہیں اُسے خزانۂ غیب

گلزارِ سخن سدا ہے باقی — فانی ہے زبان صدا ہی باقی

کرتی ہے کرشمہ شکلِ دلدار — آغوشِ سخن میں بچۂ افکار

شبدیزِ سخن ہے کلکِ شاعر — ہے ملکِ کلام ملکِ شاعر

گلزارِ خیال ہو سخنور — رکھتا ہے بہار تازہ و تر

حالتِ فخر کا نمونہ

ہو گئی باہم جو دونوں کی نظر — آئی آفت اک بیچارہ کے سر

ہاتھ سے جاتا رہا دامانِ ضبط — دل کی وحشت نے بگاڑی شانِ ضبط

راہ راہ اپنی گئی وہ تو گذر — یہ دلِ صد پارہ بیٹھا تھام کر

بسترِ غم پر گرا زار و نزار — دم بدم بڑھنے لگا رنج و فشار

دل میں برپا اک قیامت کا الم — یہ بپا ہیں وہ غم آنکھیں تھیں نم

تھم نہ سکتا اس سے جب گریہ کا جوش — اٹھتا بے ساختہ دل کا خروش

غزل

پاس جب تک وہ قمر آتا نہیں — دل سنبھلتا اب نظر آتا نہیں

ڈر سے اشکوں کا بھی ٹوٹا سلسلہ — سوئے مژگاں اک گہر آتا نہیں

فرطِ بیتابی سے وہ دن کون ہے — منھ تلک اپنے جگر آتا نہیں

دیدہ و دل میں تو کب کا آ بسا — گھر میں وہ ظالم مگر آتا نہیں

ایک مثنوی بھوپال میں کسی کی فرمایش سے لکھی تھی، زرافشاں اس کا نام تھا، گلزار نسیم کی بحر و نسیم کے رنگ کی مثنوی تھی، علاوہ ان کے فارسی اور اردو کے بیسیوں قصیدے جو حمد و نعت یا پیشوایانِ دین و اساتذہ کی مدح میں لکھے تھے تلف ہو گئے، اُن کے کچھ کچھ شعر بطریق انتخاب اس کتاب میں درج ہیں، نمونہ کے طور پر چند قصیدوں کے اشعار پیش کرتا ہوں،

فی التوحید

ای تجسم ساتگیں از بادہ جاں انداختہ — هر زباں از نکتہ اندر زباں انداختہ

نسر گردوں طائرے چوں عنقا جودش — پر عنقا به [illegible] انداختہ

[illegible] نقطہ را از حرف [illegible] — [illegible] دہاں انداختہ

تیر [illegible] نشان [illegible] — خویشتن را از سر نام و نشاں انداختہ

[illegible] — دست امکاں [illegible] انداختہ

منم کہ مہر جہانتابم اندر یقِ ضمیر — ز رخ کشیدہ نقاب آورم آں فعائے دیگر

[illegible] خامہ من چشم [illegible] — شود مشیمہ [illegible] بصیر

[illegible] نیستا [illegible] — [illegible] سریر

کشد بیاضِ چو [illegible] خامہ نقش [illegible] — ہمائے [illegible] کند [illegible] اسیر

بجام لفظ شراب معانیم [illegible] — گردن خرد [illegible] فہم را زنجیر

[illegible] پریاں [illegible] — خلعت [illegible] عریاں [illegible]

غنچہ بودم [illegible] — بر سر بازار [illegible] گل خنداں [illegible]

نکهت اندر دهن غنچه بدین آمد و رفت | آمدم صورت باد و صفت جان رفتم
گاه چون ابر ز دریا به افلاک شدم | گاه چون قطره ز گردون بعمان رفتم
ز نگاه غلط‌انداز دو چشمی چو تجلی | در دل اهل نظر صورت احسان رفتم
کس ندانست چه رفت از دل عصیان‌زده‌ام | برد در گبر شدم پیش مسلمان رفتم

عشق با کم‌نگهی داد که بی‌پا ز خاک شدن | خانه بر دوش شدم بر در جانان رفتم
همچو ذرات در انوار خوش رقص کنان | تا بجولانگه قدس از ره ایقان رفتم

لاله گون کفن از تیغ تمنا بسمل | جامه رنگین چو گل رنگ شهیدان رفتم
ز نیستان گه شمع چو پروانه بدر لشکر | گاه پروانه شدم گاه بگریان رفتم

کرم دست کش لطف کریمی کرده | تا بصبح ازل از شام غریبان رفتم
آن رحیمی که بهر باد سر لطف تربت | در دلش بسته دل حلقه بیندان رفتم
معصیت گشت و لیلی به غفران از دوش | خار در پای ز صحرا بخیابان رفتم

فی التوحید

نور وحدت را ز مرو شان حجاب کثرت است | ذره خاکم ولیکن هست گوهر آفتاب
سیرت از نور تو هم بینی نظاره معنی طلب | بازی و گاه ازو بیچون کند تو آفتاب
اخگر روشن ز خاکستر حجاب اندر بود | جرم تن چون مجمر خاکی و اخگر آفتاب
همت عالی فرو نارد سر خود پیشکش | طبع من ما یاست ماخجلت نه زر آفتاب

گرچه دل گرمم همی لرزد ز چرخ سرد مهر ... سایه بر آبی همی لرزد چو مضطر آفتاب
پاس نگر و ستم کشتهٔ عالم که پیش نعتش ... همچو من فرعی بود و ز ذره کمتر آفتاب
شامگاهان چون همی بوسد زمین منتش ... می بر آید هر سحر با تاج از نور آفتاب
گر رخ او جلوه ننموده بچشم دیده ور ... می نمودش حلقهٔ زلف معنبر آفتاب

ای باکسیر نوالت بوته زر آفتاب ... بهر ظرف سفرهٔ عامم تو زرگر آفتاب
نو عروسان بهاران را حلی بندی ز دست ... میده هم مهرگان را از تو زیور آفتاب
زلف لیلای شب از سودای لطفت مشکبو ... عارض سیمین قیس روز یکسر آفتاب

چیست که مهر منیر خلعت زر یافته ... چرخ ز ماه شهیر تاج گهر یافته
خشک خزان را ز بن فصل گل اندر چمن ... بلبل شیرین سخن نغمهٔ تر یافته
آب بقا را ز اثر باد نمود راهبر ... خاک سکون از سفر شعلهٔ شرر یافته
صحن چمن را بهار شاخ پر از برگ و بار ... دشت گل نوبهار خردهٔ زر یافته
ابر سیه قطره را قطره گهر را بها ... گوهر روشن ضیا بحر درر یافته
تاک می خوشگوار نرگس شهلا خمار ... گل ورق آبدار تازه و تر یافته

عالم کون و فساد دل بسکون و نشاط ... ملک دکن را سواد زیب دگر یافته

جشن نوروزی عید است گل افشان امروز ... غم فردا الم دی شده پنهان امروز

بہ بہاری شدہ افلاک خزاں گردش	کہ زبس راخس وخار است گلستاں امروز
عمل نیک تو آورد فردوس بہشت	کہ بہر سو چمن آرا شدہ رضواں امروز
بسکہ شد سوختہ و بیختہ عود و عنبر	مشک بیز است ہوائے پر مرغاں امروز
بادۂ تاب بر د رشک آب خالص	سبزہ شد غیرت عدو ستۂ ریحاں امروز

ایک سو بیس شعر کے قصیدہ میں سے چند شعر بغیر کسی سلسلہ کے

سپیدہ دم تتق خواب شد ز دیدہ چو دور	نمود جلوہ تہ آغوش دل عروس سرور
مہ دو ہفتہ ز لوح جبینش داغ بدل	غریق لجۂ تشویر پیشش اد کافور
گمان ابروئے آں بت کشیدہ گر بینید	کمند بیند کشاں خم بسجدہ غرق غرور
بدیدنش شدہ بادام بندۂ بے دام	بشوخیش شدہ بیمار نرگس مخمور
ستادہ یک طرف اسپان بادپیمایاں	کہ طے کنند بیک گام عرصہ ملک دہور
بیال کاہکشاں و بدم چو پر دینی	بجو گل بکثرت رنگ و بچہرہ ہمچوں حور
گہ رکوب چو برق و گہ سکوں چو زمیں	گہ قتال چو رعد و دم صدا چوں صور

دہ چہ خورم بود گلستانے	غنچہ خنداں و ابر گریانے
بر کلاہ بنفشہ چشمک زناں	بر سر زلف سنبلستانے
گل تر رشک خندہ گرویاں	یاسمیں ہمچو ماہ تابانے
نرگس نیمخواب در دیدہ	دیدہ بکشادہ چوں نگہبانے
شدہ رطب اللسان گل سوسن	چمن دہر را غزل خوانے
بادا زر شح آب بر سر خاک	فرش گستردہ سبز دامانے

طوطیِ سبز فام از مستی — بر سرِ شاخ شکر افشانے

معنی را زیب و زین کے باشد — کاندران باغ باشد افسانے

ہست او آنکہ بے شک و شبہت — عالمش تن بود و او جانے

حامیِ کیش عقدہا بے لاینحل — ملت و ملک را نگہبانے

بانیِ بہ ترکیبِ فنونِ ملل — مایہ دارِ علوم ادیانے

اردو قصیدوں میں سے صرف ایک قصیدے کی تشبیب پیش کرتا ہوں:

آگیا سامنے وہ برہم دل و دیں کا دشمن — رخصت اے شیخ حرم کفر ہوا توبہ شکن

کیا کہوں کیا نظر آیا رخ کافر جب مجھے — طالب رشتۂ زنار ہے ہر دم گردن

ہے تمنا کہ لکھوں اس بت سراپائے جمال — سخن حسن سے لبریز ہے آغوشِ دہن

زلف ہے یا شب دیجور گرفتاروں کے آگے — شام غربت سے زیادہ ہے رخ صبح وطن

اس کی ہر ایک گرہ سے ہے پڑی دل میں گرہ — کھل گئی یاں گرہ زلف پلیپائے سخن

مہ یک ہفتہ کہوں اس کو تہ ابر سیاہ — یا اسے بال کہوں اس کو جبینِ روشن

شکل ابرو سے یہ ہوتا ہے نظر کو دھوکا — دو ہلال ایک جگہ حق نے کئے جلوہ فگن

نرگسیں آنکھیں جو دید کرتی ہیں دیدے — نشۂ حسن میں سرشار خرد کے رہزن

بینی اس شوخ کی ہے حسن کے شعلہ کی لو — دیکھ کر جس کو ہو ہمہ غنچۂ گل برگ سمن

مہر و مہ صدقہ ہوا کرتے ہیں دونوں رخ پر — پانی پانی ہوئے جاتے ہیں جوانانِ چمن

لب ہیں یا تعبیہ ہیں درج دہن پر یاقوت — یا ہیں دو پنکھڑیاں گل کی لطیف و احسن

غنچۂ گل ہے دہن اس پہ مسی کا جوبن — ایک ہی شاخ میں پھولے ہیں گلاب و سوسن

والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ عجیب

کتاب مہر جہانتاب ہی، فارسی زبان میں ایک جلد اُس کی فلسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحوں پر تمام ہوئی ہے، دوسری جلد آدھی لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہ کی،

پہلی جلد میں تین دفتر ہیں، دفتر اوّل میں علوم و فنون متعارف وغیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں جس طرح سے سیوطی نے نقایہ اور اسکی شرح میں لکھے ہیں، دوسرے دفتر میں انبیائے کرام اہلبیت صحابہ تابعین محدثین علما حکما اور مشائخ کے حالات جدا جدا چند فصلوں میں، تیسرے دفتر میں عربی فارسی، اردو اور بھاشا شاعروں کے تذکرے علیحدہ علیحدہ درج کئے ہیں،

دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی تھی، تاریخ حسب ہیئت ایشیا کا بڑا حصہ ہوچکا تھا، یہ جلد آدھی ہوچکی تھی کہ اُن کو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں اُسکا زمانے نے ورق اُلٹ دیا ہے اور چند دنوں میں اس کا کوئی پڑھنے والا بھی باقی نہ رہے گا، اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہوگئی، چند دنوں کے لئے قلم رکھ دیا، پھر پچھلی گذشتہ محنت پر ناسف کر کے اور اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا، دس بارہ جزو لکھ چکے تھے کہ وہی تپ و لیبک کہ کر عالم بریں کو سدھارے

ایک کتاب اُن کی سیرۃ السادات فارسی میں ہے، اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ سادات کی بہت سی شاخوں کا نسب نامہ دیا ہے، اور جن بزرگوں کے حالات ملے ہیں اُن کو بھی ساتھ ہی ساتھ لکھتے گئے ہیں، اس کتاب کا شمار بھی اُن کی بہترین تصنیفات میں ہے،

ایک اور کتاب فارسی میں سیرت علمیہ ہے، اس میں سید شاہ علم اللہ کے حالات اور ان کے خاندان کے تمام علما مشائخ اور سادات کے حالات بیان کئے ہیں، یہ بھی بہت مفید اور عمدہ کتاب ہے

ایک کتاب عربی میں سبیل النجات ہے، اس میں ہر قسم کی دعائیں جمع کی ہیں، اور بطور حزب الاعظم کے اسکو احزاب پر تقسیم کیا ہے، درمیان السطور ترجمہ اُس کا اردو میں کر دیا ہے،

ایک کتاب مجربات خیالی اردو میں ہے، اس میں وظیفے، عملیات اور خاندانی اعمال ہر

ایک مرض اور ہر ایک حاجت کے جمع کئے ہیں،

فخر المطالب سیوطی کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہی، ایمانِ ابوین کی بحث میں یہ کسی کی فرمایش سے کیا تھا، شاہ ولی اللہ کی انصاف فی بیان اسباب الاختلاف کا ترجمہ بھی اردو میں کسی کی فرمایش سے کیا تھا، اور حاشیہ پر فوائد لکھے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں شرح وقایہ کا حاشیہ عربی میں لکھنا شروع کیا تھا، اُس کے اجزا بطور مسودے کے موجود ہیں،

شعر و سخن میں جو کتابیں میں نے پائیں یا چھپ گئی ہیں اُن میں دیوان فخر حضرت کا دوسرا دیوان ہے، جو لکھنؤ میں مرتب کیا تھا، یہ مجکو اتفاقاً اُن کے ایک شاگرد سے مل گیا، اس میں چند قصیدے، غزلوں کا دیوان، نامے، مسدس، رباعیاں، اخیر میں مناظرۂ شب و روز اور نثر میں ہے،

مثنوی ماہ و خورشید بھوپال میں غلام احمد فروغی کی فرمایش سے لکھی تھی، تقریباً پانچ ہزار شعر کی کتاب ہے، اُس کا ناتمام مسودہ میرے پاس ہی، کتاب صاف کرکے فروغی کو دیدی تھی، معلوم نہیں انھوں نے کیا کی،

مثنوی نگارخانۂ چیں فروغی کی فرمایش سے بھوپال میں لکھی تھی، یہ بھی ماہ و خورشید کے برابر ہے، اس کو فروغی نے چھپوا لیا تھا،

مسدس خیالی، مسدس حالی کے جواب میں مولوی عبد العلی مدراسی نے لکھوائی تھی اور انھی نے اس کو چھاپ دیا ہے،

نثر خیالی، سہ نثر ظہوری کے طرز پر لکھی تھی، فروغی نے احمد جان صوفی کے مطبع میں چھپوایا تھا، مگر اب ملتی نہیں، منجیات خیالی ایک مختصر مجموعہ نعت کی غزلوں کا میں نے چھپوایا تھا اس کے علاوہ اور تذکرے مثلاً واردات خیالی، مناجات خیالی وغیرہ ابھی رکھی ہوئی ہیں، یہ اخیر زمانہ کی تصنیفیں

ہیں، جب کہ اُن کو شاعری کا ذوق جاتا رہا تھا، بچوں اور عورتوں کی فرمائش سے ان کے مناسب حال کچھ فرمادیا کرتے تھے،

میرے ماموں مولانا سید عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ نے جب رحلت فرمائی تو ان کے شاگردوں اور مریدوں نے فارسی اردو اور بھاشا میں اُن کے حالات لکھے کسی نے مثنوی لکھی کسی نے نثر میں لکھا، میرا سن اُس وقت چودہ برس کا تھا، دیکھا دیکھی اُن کی وفات کی تاریخ فارسی میں بیت بھی لکھی، اور اردو میں مثنوی لکھنا چاہی، مگر اُس کا سلیقہ نہ اس وقت تھا نہ اب ہے، اسلئے میں نے والد مرحوم سے استدعا کی، اُنھوں نے نظم عالی کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو میری طرف منسوب ہے،

شروع میں اردو فارسی اشعار میں فخر اور بھاشا میں تمیز تخلص تھا، حیدرآباد میں اردو فارسی میں خیالی تخلص قرار دیا جو اخیر زمانہ تک قائم رہا،

عربی میں بھی کبھی کبھی تغزل یا مناجات کے اشعار نظم فرمایا کرتے تھے، مرحبا کتاب میں اُسکا بھی انتخاب کیا ہے، مگر وہ بہت تھوڑا ہے، شاید تیس چالیس شعر ہوں گے،

راجپوتانہ کی کسی ریاست میں جب چند روز رہنے کا اتفاق ہوا، تو ہندی بھی سیکھ لی تھی اور بے تکلف اُس میں لکھتے پڑھتے تھے،

اُن کے حالاتِ زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے ذہین و ذکی تھے جس طرف توجہ کرتے تھے اُس کو بآسانی حاصل کر لیتے تھے، حافظہ کمزور تھا، مقرر بھی نہ تھے، اس کے ساتھ طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا، اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی،

یہی وجہ تھی کہ زندگی میں اُن کو کم کسی نے جانا، اور باایں ہمہ کمالاتِ علمی و عملی وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے، اور آخر کار ۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ کو تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ کر وفات پائی،

فارسی غزلوں کا انتخاب،

چمن نادیدہ در دام صید در یا بم رسید اینجا　　تمنای تماشای گلم بیخود کشید اینجا
پر و بالم بیک پرواز صیادی شکست اکنون　　گرا باشد به پرواز دگر ای دل امید اینجا

ز درد آئے کہ یادت بکمین دل جانست　　مشتاق قدوم تو بہر سو نگران است
بشکست دلم چرخ و ہنوزم نگران است　　ومشق ستم پیر شد و جور جوان است
از دوست مپرس از دل چون زلف پریشان　　بنگر برخ زرد عیان راچہ بیان است

ز چشم انتظار من سیاہی وقف شبہا شد　　تمنا مردہ بعد از من صباح وصل پیدا شد
چہ بودم پر دل از غم خالی از شادی این مردن　　دلم شد خاک و ساغر گشت و گریان چشم مینا شد
دل پر آبلہ می داشت آب از زنی کیفی　　نگاہ چشم مستش را بدل جا داد و صہبا شد

از شکست بند کار از پیش بہتر می شود　　تیغ چون بر خود شکست آمد دو خنجر می شود
صحبت روشن دلان تاریکی دل می برد　　پیش آتش درد می انگشت اخگر می شود

جان را بہ برق جلوہ جانانہ سوختیم　　شوقش زبانہ زد و مستانہ سوختیم
از گرمی ہجوم تمنای دل چو عود　　پنہان بسوز ہجر دیرانہ سوختیم
تاب سخن نماند بس اینست مختصر　　با شمع ساختیم چو پروانہ سوختیم

اردو غزلوں کا انتخاب

رہے ہم ہاتھ ہی ملتے جنوں نے پاؤں پھیلا　　نشان تار تک چھوڑا نہیں جیب و گریباں کا

یا تھا دل آرام جاں سے ملنے بیدردی — وہ اک آتش کا پرکالہ ہی خرمن سوزیِ جاں کا
سا ہے مدفن نعش اور سینہ مخزنِ حسرت — دل پہ آرزو بھی رشک ہے گورِ غریباں کا

ان وصل کا دلِ شیدا میں رہ گیا — میں عمر بھر فریبِ تمنا میں رہ گیا
یا دیا ہے ساتھ رفیقِ جنوں نے آہ — ٹوٹا جو خارِ دشت کفِ پا میں رہ گیا
مر کے ٹھنڈے ہوئے تو یہ سمجھے — عشق تھا وہ جو شعلہ افگن تھا

رت ہے پھر وہی کوئی ایسا ہو دل فریب — کیا کہ نگاہِ ناز نے ظالم مزا دیا

رنج ہے آدمی اس ہی کے ہاتھ سے — دل جس پہ آ گیا جدھر سے پھرا پھرا
زندگی اک خواب کی سی تھی — یہ کھلا آنکھ بعد مردن آج

افزائیِ خیالاتِ گذشت چمن کیا کیا — ہمارے دل کا بھی ہے حال رہگذر کی طرح
شجرِ گل پہ جو دو چار پر آتے ہیں نظر — تھا کسی وقت یہ بلبل کا نشیمن آباد

پر بھی شوخیوں کا تقاضا نہ کم ہوا — باد صبا سے کرتا ہے میرا غبار ناز

ست ہوا تو ٹوٹا دوشِ زمانے میں — سایہ کا بھی نہیں ہے نشاں ہنر سے فیض

ہم کو برسوں میں رقیبوں کے لئے — تین دن میں لئے اس کے چار خط

فخر اس زہد ریائی پہ نہ کرنا زنہار — بندگی کی نہیں پروا ہے وہاں اے واعظ

ہے فصلِ گل خزاں گئی بدلا ہوا کا رنگ — جمنے لگا چمن میں نسیم و صبا کا رنگ

نکہتِ گل کی طرح آزادہ بربادی سے ہیں — پھرتے ہیں بے قید کیا کیا خانہ ویرانی سے ہم
بے نشانی سے نہیں احساں کسی کا بعدِ مرگ — پاک ہیں یاروں کی رسمِ فاتحہ خوانی سے ہم

دیکھا تو آپ میرے ہی گھر میں تھے گوشہ گیر — ڈھونڈھ آیا اک زمانہ میں اُن کو جہاں تمام
انکارِ وصل ہوتا تو اقرار سہل تھا — دشوار تو یہی ہے کہ انکار بھی نہیں

وصل میں بھی ادب عرضِ بیاں مانع ہے — ہائے جو دل میں ہے وہ منہ سے نکلتا ہی نہیں

دیکھی اک دن بھی نہ اُس باغِ جوانی کی بہار — فصلِ گل میں بھی ہم اے فخر خزاں دیکھتے ہیں
گل کھلے گا اور اے بلبل نہ چھیڑ — منہ جو غنچے کا کھلا اچھا نہیں

ہے ابتدائے عشق خیالی ابھی سے آپ — دل بچھڑے بچھڑے پھرتے ہیں گھبرائے جاتے ہیں

مانا کہ حوصلہ وہی اب تک فغاں کا ہے — لیکن ہجوم یاس امیدِ اثر کہاں

غضب کی تیزیاں کرتا ہے ابلقِ شب رنگ — کسی سوار کا جمتا نہیں رکاب میں پاؤں
محبت سے یہ بت کدھر دیکھتے ہیں — برا دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں

خود گم رہے کسی کی کبھی جستجو نہ ہو — دل سے خدا وہ چھین کوئی آرزو نہ ہو
نظروں سے گر گیا بصفتِ اشکِ بے اثر — مجھ سا بھی خلق میں کوئی بے آبرو نہ ہو

خلافِ قاعدہ کی مدح تم نے میری غیروں سے — سمجھتا ہوں مگر میں خوب ان باتوں کے پہلو کو

بہار باغ میں ہو یا خزاں جو ہو سو ہو — اگر ہمیں نہ رہے تو وہاں جو ہو سو ہو

ایک عالم ہے برابر تپشِ باہم سے — میرے پہلو میں کوئی دل ہے کہ اخگر کیا ہے
خارِ صحرائے جنوں چارہ گری کرتے ہیں — جوشِ وحشت میں مجھے حاجتِ نشتر کیا ہے

آج آیا ہے دلِ زار جو لیتے ہو تو لو — کل مرے پاس یہ نادان رہے یا نہ رہے
بتو سنگِ مزارِ فخر دیکھو — کہ بعد از مرگ بھی چھاتی پہ سل ہے

حسرت برس رہی ہے مری مشتِ خاک پر — چادر نہ پھول کی ہے نہ شمعِ مزار ہے
دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں — بادِ صبا کے دوش پہ میرا غبار ہے
غنچہ ہے مدتوں سے گلِ آرزوئے فخر — نا آشنائے لطفِ نسیمِ بہار ہے

اپنے ہاتھ سے غیر تھیں اُن کے پاس — یہ بھی اے دل گردشِ ایام ہے

ہوں پہ دم نہ کیونکر نکلے ابھی دم تشفیٔ دل کو — وفا کی جس سے ہو امید وہ ہی بے وفا نکلے
بر آئی اے فلک تجھ سے نہ امید ایک بھی اپنی — رہا یہ حوصلہ دل میں کہ کوئی حوصلہ نکلے

شیخ صاحب کی نماز کی یہ بات — یہ ریش اور لہو و لعب کیا کہیے،

دل و جگر کیوں نہ پیش کر دوں ستم ظریفی ہے کیسی — ستم ہے چتون ترچھی ترچھی وہ بانکی بانکی ادا کسی کی
یقیں ہے پھرتی ہیں گردنوں کی کہ ہر گھڑی تیر عاشقوں کو — ادھر سے اتری اُدھر کو آئی کسی کے سر پہ بلا کسی کی

بھیرویں ۷ گھڑی سے ۹ گھڑی دن تک موسم بارش میں

ہے دیا گھیرے سیاں نہیں آئے رے

گھری گھٹا ... یاد کر جت — آنسو چوپے پت پاؤں گیرے رے
یہ تن کھیل در دھن تن پھنگے — ذرہ کی گات بنت پھیری رے
پچھوڑہ تین ساون کیری رتیاں — بھور دھوپ برسے کیری رے
رس رنگ بارتی بنستہ نہ سوتیے — تیر پیا تھیں اب کت پیری رے

آہیا ... دن سے گیارہ گھڑی تک

جاؤ جی تم کشن کنھیا

تم اگر جی اپنے گھر جی — پھر کہو کے نا ہیں سنیا
میر کمولا کہیو ... — ہے چھیلا پت کا لیو تیا

سارنگ آدھے دن سے ۳ گھڑی دن تک

ٹھنڈی چھیاں بنیا ٹھاڈی

بیر یاد و لے تیرا ایسا دے — بولے کوئلیا لے پیا نا نون

پپیہا کوکو مور دا بولے — میر پیا کا کہہ بدھ باؤں

گوری ۳ گھڑی دن سے آخر تک یعنی ۷ گھڑی تک

تیرا بہت بھائے

دو کلی جوبن بالک ہے کنھیا، سنگ کی سکھی سب پیا سنگ کھیلیں، من ہی من دھومر بنے،
ہمرے بلما بلنا میں بیٹھولیں ہم بیٹھے مرجھائے، ساس ننند موہے نت دن واگیس ناکو بھوئے،
سہائے، تیر بلما نادان نہ ہوں تو کس پہ دکھ ہم پائے،

یمن ۷ گھڑی شام سے ۹ گھڑی رات تک

انا نا آپی تم چیرا جانہ

سوتن سنگ تم رین دتا رہو — چھانڈ و یہ تہنہ بچ پا چھو ہارو

تیر پیارو سے کہ پیارو — تم تو نس دن تن من دارو

جھنجوٹی ۹ گھڑی سے آدھی رات تک

لاگ رہی نت سرت تھاری — سدھ بہ پیا دبہ بھو ہاری

من کے من کے پھیر رہی ہوں — تن جل بھن رہی بن گئو جاری

بیٹھی ہوں تمہری آس لگائے — راکھیو تراس نا بوالیں پیاری

تیر سوں بھینٹ کر دھو موہن — نس دن تم پر بہت بلہاری

بھاگ آدھی رات سے تین گھڑی رات تک

جن چھوؤ بانکے پا ر   پائل موری ان جھن باجی
ساس بری موئے پھوٹے نزرے   نند ہٹیلی گاجی
بھرے جان تو آنکھ ملیو کلہہ   کرم کیو جو ساجی
بہت ستاؤ نہ چکیو ن ساس   ایسو ٹھٹھول جائے راجی
تیر کہیو کا آئے کے جگ ماں   آئے رہیو کہہ کا جی

سورٹھ ایضاً

اب ہیں جوگن ہو تھیوں لے پیا تے ساتھ
گھائل کر موہن پیا کہیں آن چھائے   پھینس گئے پر آری ناری ہاتھ
میر جو پندر موری میل بھی ہے   یہ پیا دھیہ کا بس کھات

پرج ۳ گھڑی رات سے ۲ گھڑی صبح تک

سیام کون گن گائے اودھو

نین کچو اکھیں بسرا ہیں   بھوئیں نند یخ بجائے اودھو
سارنگ بین این رس ادھرن   یخ وسن چمکائے اودھو
میرہ جیا ہر لیکیو تنکھن   لے کر مرلی بجائے اودھو

کالنگڑا ۳ گھڑی رات سے ۲ گھڑی صبح تک

سونی سند ربن یخ ہماری

سورہوان سنگار بر ٹوان بن   موتیں مانگ سنواری
چوا چندن سو گندھ کیو گھر   چو کھ دنیا باری
میرہ پیا ملجھو کہوں جائنہ   سدا یہ تن کے بساری

بسنت ہروقت

آئی بسنت بہار سکھی ری کیس جوڑے پچھانے

چوندر کو ساری رنگائے کیسر رنگ چائے — پھرت ہے گرسوں ڈارے ایکیل جو بن سار

سو پھولے آنبہ بورائے، کوئل بسد سنائے — ہم ہی بلمہ پردیس ماں چھائے بسر ہی سگر سنگار

تس میں کریکھا ہمسن کھیل کھلائے — نیر جیو ہر نام میں دن اجو جانہ اُپکار

ہولی

موہے ٹھاگ گیو بنسی بجیّا — کیسے کروں جیا گئو ہی بھٹکی

گرہ انروگ بے پانے نہ نکست — بن بن کے نیں ڈٹ پڑیا

جیو کریچ اسدھ نہیں ایکو — ہر گئے ہتی جو کام کیا

جا سو گئے ہر دے کے لک

جمارا بیر کے رنگ ہو مکھ پہ — آنسو رنگ ہیں نین بہیّا

روپ سنگار اہی سب بگڑا — من ہے نہیں جوبن کا لوبھیا

جاس رہت گل رنگ چٹک

لاگے کریجے پریم کے گانسے — گھنڈ کا نا ہیں دکھیتا

پیر دکھ نہیں کو دھرت ہی — بھینٹ ہے ہیرا کا دکھیا

جا من جات کریج مسک

توری چیتون کے تیر بلہاری — بانکی نظر یا چتوتیا

ایک نظر تک دیکھیں ہیں — مورت جیا کے بلمسیا

ابھو میا تو آنکھین کی نظر

متفرقات

رات کی بتیاں میٹھی میٹھی　　توری جیا سے نکس گئیں رے

قول و قسم کیو بہت باں گھر کے　　اپنی غرض کیو بیت موری لے کے

بسر گئو اب سب گن لے گئے　　وہ بتیاں اب کس گئیں رے

ییتم جب سے بدیس سدھارے　　ہرم جوہر کرت ادھکائے

سیر جیا نہیں رہت سنبھارے　　انکھیاں درس کا ترس گئیں رے

ایضاً

موہ گئے من سانوریا نینن ینن ملائے

اک تو روپ انوکھا تا پہ ٹھمک ٹھمک اکی چال　　سنکھ ہوتے بجریا دیت جیا ہولسائے

اس چھل بل دیکھ کے دھیر دھرے کن جیو　　دیکھ کے سونی بجریا تیر رہونا ہیں جائے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دار المصنفین کی نئی کتابیں

تاریخ سندھ: سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی و تمدنی تاریخ، قیمت :- [illegible]

اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات اُن کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، قیمت :- [illegible]

بزم تیموریہ: تیموریوں کے علمی ذوق، اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء، اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل: قیمت :- [illegible]

امام رازی: امام رازی کے سوانح وحالات، اُن پھر فلسفہ و علم و کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح، قیمت :- [illegible]

بزم صوفیہ: یعنی صاحب تصنیفات صوفیۂ کرام مثلاً شیخ ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات؛ قیمت :- [illegible]

تاریخ اندلس: اندلس کی سیاسی و علمی تاریخ، [illegible]

اہل کتاب صحابہ و تابعین: اہل کتاب صحابہ و تابعین کے مفصل سوانح وحالات، قیمت [illegible]

اسلام اور عربی تمدن

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

یعنی

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب

الاسلام والحضارة العربية

کا ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ میں اس کی جہالت اور وحشت و بربریت اور اس دور ترقی میں اس کی پُرفریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مسلمانوں کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آگیا ہے۔

قیمت :- [illegible]

ضخامت :- ۵۰۴ صفحے

(طابع و ناشر صدیق احمد)